بھوپال کی کہانی

محمد عثمانؔ دموہی
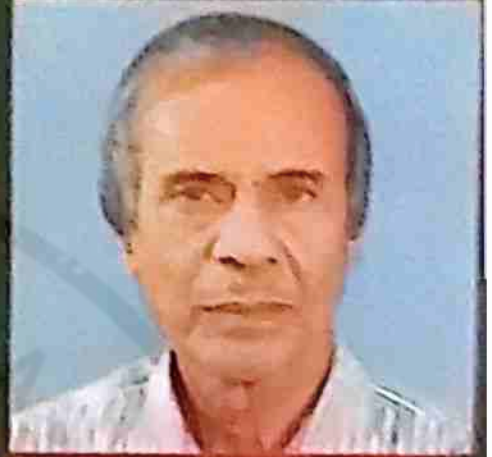
بھوپال کی کہانی

تحریر

عثمان دموہی

راحیل پبلی کیشنز کراچی

KUTUB KHANA
JALALI BOOKS
JALALI

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب .... بھوپال کی کہانی

مصنف .... عثمان دموہی

اشاعت 2018ء

کمپوزنگ .... محمد آصف (اُردو آرٹ انٹرنیشنل، کراچی)
0331-3652042

قیمت .... -/600 روپے

ناشر .... راحیل پبلی کیشنز، کراچی

RaheelPublications&BookSeller

اسٹاکسٹ

توکّل اکیڈمی

شاپ نمبر 31، اوشین سینٹر، نیو اُردو بازار۔ کراچی

موبائل: 0321-2524561 - 0321-8762213

فون: 021-32217471

ای میل: tawakkalacademy@yahoo.com

انتساب

والد، والدہ

اور

اہلیہ

کے نام

جن کے بے مثال پیار اور مفید مشوروں نے مجھے آگہی عطا کی۔

KUTUB KHANA. JALALI BOOKS JALALI

عرضِ ناشر

عثمان دموہی کراچی کی ادبی، صحافتی اور سماجی حلقوں کی جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ آپ ایک کہنہ مشق صحافی اور کالم نگار ہیں۔ کئی سماجی و ادبی تنظیموں کے عہدیدار، ہمدرد شوریٰ کے رُکن اور نامور اصلاحی جریدے ''عصمت'' کے ڈپٹی چیف ایڈیٹر ہیں۔ ''کراچی تاریخ کے آئینے میں'' آپ کی معرکہ الآرا تصنیف ہے جو خاص و عام میں بہت مقبول ہوئی ہے۔ اس کا انگریزی ورژن بھی "Karachi in the Mirror of History" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اُردو کتاب کا تیسرا ایڈیشن راحیل پبلی کیشنز کو شائع کرنے کا اعزاز حاصل ہے۔

اب آپ کی نئی تصنیف ''بھوپال کی کہانی'' ہمارے ادارے راحیل پبلی کیشنز کے زیرِ اہتمام شائع ہوئی ہے۔ موصوف نے کافی عرق ریزی کے بعد اس کام کو انجام تک پہنچایا ہے۔ کتاب ہذا میں بھوپال کی مکمل تاریخ بیان کی گئی ہے۔ اس میں بھوپال سے متعلق تمام ہی دلچسپ معلومات بشمول قدیم و جدید تاریخ، سیاست، ثقافت، صحافت، شعر و ادب، اہم عمارات اور نامور شخصیات کے تذکرے وغیرہ شامل ہیں۔ اُمید ہے قارئین کو کتاب پسند آئے گی۔

میاں راحیل

فہرست عنوانات

بھوپال کی کہانی

تبصرہ ...... محسنِ پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خان

لاہوریوں کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ کہیں بھی ہوں لاہور کو کبھی نہیں بھولتے اور اس کی یاد اُنھیں ستاتی رہتی ہے۔ اس سے کہیں بڑی محبت اور یادیں بھوپالیوں کو بھوپال سے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ملکہ نور جہاں بھوپال دیکھ لیتی تو وہ کشمیر کو بھول جاتی اور بھوپال کو جنت مقام قرار دیتی۔

بھوپال پر انگریزوں نے اپنے دور میں، پھر بیگمات بھوپال نے، اور چند دوسرے ادیبوں نے بھوپال کے بارے میں تبصرہ کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ چار کتابیں اس کام میں صفِ اوّل میں آتی ہیں۔ شہریار میاں کی کتاب بیگمات بھوپال اور باغی شہزادی، شگفتہ فرحت کی شاندار کتاب تذکرہ شخصیات بھوپال، عبدالحفیظ خان کی منظوم تاریخ بھوپال اوراب جناب عثمان دموہی کی بھوپال کی کہانی۔

برادرم عثمان نے جس خوبصورتی سے بھوپال کی تاریخ، عوام، موسم، شاعری، بیت بازی، ہاکی کے کھلاڑی، نامور شخصیات، تفریحی مقامات، مختلف شعرا کا بھوپال کو خراجِ تحسین، بھوپال کے نامور شعرا، بھوپال اور اُردو، بھوپال کے ادیب، وہاں پر نظامِ تعلیم و سرگرمیاں، بھوپال ریاست کو بھارت کا مدغم کرنا، شاعری اور چار بیتوں کے دلچسپ واقعات، غرض یہ ہے کہ برادرم عثمان دموہی نے بھوپال کے نمک کا حق ادا کر دیا ہے۔ انھوں نے تقریباً چار سو سال کی تاریخ کو تمام مصدقہ حوالہ جات سے ایک نہایت مستند تاریخ کا درجہ دیدیا ہے۔ میں نے جب اس کو پڑھنا شروع کیا تو کتاب ہاتھ سے نہ چھوڑ سکا۔ بچپن کے تمام خوشگوار واقعات، پیاری جگہیں آنکھوں کے سامنے گھوم گئیں۔

اللہ پاک برادرم عثمان دموہی کو تندرست وخوش وخرم رکھے اور عمر دراز کرے۔ آمین!

احقر۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان

JALALI BOOKS

بھوپال کی کہانی پر
اسد محمد خاں کا اظہارِ خیال

بھوپال میرے اجداد کا وطن ہے۔ ہمارے جدِ اعلیٰ سردار دوست محمد خاں اورکزئی نے سرحدی علاقے تیراہ (اورکزئی ایجنسی) سے آکر اٹھارویں صدی عیسوی کے آغاز میں اسے بسایا۔ ان کی اولاد در اولاد وہاں آباد رہی، جنھوں نے حکمرانی بھی کی، وہاں جمے رہے، وہاں سے ہجرت بھی کی۔

ریاست کے آخری حکمراں نواب محمد حمید اللہ خاں تھے، ان کی زندگی میں ہی، مئی ۱۹۴۹ء میں ریاست، جمہوریہ ہند میں ضم کردی گئی اور بھوپال شہر کو وسطی صوبے مدھیہ پردیش کا صدر مقام بنا دیا گیا۔

بھوپال پر تاریخی اور تہذیبی حوالوں سے بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ کیوں کہ میں اور میری کئی پشتیں بھوپال میں پیدا ہوئیں اور پلی بڑھیں، اس لیے بھی ...... اور مجھے تاریخ کے مطالعے کا شوق ہے...... اس وجہ سے بھی، میں نے دموہی صاحب کی یہ تصنیف 'بھوپال کی کہانی' بہت توجہ سے پڑھی۔

ریاست کے جغرافیائی حوالے درج کرتے ہوئے مصنف نے خاصی محنت کی ہے، اسی طرح علاقے کی قدیم تاریخ بیان کرتے ہوئے انھوں نے ایسی محققانہ دانش سے کام لیا ہے جو وہاں کے تہذیبی منظرنامے کو سمجھنے میں مددومعاون ہوتی ہے۔ سبحان اللہ!

قلعہ رائے سین سے متعلق دموہی صاحب کے حوالے دیکھ کر مجھے بہت مسرت ہوئی۔ کتنے ہی تاریخ داں یاد آ گئے جنھوں نے شیرشاہ سوری کے رائے سین کے محاصرے کو اور اس قلعے میں بسے مظلوم لوگوں کو، جن میں ہندو مسلمان سبھی تھے، ایک

ظالم حکمراں سے نجات دلانے کا ذکر کرنا بھی ضروری نہیں سمجھتے۔ جب کہ اپنی طالب علمی کے زمانے میں، ہم نویں دسویں جماعتوں کے طلبہ کو ہمارے استاد بتاتے تھے کہ سولھویں صدی میں شیر شاہ سوری نے کوئی دو ماہ کے محاصرے کے بعد اس قلعے میں بسے شہریوں کی زندگیاں بحال کی تھیں اور یہاں امن وامان قائم کیا تھا۔ دموہی صاحب نے اس مرحلے کو بہت خوبی سے بیان کیا ہے۔

بہر حال، بھوپال کی یہ تاریخ لکھے جانے پر، پبلشر الیاس صاحب نے بہت اشتیاق ظاہر کیا...... دموہی صاحب نے اپنے دیباچے میں یہ بھی ذکر کیا ہے...... یہ بڑی خوش آئند بات ہے کہ ملک عزیز میں کتابوں کی اشاعت کو محض کاروباری نقطہ نظر سے نہیں، ایک علمی اور تہذیبی تناظر میں بھی دیکھا جارہا ہے۔

شاد آباد رہے یہ زمین!

مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب بہت شوق سے پڑھی جائے گی،

اور یاد رکھی جائے گی۔

اسد محمد خاں

ڈاکٹر یونس حسنی

''بھوپال کی کہانی''

''بھوپال کی کہانی'' عثمان دموہی صاحب نے لکھی ہے۔ دموہ بھوپال کے جوار میں ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ اہل دموہ کے لیے دموہ اور بھوپال کا معاملہ گھر آنگن کا سا ہے، اس لیے دموہی صاحب نے جو لکھا وہ محض کتابی نہیں چشم دیدہ ہے۔

یہ کتاب بھوپال کے قدیم باشندوں، جدید آبادکاروں، بھوپال کے بیدار مغز حکمرانوں اور ان کے کارناموں پر مشتمل ہونے کے باعث تاریخی کتاب بھی ہے۔ یہ محض بھوپال کے حکمرانوں کے کارناموں کے ذکر پر مشتمل نہیں، اس کتاب میں بھوپال سے آگہی کا بڑا سامان موجود ہے، بھوپال کے قلعے، محلات اور ان کی تاریخی اہمیت، بھوپال کی مساجد جن میں خصوصاً تاج المساجد کا ذکر جو دنیا کی تیسری بڑی مساجد میں سے ایک ہے۔

پھر ایک باب میں باقاعدہ بھوپال کے نامور شعرا، ادیب اور صحافی زیر بحث آئے ہیں۔ یہ اہل بھوپال کی زندگی کے ہر میدان میں کاوشوں کی ایک جھلک ہے تاکہ آپ تقدیم و تاخیر کا تاریخی ترتیب کے لحاظ سے بھوپال کے نمایاں خدوخال سے واقف ہو جائیں۔ اس میں کچھ بڑے نام چھوٹ گئے ہوں یا تاریخی ترتیب ملحوظ نہ رہی ہو تو اس سے فرق نہیں پڑتا کیونکہ دموہی صاحب بھوپال کی تاریخ مرتب کر رہے تھے نہ کہ وہ کوئی تحقیقی تصنیف پیش کر رہے تھے وہ تو بھوپال سے دور بیٹھے لوگوں کو بھوپال کی عظمتوں کی کہانی سنا رہے تھے اور کہانی میں وہ چیزیں تلاش کرنا جن کا میں نے اوپر ذکر کیا بے سود ہے۔ غرض یہ وہ بھرپور تعارف ہے جو کتاب کے مطالعہ کے بعد آپ کو اہل بھوپال سے حاصل ہوتا ہے۔

بھوپال نے اپنی حیثیت سے بڑھ کر تعلیمی سرگرمیوں کو فروغ دیا اور مردانہ و

زنانہ اسکولوں کے علاوہ حمیدیہ کالج کے ذریعے اہل بھوپال کے لیے علم کے وہ دروازے وا کیے جو آج بھی اہل بھوپال کا سرمایۂ ناز ہیں۔

بھوپال ہاکی میں ایک خاص مقام کا حامل رہا ہے۔ چنانچہ کھیل کے میدان میں اس کی فتوحات بھی دموہی صاحب کی نظروں سے اوجھل نہیں رہیں۔

چاربیت ایک ایسی صنف ہے جو پڑھی جانے سے زیادہ دکھائی جانے والی چیز ہے۔ یہ پٹھانوں کی خاص صنف بھی ہے اور اسے پڑھنے کا انداز بھی عجیب وغریب اور مردانہ ودلیرانہ ہے۔ اس لیے یہ ہندوستان کی پٹھان ریاستوں خصوصاً بھوپال، رامپور اور ٹونک میں رائج رہا اور آج بھی اس کے پڑھنے والے مخصوص انداز سے ادائیگی کے ساتھ قرونِ وسطیٰ کے جنگجوؤں کی پُرامن راتوں کی کہانی سناتے ہیں۔

دموہی صاحب نے بھوپال کے کتب خانوں، تفریح گاہوں، صنعتی مراکز غرض ثقافتی زندگی کے ہر پہلو کو کتاب میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے اور یوں بھوپال کی ثقافتی آب وتاب کو بڑی خوبصورتی سے پیش کردیا ہے۔

بھوپال کو اپنے اوپر فخر کرنے کے لیے یہی بات کافی ہے کہ وہ عظیم سائنس داں محسنِ پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خاں کی جائے پیدائش ہے اور اس کا علیحدہ سے ذکر کرکے دموہی صاحب نے اپنا فرض ادا کیا ہے۔

اس کتاب کو تحقیق کے انداز میں دیکھنے سے اس کا لطف جاتا رہے گا اسے بھوپال، اس کی سیاست، ادب، صحافت اور ثقافت کی لطیف جھلکیوں کے طور پر دیکھنا اور پڑھنا ہی باعثِ لطف وانبساط ہوگا۔

☆☆☆

ڈاکٹر رضیہ حامد

بھوپال کی کہانی......ایک تاثر

بھوپال ہندوستان کا ایک ایسا شہر ہے جو قدرت کی فیاضی کا جیتا جاگتا ثبوت پیش کرتا ہے۔ اس کا جائے وقوع پہاڑوں کے درمیان ہندوستان کے نقشہ پر دل کی جگہ ہے۔ اس کو جھیلوں کا شہر بھی کہا جاتا ہے۔

اُردو شاعری کے ابتدائی نمونے یہ ثابت کرتے ہیں کہ بھوپال میں اُردو ولی دکنی سے پہلے ترقی پا چکی تھی۔ اس کو ڈاکٹر سلیم حامد رضوی نے اپنے تحقیقی مقالہ ''اُردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ'' میں اسناد کے ساتھ تحریر کیا ہے۔

جناب عثمان دموہی صاحب نے بھوپال کی محبت میں کراچی میں مقیم رہتے ہوئے ''بھوپال کی کہانی'' تحریر کی ہے۔ یہ ان کا بھوپال سے قلبی تعلق کا بیّن ثبوت ہے۔ عثمان صاحب نے کئی کتب کے مطالعہ کے بعد اس کتاب میں مختلف عنوانات دیتے ہوئے ان پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ جیسے تاریخ بھوپال، بھوپال کے فرمانروا، ان کی رعایا پروری، بھوپال کی بیگمات کا اندازِ حکمرانی، بھوپال کے عوام، ان کے سماجی سیاسی اور معاشرتی حالات، بھوپال میں تعلیم کا فروغ وغیرہ۔

اس کتاب میں بھوپال میں اُردو ادب کی صورت حال پر بھی عثمان صاحب نے مقدور بھر تعارف اور تفصیل لکھی ہے۔ شاعروں، ادیبوں کے حالات اور ان کی شاعری کی مثالیں بھی دی ہیں جو قاری کو وہاں کے ذہن وفکر سے آگاہ کرتی ہیں۔

بھوپال میں ہاکی کو فروغ حاصل ہوا، اس لیے اس کو ہاکی کی نرسری بھی کہا جاتا ہے۔ اولمپین انوار احمد خاں نے اپنی کتاب ''ہاکی'' میں اس پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے۔ ''بھوپالی اُردو کی لغت'' محمد احمد سبزواری نے تیار کی ہے جو میں نے ''بھوپالی اُردو'' کتاب میں شامل کر کے طبع کی۔ بھوپال میں محبت، رواداری، فرقہ وارانہ ہم آہنگی بدرجہ

اتم موجود ہے۔ وہاں ہر طبقہ اور مذہب کے لوگ باہم شیر و شکر ہو کر رہتے ہیں۔ یہ اللہ کی مہربانی اور کرم ہے۔ ان تمام باتوں کو عثمان دموہی صاحب کہانی سنانے کے انداز میں اپنے قاری کو روشناس کراتے ہیں۔

عثمان صاحب کی تحریر منجھی ہوئی صاف اور سلیس ہے۔ ماہنامہ ''عصمت'' جیسے قدیم رسالہ کے نائب مدیر کے قلم سے ایسی بامحاورہ اور برجستہ تحریر کا نکلنا تعجب خیز نہیں۔ اس میں قاری کو گرفت میں لینے کی طاقت ہے۔ یہ کتاب ہاتھ میں لے کر بغیر ختم کیے رکھنا شاق گزرتا ہے۔ اُمید ہے کہ ''بھوپال کی کہانی'' عوام میں مقبول ہوگی۔ طویل عرق ریزی اور دوسری دشواریوں کو دیکھتے ہوئے عثمان صاحب کی ہمت کی داد نہ دینا ناانصافی کے زمرے میں آتا ہے۔ تو پھر آپ اس کو کہانی کی طرح ہی پڑھئے۔

بہت بہت مبارک باد عثمان صاحب!

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

شگفتہ فرحت

''بھوپال کی کہانی''

تبصرہ

میں محمد عثمان دموہی صاحب کو گزشتہ کئی سالوں سے جانتی ہوں۔ ان سے ملنا جلنا رہتا ہے۔ میری ان سے واقفیت کیسے ہوئی؟ جب ان کی کتاب ''کراچی تاریخ کے آئینے میں'' آئی تو میں پڑھ کر دنگ رہ گئی کہ کراچی کی تاریخ کو انھوں نے کس قدر موثر انداز میں تحریر کیا کہ شہر قائد کی تاریخ لمحہ بہ لمحہ کھلتی چلی گئی اور معلومات میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ مزید برآں یہ کتاب اب انگلش ورژن میں بھی آ گئی ہے۔ یہ کوئی معمولی کام نہیں ہے جو عثمان دموہی صاحب نے سرانجام دیا ہے۔ اب ان کی تازہ تصنیف ''بھوپال کی کہانی'' میرے سامنے ہے۔ حیرت کی بات ہے موصوف کا تعلق بھوپال سے نہیں ہے لیکن پھر بھی انھوں نے ''بھوپال کی کہانی'' لکھ ڈالی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا قلم ہر موضوع پر بہت روانی سے بہتا ہے اور بہت چابک دستی سے چلتا ہے اور ہر موضوع کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں انھوں نے بھوپال کا تعارف، تاریخ، نواب حمید اللہ خاں اور نواب سلطان جہاں بیگم سمیت کئی نوابین کے دورِ حکومت کا تذکرہ کرتے ہوئے بھوپال کے قلعے، محلات، باغات، مساجد، بھوپال کی لائبریریاں، شاعروں، ادیبوں، صحافیوں، کھلاڑیوں، عالموں، پارکوں، تالابوں، تعلیمی اداروں، محفل چاربیت، مشاعروں اور مختلف شخصیات کا بہت خوبصورت اور دلکش انداز میں ذکر کیا ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔ بھوپال کا نام آئے اور محمد احمد سبزواری صاحب کا ذکر نہ ہو، یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ بھی ''بھوپال کی کہانی'' کے ایک اہم مرکزی کردار ہیں۔ انھوں نے بھوپال کو اپنی آنکھ سے بغور دیکھا، پرکھا اور محسوس کیا۔ بھوپال سے تعلق رکھنے والے محمد

احمد سبزواری صاحب ممتاز ادیب، دانشور اور ماہر معاشیات تھے۔ وہ بھوپال کے بہت سینئر شہری تھے۔ کراچی کے ایک مؤقر روزنامہ میں ''معیشت کی جھلکیاں'' کے عنوان سے ہفتہ وار کالم تحریر کرتے تھے۔ محمد احمد سبزواری صاحب کو بھوپال سے بہت اُنسیت اور لگاؤ تھا۔ ''بھوپال'' کا نام سنتے ہی ان کی نگاہوں میں ایک خاص قسم کی چمک اور محبت عود آتی تھی۔ وہ محبانِ بھوپال فورم کی تعمیری ادبی، سماجی، ثقافتی سرگرمیوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ جب سے ''بھوپال انٹرنیشنل فورم'' اور ''محبانِ بھوپال فورم'' وجود میں آئے، مستقل سرپرستی کرتے رہے۔ محمد احمد سبزواری کی عمر عزیز کے 100 سال مکمل ہونے پر فورم نے ان کے اعزاز میں ایک تقریب منعقد کی جس سے وہ بہت خوش ہوئے۔ زندگی کی آخری سانسوں تک چلتے پھرتے اور معمول کے کام انجام دیتے رہے اور قلم سے رشتہ برقرار رہا۔ محمد احمد سبزواری صاحب آج سے تقریباً ڈیڑھ سال قبل 105 سال کی عمر میں رحلت فرما گئے۔ کراچی میں آسودہ خاک ہوئے۔ ان کی کمی آج بھی محسوس ہوتی ہے۔

محسنِ پاکستان، محافظ پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خان بھی عاشقِ بھوپال ہیں، جنھوں نے بھوپال کے گلی کوچوں کو چھوڑنے کے باوجود بھی اس کی حسین یادوں کو سینے سے لگائے رکھا ہے۔ بھوپال ان کی جنم بھومی ہے۔ وہ اکثر اپنے کالموں میں بھوپال کا تذکرہ بہت خوبصورت انداز میں کرتے ہیں۔ یہی حال ہمارا بھی ہے کیونکہ بھوپال ہمارے اباواجداد کی سرزمین ہے۔ اس مردم خیز زمین نے بہت عظیم شخصیات کو جنم دیا جو نہ صرف بھوپال بلکہ اکنافِ عالم میں پھیلے ہوئے ہیں اور اپنے اپنے شعبوں میں نام کما رہے ہیں۔ پاکستان ہماری اوّلین محبت اور ترجیح ہے، لیکن اپنے آباواجداد کی سرزمین بھوپال سے بھی ہمیں بہت پیار، محبت، عقیدت ہے۔ اسی محبت وعقیدت نے ہمیں ''تذکرہ شخصیاتِ بھوپال'' لکھنے کی جانب راغب کیا۔ لیکن محمد عثمان دموہی صاحب نہ تو بھوپال کے ہیں نہ ہی ان کے آباواجداد بھوپال کے، آفرین ہے اُن پر کہ انھوں نے

''بھوپال کی کہانی'' لفظوں میں بیان کر ڈالی اور کتابی صورت میں ہمارے لیے لے آئے۔ وہ مبارکباد کے مستحق ہیں کہ بھوپال سے تعلق نہ رکھنے کے باوجود اتنی عرق ریزی اور محنت سے ''بھوپال کی کہانی'' لکھ کر ہمیں مشکور وممنون کر دیا کہ اُن پر جتنا فخر کریں، کم ہے۔

میں عثمان دموہی صاحب کو ''بھوپال کی کہانی'' کی اشاعت پر اپنی اور محبانِ بھوپال فورم کی جانب سے دلی مبارکباد پیش کرتی ہوں، اس دُعا کے ساتھ کہ

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

محمد عثمان دَموہی

دیباچہ

یہ میری خوش قسمتی نہیں تو کیا ہے کہ مجھ جیسے ناچیز کو بھوپال جیسی عالی مرتبت ریاست اور بھوپال جیسے عظیم الشان شہر کی تاریخ رقم کرنے کا اعزاز حاصل ہو گیا ہے۔ اب یہ خاکسار بھی ان قابل فخر تاریخ دانوں کی صف میں شامل ہو گیا ہے جو بھوپال کی تاریخ لکھ کر تاریخ کا ان مٹ حصہ بن چکے ہیں۔ بھوپال شہر کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے مگر ابھی بہت کچھ لکھا جانا باقی ہے۔ یہ شہر وندھیا چل اور ست پُڑا کے پہاڑی سلسلوں کے دامن میں واقع ہے۔ مدھیہ پردیش صوبے کے دارالخلافے کی صورت میں رنگا رنگ تہذیبوں کا گہوارہ ہے جس کا برصغیر میں کوئی ثانی نہیں ہے۔ اس شہر کو قدرتی حسن اور خوب صورتی دینے والے دو عناصر ہیں ان میں ایک یہاں کے دل فریب اور کبھی نہ خشک ہونے والے تالاب اور دوسرے یہاں کی سر سبز و شاداب پہاڑیاں۔ ہندوستان کے کسی بھی شہر میں اتنے بڑے اور خوب صورت تالاب نہیں پائے جاتے۔ بھوپال کی پہاڑیاں جو وندھیا چل پہاڑ کی ڈھلانوں پر واقع ہیں اپنی دل فریبی اور دل ربائی کے لئے ناقابل فراموش ہیں۔ شہر کی سب سے بلند پہاڑی اریا سے اگر رات کے وقت شہر کا نظارہ کیا جائے تو پلک جھپکنے کی اجازت نہیں ملتی اس منظر کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے گویا کسی نے قمقموں سے بجی سنوری ہری چادر بھوپال کو اڑھا دی ہو۔ وندھیا چل کے دلفریب پہاڑی سلسلے میں اونچی نیچی آبادیوں، سبزہ زاروں اور دل کش عمارتوں کا یہ شہر کسی زمانے میں ہندوستان کا قلب کہلاتا تھا۔ ایک عظیم ریاست کے دارالخلافے کی حیثیت سے اس شہر نے اپنے لائق فائق شاہی فرماں رواؤں اور باشعور

عوام کی بدولت ماضی میں ایک مخصوص پہچان پیدا کی تھی۔ یہ ریاست اسلامی تہذیب اور ثقافت کا بھی بہترین مرکز تھی۔ عالموں، فاضلوں، فن کاروں اور دل والوں نے اس شہر کو ایک نئی آن بان اور شان بخشی تھی۔ آج بھی زمانے کے بگڑے ہوئے حالات کے باوجود اس شہر کی تہذیبی اور ثقافتی شناخت کم نہیں ہوئی ہے۔ اس شہر میں ایسی خصوصیات اور کشش موجود ہے جو دوسری مرحوم ریاستوں کے شہروں کو میسر نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں کامل انگریزی اقتدار کے قیام کے بعد انگریز حکومت نے دہلی میں پہلا دربار منعقد کیا اور تمام ریاستوں کے راجوں، مہاراجوں، نوابوں اور فرماں رواؤں کو مدعو کیا تو بھوپال کی اس وقت کی حکمراں نواب سکندر بیگم صاحبہ کو بھی دعوت نامہ بھیجا گیا۔ نواب سکندر بیگم اپنے سرداروں کے ساتھ دہلی پہنچیں۔ دربار میں شرکت کرنے کے علاوہ ان کا مقصد یہ بھی تھا کہ بھوپال کو ایک مہذب، شائستہ، معاشی طور پر آسودہ، علوم وفنون کا گہوارہ اور اسلام کے ایک مضبوط قلعے کے طور پر پیش کیا جائے۔ خوش قسمتی سے وہ اپنے اس مقصد میں سو فیصد کامیاب رہیں۔ گورنر جنرل ہند ان کی قابلیت اور دانشوری کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا۔ بیگم صاحبہ نے اپنی ریاست کو واقعی ایک جنت نشان ریاست بنا دیا تھا جہاں ہر طرف خوش حالی آسودگی اور امن وسکون کا ماحول تھا۔

اس ریاست کو دین داری اور دینی تعلیم کے لحاظ سے بھی ایک خاص امتیاز حاصل تھا۔ بھوپال کے مدارس پورے برصغیر میں اپنی مثال آپ تھے۔ نواب صدیق حسن خاں کے زمانے میں تعلیم کی فراوانی میں مزید اضافہ ہوا۔ نواب صاحب خود نامور عالم تھے اور علما و اہل کمال کے بڑے قدرداں تھے۔ ان کی دین داری اور علماء نوازی سے ان کے زمانے میں بھوپال علماء اور اہل علم کا مرکز بن گیا تھا۔ حتیٰ کہ عرب تک کے علماء کھنچ کر بھوپال میں جمع ہو گئے تھے۔ نواب صاحب نے دینی تعلیم کا ایک مستقل شعبہ قائم کیا جس کے ماتحت بہت سے مدارس تھے جو دینی علوم کے فروغ میں بڑھ چڑھ کر

حصہ لے رہے تھے۔ دنیا کا سب سے بڑا سائز کا قرآن پاک گیارہویں صدی ہجری میں بھوپال میں لکھا گیا اس کی جلد چاندی کی تھی یہ مصحف بھوپال کے قلعہ کے ایک کمرے میں مرجع خلائق تھا۔ بعد میں نواب حمید اللہ خاں نے اس کو مصر کے مشہور کتب خانہ دارالکتب المصر یہ قاہرہ کو ہدیہ کر دیا تھا۔ بھوپال بزرگان دین اور علمائے حق کا مرکز بھی رہا ہے۔ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں: ''وسط ہند کے ظلمت کدے میں بھوپال ہی ایک اسلام کا مرکز ہے یہاں علم کی مشعل روشن کرنے والے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے خاندان سے مولانا عبدالحیؒ بدھانوی کے صاحب زادے مولانا عبدالقیوم شاہ رؤف احمد مجددی جو حضرت شاہ غلام علی دہلوی کے خلیفہ بھی تھے یہاں تشریف فرما ہوئے۔ پھر نواب صدیق حسن خاں کے زمانے میں جن عرب و ہند کے جید علماء وفضلاء کا یہاں مجمع ہو گیا تھا ان تمام کی یادیں اب بھی یہاں روشن ہیں۔''

نوابین بھوپال گو کہ راسخ العقیدہ مسلمان تھے مگر اپنی ہندو رعایا کے ساتھ ہمیشہ حسن سلوک سے پیش آتے جناب سلیم حامد رضوی اپنی تصنیف ''اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ'' میں رقم طراز ہیں کہ بھوپال کے ہندو، ہندو ہی رہے لیکن تمدنی زندگی میں وہ اور مسلمان ایک تھے ان کی زبان لباس، معاشرت رہن سہن تصورات اور ادب غرض کہ تمدنی زندگی کے جتنے بھی شعبے ہیں ان میں سے کسی شعبے میں کوئی تفریق دوسرے فرقے کے مقابلے میں نظر نہیں آتی تھی بھوپال میں مسلمان یا ہندوؤں کے مخصوص محلے نہیں ہیں سب مل جل کر رہتے چلے آئے ہیں۔ بھوپال سے باہر یہاں کے ہندوؤں کو محض لباس زبان مجلس آداب کے لحاظ سے پہچان لینا آسان تھا۔ ہندو اور مسلم خاندانوں میں میل محبت ارتباط و اختلاط عام تھا۔ ایک دوسرے کے تہواروں اور غم و شادی میں شرکت بے مثال یک جہتی اور یگانگت کا نمونہ پیش کرتی تھی'' بھوپال کی تاریخ شاہد ہے کہ ہر زمانے میں حکومت کے ہر شعبے میں بھوپال کے مقامی ہندو برسر اقتدار

رہے یہاں تک کہ ریاست کا وزیر اعلیٰ جسے یہاں کی اصطلاح میں دیوان کہتے تھے عموماً ہندو ہی ہوتے تھے۔ لالہ بجے رام، لالہ گھانسی رام، لالہ کیسری سنگھ، لالہ بھولا ناتھ اور درجن سنگھ یکے بعد دیگرے دیوان ریاست مقرر ہوئے۔ نواب حمیداللہ کے دور میں راجہ اودھ نارائن بسریا ایک عرصے تک پرائم منسٹر رہے۔

بھوپال کی ادبی، علمی اور تہذیبی ترقی میں یہاں کی خواتین فرماں رواؤں کا اہم کردار تھا۔ مولانا شبلی نعمانی فرماتے ہیں ''مجھے مسلمان ریاستوں کے متعدد فرماں رواؤں کی خدمت میں حاضر ہونے کا اتفاق ہوا۔ ان سے گفتگو و ہم کلامی بھی ہوئی لیکن میں بغیر کسی قسم کی ہچکچاہٹ کے کہنے پر مجبور ہوں کہ میں نے اس وقت تک کسی رئیس اور والیٔ ریاست کو اس قدر وسیع المعلومات، خوش تقریر، فصیح اللسان، نکتہ سنج اور معاملہ فہم نہیں دیکھا۔ جب نواب سلطان جہاں بیگم تقریر فرما رہی تھیں میں محو حیرت تھا کہ دہلی و لکھنؤ کی سرزمین کے علاوہ کیا کسی اور ریاست کا آدمی ایسی شستہ اور فصیح اردو بولنے پر قادر ہو سکتا ہے۔ وہ مختلف علمی اور انتظامی امور پر گفتگو فرما رہی تھیں اور میں سوچتا تھا کہ حجرہ نشین بھی اس قدر معلومات حاصل کر سکتی ہیں۔''

علم و ادب کے حوالے سے ڈاکٹر سلیم حامد رضوی لکھتے ہیں: عالمگیر کے زمانے میں مالوہ کے رہنے والوں کے روابط دکن سے بڑھ گئے تھے۔ اس لئے قدرتی امر ہے کہ وہ دکنی ادب اور شاعری سے بھی دلی کے مقابلے میں بہت پہلے متعارف ہو گئے تھے۔ یہی واقفیت ان علاقوں میں پہلے شاعری کے آغاز کا سبب بنی۔ دکن کی طرح یہاں کے لوگوں نے شاعری کو مذہبی تبلیغ اور اصلاح اخلاق کے لئے استعمال کیا جہاں تک لسانی اثرات کا تعلق ہے وہ یہاں بہت کم نظر آتے ہیں جبکہ ڈاکٹر مسعود حسن خان فائز کے کلام سے اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ دہلی کی زبان اور انداز بیان پر دکن کا سکہ بیٹھ چکا تھا۔ بھوپال کی زبان اور بیان میں دلی کے اثرات بالکل نہیں پائے جاتے

جو اس بات کا ثبوت ہے کہ یہاں کی ادبی زبان ارتقاء کا نتیجہ ہے نہ کہ تقلید کا۔ بھوپال کے خطے میں اردو کی ابتداء 1707ء سے بھی پہلے شروع ہوئی۔ قاضی محمد صالح بیرسیہ کی مثنوی ''اخلاقِ حسنہ'' اس کا بین ثبوت ہے پھر 1718ء میں قاضی محمد معظم کی تفسیر قرآن منظوم بھی اس علاقے میں اردو کے پرانے ہونے کا ثبوت پیش کرتی ہے۔ ان تمام تصانیف کی زبان نہایت سادہ صاف اور آسان ہے۔ اس میں عربی اور فارسی کا قطعی غلبہ نہیں ہے بلکہ عام بول چال کی زبان کو استعمال کیا گیا ہے۔ بھوپال کے پرانے لوگ اپنی تہذیب و ثقافت کے دل دادہ تھے وہ اپنے لباس اور حلیئے سے دور سے ہی پہچان لئے جاتے تھے۔ حکیم قمرالحسن اپنی تصنیف ''بھوپال کی قدیم تہذیب'' میں لکھتے ہیں:

''بھوپال کے لباس اور پوشاک کی الگ ہی خصوصیات تھیں۔ مردانہ لباس میں صافے کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ بندش کے طریقے بھی مختلف ہوتے تھے۔ شملہ لٹکانے اور صافے کو باندھنے کے طریقے بھی الگ الگ تھے۔ عالمانہ عبا و قبا کے علاوہ عام طور سے انگرکھا اور اچکن پہنی جاتی تھی۔ پائجامے کی مہری نہ زیادہ تنگ اور نہ زیادہ کشادہ ہوتی تھی، کمر بند میں چاقو بھی لٹکایا جاتا تھا تاکہ سپہ گری کی روایت برقرار رہے۔ اس زمانے کے ہندو صاحبان بھی دھوتیاں کم اور پائجامے زیادہ پہنتے تھے گھروں میں تلوار اور بندوق دیواروں پر لٹکانے کا رواج عام تھا۔ عورتوں کا لباس بہت خوش نما اور دیدہ زیب ہوتا تھا۔ آج تک اس زمانے کے زنانہ بھوپالی کرتے کی تراش اور طرز کو پسند کیا جاتا ہے۔ یہ کرتا کمر تک تنگ اور نیچے سے لمبا گھیر دار ہوتا تھا۔ کمر پر چنٹیں بھی ڈالی جاتی تھیں جن سے یہ اور زیادہ چست اور اسمارٹ ہو جاتا تھا۔ چوڑی دار پائجامہ جسے ازار بھی کہتے ہیں گھٹنے سے لے کر ٹخنے تک خوب چست اور تنگ مہری ہوتی تھی اور یہی لباس اس زمانے میں طوائفیں بھی پہنتی تھیں۔ دوپٹے پانچ گز کے اوڑھے جاتے تھے کیا مجال کہ سر اور سینے سے دوپٹہ سرک جائے۔ مرد بھی ننگے سر نہیں رہتے تھے۔ ٹوپی اور صافے

کا استعمال عام تھا۔

بھوپال قدیم آباد علاقہ ہے اس کی تاریخ راجہ بھوج سے جا ملتی ہے جو 1050ء میں بھوج پور میں حکومت کرتا تھا اسی نے بھوپال کے تالوں کو بنایا تھا۔ اسی کے نام پر یہ خطہ پہلے بھوج پال کہلاتا تھا اور پھر بگڑتے بگڑتے بھوپال بن گیا مگر تاریخی حقیقت یہ ہے کہ بھوپال شہر کی بنیاد دوست محمد خاں نے رکھی تھی اور اسے ایک شہر کی شکل دی تھی۔ یہاں کے زیادہ تر قدیم مکانات کچے تھے جو مٹی اور بھوسے کی آمیزش سے بنائے گئے تھے۔

جن کی چھتیں کھپریل کی ہوتی تھیں ان کو بارش سے پہلے از سر نو چھایا جاتا تھا چھویا مکان پر چڑھتے وقت تین مرتبہ آواز لگاتا تھا ''مکان پر چڑھتے ہیں پردہ کر لینا۔'' اس آواز پر آنگن میں بیٹھی بہو بیٹیاں ہوشیار ہو جاتیں۔ مرد بھی جب زنان خانے میں آتے تو کھانس کھنکار کر آیا کرتے گھریلو زندگی میں بھی شرم و حیا، تہذیب و شائستگی کو ہر دم ملحوظ خاطر رکھا جاتا۔ تو یہ تھی بھوپال کی تہذیب کا حال۔ یہاں کی گلیوں کا حال یہ تھا کہ وہ پرانے قلعوں کی بھول بھلیاں معلوم ہوتیں۔ ان گلیوں میں داخل ہونا جتنا آسان تھا اتنا ہی ان سے باہر نکلنا مشکل تھا۔ ان گلیوں کی خاص بات یہ تھی کہ ان میں بھوپال کی تہذیب کا بہت بڑا ذخیرہ موجود تھا۔ جہاں تک یہاں کے موسم کا تعلق ہے اس کے بارے میں ڈاکٹر گیان چند جین اپنی تصنیف ''جموں تا بھوپال گردش خیال'' میں رقم طراز ہیں: ''رجب علی بیگ سرور نے فسانۂ عجائب کے دیباچے میں کان پور کی برسات کی مذمت اور لکھنؤ کی برسات کی ستائش کی ہے۔ میرے پاس سرور کا قلم ہوتا تو میں بھی جموں اور بھوپال کے موسم کا مقابلہ کرتا بھوپال کے عناصر میں اعتدال ہے سردیوں میں سردی کم کم گرمیوں میں گرمی قابل برداشت اور برسات کا کیا کہنا۔ یہ بھوپال کی بہار ہے۔ وسط جون کے بعد موسم کی مدت ختم ہو جاتی ہے اور آسمان پر بادل اور فضا میں

سہانی ہوائیں خرام کرنے لگتی ہیں۔ بھوپال کی برسات نومبر کی طرح ٹھنڈی ہوتی ہے۔ بسا اوقات جولائی اور اگست میں گرم کپڑا پہننا پڑتا ہے۔ تیز بارش کے بعد روشن پورہ سے پولی ٹیکنک جانے والی سڑک پر وہاں چٹانوں سے ناہموار زینے پر پانی کے دھارے یوں اچھلتے کودتے گرتے پڑتے چلے جاتے ہیں جیسے پتھروں کے اوپر پہاڑی چشمے لڑکھڑا رہے ہوں اس کے مقابلے میں جموں کی برسات الامان والحفیظ'' بھوپال ہندوستان کا واحد شہر ہے جہاں ہاکی کو فوقیت حاصل ہوئی۔ بھوپال کے رہائشی بابائے ہاکی جناب محمد احمد رضوی کا ذکر کیے بغیر برصغیر پاک و ہند میں ہاکی کی تاریخ نامکمل رہے گی۔ انہوں نے ایک ایسے وقت میں بھوپال میں ہاکی کی داغ بیل ڈالی جب وہاں کے لوگ اس کے نام سے بھی واقف نہیں تھے۔ انھوں نے 1912ء سے 1946ء تک مسلسل ہاکی کھیلی اور کھلاڑیوں کی ایک ایسی کھیپ پیدا کی جس نے ہاکی کی دنیا میں گراں قدر کارنامے انجام دیئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس ریاست اور اس کے بلند حوصلہ باسیوں کی جتنی بھی تعریف کی جائے وہ کم ہی معلوم ہوتی ہے چنانچہ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ برصغیر میں ریاستیں تو بہت تھیں اور شہر بھی بہت ہیں مگر نہ کوئی ریاست بھوپال جیسی تھی اور نہ کوئی شہر اب بھی بھوپال جیسا ہے۔ بھوپال شہر قدرت کا عطیہ امن وسکون کا گہوارہ اور دل موہ لینے والا شاہکار مقام ہے۔ کہتے ہیں اورنگ زیب عالم گیر بھی اس خطے کے بارے میں کہا کرتا تھا کہ اس علاقے کی خاک قدموں سے لپٹ کر ٹھہر جانے پر مجبور کرتی ہے۔ جب سے میں (مصنف) نے بھوپال شہر کو دیکھا ہے میں بھی اس کا دیوانہ ہوگیا ہوں۔ یہ شہر میری جائے پیدائش شہر دموہ سے صرف سو میل کے فاصلے پر واقع ہے اور ہمارے صوبے مدھیہ پردیش کا دارالخلافہ ہے۔ میں ایک پاکستانی کے طور پر سوچتا ہوں کہ اگر ریاست بھوپال نہ ہوتی تو برصغیر میں ادب اور ادیبوں وشاعروں کی کون ہمت افزائی کرتا۔ اسلام اور مسلمانوں کا کون محافظ بنتا اور آزادی و پاکستان کی

کون وکالت کرتا؟ ان تمام امور میں جس طرح اس ریاست کا کردار ناقابل فراموش ہے اسی طرح بھوپال شہر کا کردار بھی لائق ستائش رہا ہے۔ اس ریاست کے نڈر اور بے باک نواب حمیداللہ خاں گو کہ اچھی طرح جانتے تھے کہ برصغیر کی آزادی کے بعد ان کی ریاست کا ان سے چھن جانا یقینی تھا مگر اس کے باوجود اس مردِ مجاہد نے نہ صرف برصغیر کی آزادی بلکہ برصغیر کی تقسیم میں اہم کردار ادا کیا اور قائداعظم محمد علی جناح کو وہ حوصلہ اور ولولہ عطا کیا کہ گاندھی کی شکست اور قائداعظم کی فتح یقینی بنا دی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس ریاست کے باسیوں اور حکمران گھرانے نے برصغیر کے مسلمانوں کے مستقبل اور تخلیق پاکستان میں اہم کردار ادا کر کے خود کو محسن پاکستان منوالیا۔ اب قیام پاکستان کے بعد بھوپالیوں نے تعمیر اور دفاع پاکستان میں جو مثالی کردار ادا کیا ہے اس کے لیے پوری پاکستانی قوم ہمیشہ ان کی احسان مند اور ان کے لئے دعا گو رہے گی۔ یہ بے شمار خوبیاں رکھنے والی ریاست اب بھارت میں ضم ہو کر ختم ہو چکی ہے مگر اس کی شان دار تاریخ سے ہر پاکستانی واقفیت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ افسوس کہ پاکستان میں بھوپال کی تاریخ پر کام نہیں ہوا! اور اسی لئے یہاں بھوپال کی تاریخ پر کتابیں دستیاب نہیں ہیں البتہ بھارت میں ضرور اس مرحوم ریاست کی تاریخ و ثقافت اور اس کے حکمرانوں کے کارناموں پر کئی کتابیں اردو، ہندی اور انگریزی میں تصنیف کی گئی ہیں مگر وہ پاکستان تک نہیں پہنچ سکی ہیں۔ میں نے ایک دن راحیل پبلی کیشنز کے روحِ رواں میاں راحیل سے بھوپال کی تاریخ پر کتاب کی فرمائش کر ڈالی۔ ان کے پاس گو کہ تمام ہی موضوعات پر کتابوں کا ذخیرہ رہتا ہے۔ خریداروں اور تشنہ گانِ علم کو ان کی دکان سے تقریباً ہر موضوع پر کتابیں مل جاتی ہیں مگر الیاس بھائی مجھے بھوپال کی تاریخ پر کوئی کتاب فراہم نہ کر سکے۔ انہیں اس بات کا بڑا ملال تو تھا مگر ساتھ ہی انہوں نے مجھ سے یہ سوال کر ڈالا کہ آپ نے کراچی کی تاریخ پر تو ایک ضخیم کتاب ''کراچی تاریخ کے آئینے میں'' تصنیف کی ہے۔ کیا

آپ بھوپال کی تاریخ پر کام نہیں کر سکتے؟ میں ان کے اس غیر متوقع سوال پر تھوڑا سا سٹپٹا گیا مگر پھر سنبھل کر بولا کہ کراچی کی بات اور ہے کہ یہ اس شہر کے لوگوں کی ضرورت تھی اور اب بھی ہے مگر بھوپال کی تاریخ پر اگر میں کام کروں بھی تو یہاں اس کتاب کو کون خریدے گا؟ کہنے لگے روز ہی کوئی نہ کوئی گاہک بھوپال کی تاریخ پر کتاب مانگنے آ جاتا ہے مگر اسے منع کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے کہ یہ کتاب پوری مارکیٹ میں کہیں بھی دستیاب نہیں ہے پھر مسکرا کر کہنے لگے۔ آپ فکر نہ کریں کہ اسے کون خریدے گا بس آپ اپنا کام شروع کریں کتاب کو فروخت کرنا میری ذمہ داری ہے۔ یہ 15 جون 2014ء کی بات ہے۔ بس اس دن سے میں نے اس اہم اور دلچسپ مگر مشکل موضوع پر کام شروع کر دیا اور بفضل تعالیٰ کتاب تیار ہوگئی اور اب وہ آپ کے ہاتھ میں ہے اگرچہ یہ کتاب مختصر ہے مگر اس میں بھوپال کی تاریخ کو مکمل طور پر سمونے کی کوشش کی گئی ہے۔ بھوپال کی تاریخ کے بارے میں کچھ غلط فہمیاں بھی چلی آ رہی تھیں میں نے انہیں دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ امید ہے کہ ہمارے بھوپالی بھائیوں اور غیر بھوپالیوں کو بھی ناچیز کی یہ کوشش ضرور پسند آئے گی۔

محمد عثمان دموہی

0314-8106380

☆☆☆

باب 1

بھوپال کا تعارف

بھوپال بھارت کا ایک ترقی یافتہ اور تاریخی شہر ہے 1949ء سے قبل یہ ریاست بھوپال کا دارالخلافہ تھا لیکن ریاست کے بھارت میں ضم ہونے کے بعد اب بھارتی صوبہ مدھیہ پردیش کی راج دھانی ہے۔ یہ شہر ریاست بھوپال کا 223 سال تک دارالخلافہ رہ چکا ہے۔ ریاست بھوپال غیر منقسم ہندوستان کی ریاست حیدر آباد کے بعد سب سے بڑی ریاست تھی۔ اس ریاست کی بنیاد 1723ء میں صوبہ سرحد کے علاقے اورکزئی سے تعلق رکھنے والے ایک جاں باز دوست محمد خاں نے رکھی تھی۔ یہ ریاست دو صدیوں سے زیادہ عرصے تک ان کی اولاد کے زیرِ نگیں رہی۔ اس ریاست پر مردوں کے علاوہ خواتین نے بھی حکومت کی۔ یہاں کی خواتین حکمرانوں نے اپنی ذہانت اور عدل و انصاف کے ذریعے انتہائی کامیاب حکمرانی کی تھی۔ پورے برصغیر میں ان کی کامیاب حکمرانی کا چرچا تھا۔ اب ہم ذیل میں ریاست بھوپال کے جغرافیہ اور قدرتی وسائل کا ذکر کریں گے۔

ریاست بھوپال تقریباً 6873 مربع میل علاقے میں پھیلی ہوئی تھی۔ یہ 22/4 اور 24/4 شمالی طول البلد اور 76/28 اور 78/52 عرض البلد کے درمیان واقع تھی۔ شمال میں اس کی سرحدیں گوالیار نرسنگھ گڑھ وغیرہ سے ملتی تھیں جنوب میں گونڈوانہ کا علاقہ تھا۔ شرق میں بندیل کھنڈ اور مغرب میں نربدا ندی بہتی تھی۔ چوں کہ اس علاقے

میں بھوج نام کا ایک مشہور راجہ حکومت کرتا تھا چنانچہ اس کے نام پر اس کا نام بھوجپال پڑا جو کثرت استعمال سے صرف بھوپال رہ گیا۔ بھوجپال کا مطلب راجہ بھوج کا بنایا ہوا باندھ ہے۔ اس باندھ کے گھیرے میں بھوپال شہر کے تمام ہی تالاب ہیں۔ بھوپال کا بڑا اور چھوٹا تالاب اسی باندھ کی وجہ سے وجود میں آئے ہیں۔ یہ باندھ راجہ بھوج نے صدیوں پہلے تعمیر کروایا تھا۔ ریاست کا بیشتر حصہ کوہستانی تھا۔ ریاست کو قدرتی لحاظ سے دو حصوں میں منقسم کیا جاسکتا تھا۔ (1) حدبی حصہ (2) کوہستانی حصہ۔

(1) حدبی حصہ 4047 مربع میل میں پھیلا ہوا تھا۔ اس نشیبی خطے میں گھاس کے میدان اور کالی مٹی کے خطے میں کپاس کی کاشت ہوتی تھی یہ حصہ بہت زرخیز تھا جس میں گیہوں، مکا، چاول بھی پیدا ہوتے تھے۔

(2) کوہستانی حصہ 2826 مربع میل میں پھیلا ہوا تھا۔ پہاڑی حصے گھنے جنگل سے گھرے ہوئے تھے جہاں کہیں کہیں نشیبی حصوں میں زرخیز زمین کے قطعات پائے جاتے تھے۔ جنوب مشرق میں ریتیلے پتھروں کے پہاڑی سلسلے پھیلے ہوئے تھے جو وندھیا چل کے کوہستانی سلسلوں سے مل جاتے تھے اس کوہستانی سلسلے کی دوسری شاخ شمال مغرب کی جانب بڑھتی ہوئی چلی گئی تھی جس کے مغرب میں شہر بھوپال واقع ہے۔ جنوب میں وندھیا چل کے کوہستانی سلسلے اور دریائے نربدا کی زرخیز وادی واقع تھی۔

بھوپال کے نزدیک ایک سنگار چولی نامی مقام ہے۔ جو 23/17 شمالی عرض البلد اور 77/14 مشرقی طول البلد پر واقع ہے۔ وہاں ایک پہاڑی چوٹی تقریباً 2015 فٹ اونچی ہے۔ دوسری بلند چوٹی جس کی اونچائی 2064 فٹ ہے۔ محل پور میں واقع ہے تیسری چوٹی ہوشنگ آباد کے نزدیک واقع ہے جہاں ریلوے لائن پہاڑی سلسلے کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہے اور جس کی اونچائی تقریباً 2173 فٹ ہے۔ زمانہ قدیم میں اس پہاڑی سلسلے کو وندھیا گری اور رکشا پہاڑ کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اہمیت کے لحاظ

سے وندھیا چل پہاڑ ہمالیہ کے بعد دوسرے نمبر پر شمار کیا جاتا ہے جو وسطی ہند کی جنوبی سرحد کا کام کرتا ہے۔ ہندو دھرم کی کہاوتوں کے مطابق سادھوؤں نے یہاں گیان دھیان اور تپسیائیں کی تھیں جن میں رشی اگھشیٹ کا نام خاص طور پر مشہور ہے۔ اس بزرگ کے حکم سے اس پہاڑی سلسلے نے اپنا سر جھکالیا تھا تاکہ وہ جنوب کی جانب اپنا سفر جاری رکھ سکیں یہ پہاڑ آج تک ان کی واپسی کے انتظار میں اپنا سر جھکائے کھڑا ہے۔

ندیاں:

اس خطے میں کئی ندیاں بہتی ہیں ان میں دو اہم ہیں جو بیتوا اور پاربتی کے نام سے مشہور ہیں۔ بیتوا وسط ہند کی تیسری بڑی ندی ہے۔ قدیم مصنفین نے اس کا نام ویترا ونی بتایا ہے جو پری یاترا پہاڑی سلسلے سے نکلی ہے۔ اس کے متعلق مشہور شاعر اور کتھا کار کالی داس لکھتا ہے۔ ''اس ملک کے دارالحکومت میں جاکر تم ویترا ولی کا میٹھا پانی پیوٗ گے اس کے کنارے بیٹھ کر اس کی مترنم آواز کے لطف کے ساتھ آب نوشی کو مزید خوش گوار اور پر ذائقہ پاؤ گے'' یہاں ویترا ولی سے مراد بیتوا ندی ہے۔ شہنشاہ اکبر کے دور میں ایک شاعر ''کیشو داس'' نے اس کی تعریف کے طور پر اسے ''رقیق یا سیال چاندنی'' سے خطاب کیا تھا۔ یہ ندی کری نام کے ایک گاؤں سے نکلتی ہے۔ یہ گاؤں تال تحصیل میں بھوج پور کے نزدیک واقع ہے۔ یہ ریاست بھوپال میں شمال مشرقی سمت میں پچاس میل تک بہتی ہے مگر ریاستی حدود میں کہیں بھی بڑی ندی کی شکل اختیار نہیں کرسکی۔ بھوج پور کے نزدیک یہ کلیاسوت نامی ندی سے مل جاتی ہے اور دونوں مل کر ''تال جھیل'' بناتی ہیں۔ کلیاسوت کے علاوہ کوہو، بنیاری، گنی اور کبروا دوسری معاون چھوٹی ندیاں ہیں۔ کلیا سوت ندی پاربتی آشٹہ کے نزدیک ''پرانا کھیڑی'' کے مقام سے نکلتی ہے۔ یہ ندی ریاست میں تقریباً نوے میل بہہ کر ریاست کی مغربی سرحد بناتی تھی۔ اس کی خاص معاون ندیاں

اجنال، پنیاس اور دو چھوٹی ندیاں ہیں۔ نربدا ندی ریاست کے جنوب میں بہتی تھی اور جنوبی سرحد بناتی ہوئی ریاست کے اندرونی حصے میں تقریباً 125 میل کا فاصلہ طے کرتی تھی۔ نربدا، گنگا، جمنا ندیوں کے بعد ایک مقدس ندی ہے۔ اس ندی میں ہر موسم میں پانی بہتا رہتا ہے۔

حیوانات:

ریاست گھنے جنگلات سے بھری ہوئی تھی جہاں شیر، چیتے، سانبھر، ہرن، نیل گائے وغیرہ بکثرت پائے جاتے تھے۔ یہاں جنگلی بھینسے بھی پائے جاتے تھے جو اب موجود نہیں ہیں۔

پرندوں کی بھی یہاں کمی نہیں تھی یہاں حسین مور سے لے کر جنگلی مرغ، قاز، سرخ سر والی بطخ، گیڈوال اور مرغابیاں پائی جاتی تھیں۔ تالابوں اور ندیوں میں مختلف قسم کی مچھلیاں پائی جاتی تھیں جن میں مہاتیرا، روہو اور سونڈ وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ یہاں سنگھاڑا، پڑین، بام اور کیٹلا مچھلیاں بھی باافراط ملتی تھیں۔

یہاں بارش 30 انچ سے 40 انچ تک ہر سال ہوتی ہے۔ بھوپال شہر کے آس پاس کے علاقوں میں 50 انچ تک بارش ہوتی ہے۔

☆☆☆

بھوپال کی قدیم تاریخ

جہاں تک ریاست بھوپال کی قدیم تاریخ کا تعلق ہے وہ انتہائی پیچیدہ اور دلچسپ ہے۔ تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ اس سرزمین کی تاریخ پتھر، لوہے اور کانسی کے ادوار سے ہوتی ہوئی موجودہ دور تک پہنچی ہے۔ اس خطے کو یہ فخر حاصل ہے کہ یہ قدیم انسانوں کی جائے رہائش رہا ہے۔ بھوپال شہر سے متصل بھیم پٹیکا غاریں قدیم انسانوں کی رہائش گاہیں رہی ہیں۔ یہ لوگ یہاں کے گھنے جنگلوں میں جانوروں کا شکار کر کے اور جنگلی پھل کھا کر گزارہ کرتے تھے۔ ان غاروں کے اندر دیواروں پر ایسی نایاب اور دلچسپ تصاویر بنائی گئی ہیں جنہیں دیکھ کر اس دور کے انسانوں کے فن کو داد دیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ ماہرین کا خیال ہے کہ یہ غاریں پتھر کے دور سے تعلق رکھتی ہیں۔ بعض ماہرین آثار قدیمہ کے مطابق ان کی قدامت فرانس میں دریافت ہونے والی دس ہزار سال پرانی ''چے اینز — CHAUVET'' غاروں سے مماثلت رکھتی ہے۔

تحقیق کے مطابق اس علاقے کے قدیم باشندے گونڈ اور بھیل ہیں یہ لوگ دراوڑوں کی طرح آریوں کے ہندوستان پر حملہ آور ہونے سے قبل پورے ہندوستان میں پھیلے ہوئے تھے، آریوں نے انہیں وسطی اور جنوبی ہند میں بسنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس علاقے میں گونڈوں اور بھیلوں کی اکثریت ہے اور وہی یہاں ماضی میں حکومت کرتے رہے ہیں۔ نامور محقق محمد احمد سبزواری نے جریدہ ''فکر و آگہی'' دہلی کے بھوپال نمبر میں شائع ہونے والے اپنے ایک طویل مضمون میں رومیلا تھاپر کے حوالے سے اس خطے پر پرتی ہارا خاندان سے تعلق رکھنے والے ایک راجہ بھوج کی حکمرانی کا ذکر کیا ہے۔

اس راجہ کی راجدھانی بھوج پور تھی۔ اس راجہ کے مرنے کے بعد اس کے لواحقین ایک طویل عرصے تک یہاں حکمرانی کرتے رہے تھے مگر بعد کے حکمرانوں کی نااہلی کی وجہ سے ان کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔ اس خاندان کے زوال کے بعد یہاں پرمارا خاندان سے تعلق رکھنے والے راجاؤں نے حکومت کی۔

وسطی ہند کی تاریخ کے مطابق اس علاقے پر مختلف ادوار میں مختلف خاندانوں نے حکومت کی ہے۔ تحقیق کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے قبل سے لے کر مغلوں تک یہاں مندرجہ ذیل خاندانوں نے حکومت کی تھی۔

187 قبل مسیح میں سن گس خاندان (Sungas Dynasty) نے اس علاقے پر حکومت کی۔ ان کی حکومت بہار سے نرمدا ندی کے جنوبی علاقوں تک پھیلی ہوئی تھی، جن میں بھوپال کے قرب وجوار کے علاقے بھی شامل تھے۔

75 قبل مسیح میں کنواس خاندان (Kanvas Dynasty) نے اس علاقے پر حکمرانی کی۔ ان کا دارالخلافہ ودیشا تھا۔

سن 1 سے 3 عیسوی تک ستواہنس اور کش تراپ خاندان نے یہاں حکومت کی۔

سنہ 3 سے 4 عیسوی میں ناگا خاندان (Nagas Dynasty) کی اتر پردیش کے کئی علاقوں سے لے کر بندیل کھنڈ تک حکومت قائم تھی۔ ان کا دارالخلافہ گوالیار تھا۔

سنہ 4 عیسوی میں ہی وٹاس کس خاندان کے اس علاقے پر حکمرانی کے آثار ملتے ہیں۔ ان کی حکومت بندیل کھنڈ اور واردھا کے درمیانی علاقوں پر قائم تھی۔ ان کا دارالخلافہ ودیشا تھا۔

سنہ 5 سے 6 عیسوی میں پریواجاکس اور اتکل خاندانوں کی حکمرانی اس علاقے پر قائم رہی۔ ان کا دارالخلافہ ضلع ستنہ کے قریب واقع مقام اوچ کلپا تھا۔

سنہ 6 عیسوی میں اس علاقے پر مہیس متی کلچورس خاندان (Mahis Mati

(Kalchuris Dynasty) کی حکمرانی قائم رہی۔

سنہ 7 عیسوی میں وردھا ناس (Vardhanas Dynasty) اور چلوکا (Chalukyan Dynasty) نامی خاندانوں نے یہاں حکومت کی ان کے راجہ بہت طاقتور تھے۔ جن کے نام ہریشہ وردھنا (Harsha Vardhana) اور پلاک اشان (Pulak Eshan) ہرشہ وردھنا سے چینی سیاح (Hvien Tsang)۔ ہیون سنگ سے ملاقات ہوئی اور ہرشہ نے اسے ہندوستان کے بارے میں تفصیل سے معلومات فراہم کی تھیں۔ ان کی سلطنت کی حدود ہمالیہ سے نرمدا ندی کے جنوبی علاقوں تک پھیلی ہوئی تھیں۔

747 عیسوی میں راشٹرا کٹاس خاندان (Rashta Kutas Dynasty) نے ان علاقوں پرحکمرانی کی ان کا دارالخلافہ ودھرابھا تھا۔

سنہ 8 عیسوی میں پراتیہارا خاندان (Pratihara Dynasty) نے یہاں حکومت کی۔ ان کا دارالخلافہ قنوج تھا۔ اس خاندان کے ایک راجہ ناگا بھاتا (Naga Bhata) نے مالوہ پر ایک مضبوط حکومت قائم کی۔ اس خاندان کے افراد میں جب اقتدار کے معاملے میں جھگڑے اُٹھ کھڑے ہوئے تو بہت کمزور ہو گئے۔ اور راشٹرا کٹاس خاندان سے شکست کھا گئے تاہم پرتیہارا خاندان کی حکومت گوالیار اور گردونواح کے علاقوں پر قائم رہی۔

سنہ 7 سے 10 عیسوی تک تری پورہ کلچوروں نے یہاں حکومت قائم کی۔ اس خاندان کے ایک راجہ وام رائے (Vam Roy) کی حکومت میں جبل پور، ستنہ اور پنا کے علاقے شامل تھے۔ اس خاندان کے 14 راجاؤں نے یہاں حکومت کی۔

946 سے 1300ء تک پرمارا خاندان (Paramara Dynasty) کے راجاؤں نے یہاں حکومت کی۔ اس خاندان کا راجہ بھوج بہت مشہور ہوا۔ اس خاندان

کے راجاؤں نے تقریباً 400 سال تک اس خطے پر حکومت کی۔ انہیں چنڈیلوں نے شکست دے کر پورے علاقے پر اپنی حکمرانی قائم کی۔

سنہ 1300 - 1350 تک چنڈیلوں کی اس خطے پر حکمرانی قائم رہی۔ ان کے دور میں اس خطے میں زبردست ترقی اور خوشحالی آئی۔ ان کے دور کی خوشحالی کا اندازہ خجراؤ کے شاندار مندروں سے کیا جا سکتا ہے۔ یہ مندر مجسمہ سازی کا شاندار شاہکار ہیں اور کثیر تعداد میں موجود ہیں جن پر کثیر رقم خرچ کی گئی ہوگی۔

سنہ 1350 کے بعد مالوہ ریاست اور اس کا دارالخلافہ دھار غوریوں کے زیر تسلط رہا۔ 1401ء میں غوریوں کے مقامی گورنر دلاور خان اور اس کے بیٹے الپ خان نے دہلی سے بغاوت کر کے اس علاقے کو اپنے کنٹرول میں لے لیا۔ خودمختاری کے بعد الپ خان نے اپنا نام بدل کر ہوشنگ شاہ رکھ لیا اور دارالخلافہ دھار سے مانڈو منتقل کر لیا۔ بعد میں خلجیوں نے ہوشنگ شاہ کو زہر دلا کر ہلاک کرا دیا۔ 1531ء کے بعد یہاں خلجیوں کی حکومت قائم ہو گئی۔ 1542ء میں اس علاقے کو شیر شاہ نے فتح کر کے اپنے ایک جنرل شجاعت خان کو مانڈو کا گورنر بنا دیا۔ 14 ویں صدی میں یہاں بندیلا خاندان (Bundela Dynasty) نے حکومت قائم کی۔ وہ پہلے واردھا پر قابض ہوئے پھر مزید طاقت بڑھا کر چندیلوں کو شکست دینے میں کامیاب ہو گئے۔ انہوں نے شہنشاہ شاہ جہاں کے اِس علاقے پر قابض ہونے تک حکومت کی۔ بندیلوں نے شاہجہاں کی فرمانبرداری قبول کر لی تھی۔ اس طرح 1692 عیسوی تک حکومت کرتے رہے مگر آخری بندیلا حکمران جھجھر سنگھ نے شاہجہاں سے بغاوت کی جس کی وجہ سے شاہجہاں کی فوجوں نے اسے شکست دی اور وہ اس جنگ میں مارا گیا۔

پھر 1561ء سے 1761ء تک مغلوں نے یہاں حکومت کی۔ 1561ء میں راجہ باز بہادر کو اکبر بادشاہ نے شکست دے کر اس علاقے کو حاصل کر لیا تھا۔ اورنگ

زیب عالم گیر کی وفات کے بعد یہ علاقہ کئی ریاستوں میں بٹ گیا اور زیادہ تر علاقے مراٹھوں کے قبضے میں چلے گئے۔

گو کہ بھوپال اور قرب و جوار کے علاقوں پر مختلف خاندانوں نے حکومت کی مگر ان میں صرف دو خاندان ایسے ہیں جن کے راجاؤں کے بارے میں ہمیں تاریخ مین کچھ ذکر ملتا ہے۔ ان میں ایک پرتیہارا اور دوسرا پرمارا خاندان ہے۔ پرمارا خاندان کے راجاؤں کو بھوج کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

پرتیہارا خاندان کے راجہ ناگا بھاتا کے بارے میں پہلے ہی ذکر آ چکا ہے۔ اب ہم پرتیہارا خاندان کے بعد اس خطے پر حکومت کرنے والے پرمارا خاندان کے راجہ بھوج کا ذکر کریں گے۔ اس راجہ کے بارے میں تحقیق سے کافی مواد حاصل ہوا ہے۔

یہ راجہ بھوج کے نام سے مشہور تھا۔ تحقیق کے مطابق بھوج ایک خطاب تھا جو ہندوستان کے کئی راجاؤں نے اختیار کیا تھا۔ پرمارا خاندان کا یہ راجہ گونڈ تھا۔ یہ اس خطے پر 1000 عیسوی سے 1055 عیسوی تک حکومت کرتا رہا۔ اس راجہ کو ہندوستانی تاریخ کا ایک اہم شخص سمجھا جاتا ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے وسطی ہند یعنی موجودہ بھارتی صوبہ مدھیہ پردیش کے بیشتر اور گجرات و مہاراشٹر کے کچھ علاقوں پر 55 سال تک نہایت شان و شوکت کے ساتھ حکومت کی تھی۔ وہ تمام ہندوستانی راجاؤں میں خصوصی اہمیت کا حامل تھا۔ اس نے محمود غزنوی کے سومناتھ مندر پر حملے کے بعد ہونے والی تباہی کے اثرات کو زائل کرنے اور سومناتھ مندر کو از سر نو آراستہ کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ اسی راجہ نے سومناتھ مندر کو آئندہ کے حملہ آوروں سے محفوظ بنانے کے لئے ہندوستان کے کئی راجاؤں کے ساتھ مل کر ایک خصوصی حفاظتی فوج تیار کی تھی۔ محمود غزنوی کے بعد جب اس کے بیٹے مسعود غزنوی نے حملہ کیا تو راجہ بھوج کی فوج نے دیگر ہندوستانی راجاؤں کی فوج کے ساتھ مل کر اس کا مقابلہ کر کے اسے ناکام غزنی واپس

جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ تاہم جہاں تک سومناتھ مندر کا تعلق ہے وہ اب تک چھ بار مختلف حملہ آوروں کا نشانہ بن کر لوٹا اور تباہ کیا جا چکا ہے۔ حیرت ہے کہ محمود غزنوی کے مندر پر حملے کو تو خوب اچھالا جاتا ہے مگر اس سے پہلے اس مندر کو تین مرتبہ اور بعد میں دو مرتبہ لوٹا اور تباہ کیا گیا اس کا ذکر کوئی نہیں کرتا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ مندر انتہائی قدیم ہے یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے قبل بھی موجود تھا۔ اسے ہر تباہی کے بعد اس کی اصل جگہ پر ہی تعمیر کیا گیا۔ اس مندر کا تعلق صرف بڑی ذات کے ہندوؤں سے تھا۔ ہندوستان کے تمام راجہ مہاراجہ اسے نہایت متبرک خیال کرتے ہوئے اس پر سونے چاندی اور ہیرے جواہرات کی بارش کرتے رہتے تھے۔ اس کے لوٹے جانے اور حملہ آوروں کے اس پر چڑھائی کرنے کی وجہ بھی دراصل اس میں کثیر مقدار میں موجود مال و زر تھا۔ روایت کے مطابق محمود غزنوی اس کے خوبصورت مین گیٹ کو نکال کر غزنی لے گیا تھا جسے اس نے غزنی کی جامع مسجد کے صدر دروازے پر نصب کر دیا تھا بعد میں برصغیر کی آزادی کے بعد اس وقت کی افغان حکومت نے بھارتی وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی درخواست پر اسے ہندوستان کو واپس کر دیا تھا۔ سومناتھ مندر کے بارے میں یہاں تفصیل بیان کرنے کا صرف یہ مقصد ہے کہ بھوپال کے قدیم راجہ بھوج کے اس مندر پر کئی احسانات ہیں جنہیں کبھی بھی نہیں بھلایا جا سکے گا۔

راجہ بھوج بہادر اور کئی علوم کا ماہر تھا۔ اس نے اپنی زندگی بندیل کھنڈ جیسے پسماندہ علاقے میں تہذیب و تمدن، علم اور روحانیت کو پروان چڑھانے کے لئے وقف کر دی تھی۔ اس کے قائم کیے گئے علم و ہنر کے اداروں سے بے شمار لوگوں نے فیض حاصل کیا۔ وہ فن حرب کا بھی ماہر تھا۔ اس کے عسکری تربیتی مراکز سے تربیت پانے والے فوجیوں نے اس کی حکومت کی بقاء اور استحکام کے لئے اہم کردار ادا کیا تھا۔ راجہ بھوج فن تعمیرات کا بھی ماہر تھا۔ اس نے زراعت اور انسانی روز مرہ کی ضرورت کے

لئے پانی کی دستیابی کو یقینی بنانے کے لئے علاقے کے پہاڑوں سے موسم برسات میں بہہ کر آنے والے پانی کو اکٹھا کرنے کے لئے دو بڑے تالاب بنوائے تھے ان ہی تالابوں کے گرد بسنے والی آبادی نے رفتہ رفتہ بھوپال شہر کی شکل اختیار کی تھی۔

اس نے مختلف علوم کے 84 انسائیکلو پیڈیا مرتب کرائے تھے جن میں فن تعمیر، شہری منصوبہ بندی، فلسفہ، ادب، شاعری، موسیقی، مختلف دھاتوں کی پیداوار، مختلف امراض کی ادویات کی تیاری اور انسانی جسم کو خوبصورت بنانے سے متعلق وسیع معلومات موجود تھیں۔

بھوپال سے چند میل کے فاصلے پر اس کا دارالخلافہ واقع تھا جو اس کے ہی نام پر بھوج پور کہلاتا تھا۔ اس نے یہاں ایک عظیم مندر تعمیر کروایا تھا جو فن تعمیر کا جیتا جاگتا شاہکار تھا۔ اس کی خوبصورتی کے آثار آج بھی سیاحوں کو مبہوت کر دیتے ہیں۔ یہ مندر بھگوان شیوا کے نام سے موسوم تھا۔ اسی راجہ نے اپنے علاقے میں کئی بھوج شالائیں بنوائی تھیں۔ یہ عمارتیں جو وسیع رقبے پر محیط تھیں مختلف علوم کی تعلیم کے لئے کلاس رومز، لائبریریز، تھیٹرز اور رہائشی کوارٹرز پر مشتمل تھیں۔ یہاں پجاریوں سے لے کر دانشور طالب علم، رقاص مجسمہ ساز اور دیگر ماہرین ایک ساتھ جمع ہوتے تھے۔ وہ اپنے خیالات کا اظہار اور تبادلہ کرتے تھے بعض امور پر بحث بھی کرتے تھے۔ یہاں اکثر سیمینار اور مختلف مخصوص کورسز کی کلاسیں بھی منعقد کی جاتی تھیں۔ اس قسم کی بھوج شالائیں بھوج پور کے علاوہ اس کی مملکت کے دیگر شہروں میں بھی قائم تھیں جن کا سارا خرچ راجہ بھوج خود برداشت کرتا تھا۔ مدھیہ پردیش کے ضلع دھار میں ایک ایسی ہی بھوج شالا تادیر قائم رہی اور اس کے آثار آج بھی موجود ہیں۔

راجہ بھوج کے سلسلے میں تاریخ میں یہ بھی واقعہ ملتا ہے کہ ایک وقت ایسا بھی آیا جب اس کے دماغ میں ایک رسولی کا انکشاف ہوا۔ یہ دسویں عیسوی کی بات ہے۔

بھوج پور کے نزدیک واقع اجین شہر میں رہائش پذیر دو بھائیوں نے راجہ بھوج کو بے ہوش کر کے اس کے سر کو کھولا اور دماغ کی رسولی کو نکال دیا تھا۔ اس زمانے میں یہ جدید دور کی طرز کا انوکھا آپریشن تھا۔ اس دستی آپریشن کے بعد راجہ بھوج بالکل تندرست و توانا ہوگیا تھا اور اپنی حکومت کے کاروبار کو بخیر و خوبی چلانے لگا تھا۔ راجہ بھوج علم و دانش کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ اپنے دشمنوں سے کئی جنگیں نہایت بہادری کے ساتھ لڑا اور کامیابیاں حاصل کیں۔ اس کے دور میں مثالی امن و امان اور خوش حالی کی وجہ سے اس کی ریاست کے جولاہے سے لے کر خواص تک سب ہی شعر و ادب کے دلدادہ تھے۔ ایک جولاہے نے راجہ بھوج کی شان میں ایک شان دار نظم رقم کی تھی جس کا مفہوم یوں تھا ''اس کے دور میں علم کا دریا بہہ رہا ہے، تمام علوم وفنون ترقی کی معراج پر ہیں اور ان سے فائدہ اٹھانے والے قابل احترام ہیں۔ یہ سب اس لئے ہے کہ راجہ بھوج زمین پر موجود ہے۔ راجہ بھوج کے مرنے پر اسی شاعر نے کہا تھا ''علم و دانش کا دریا اب خشک ہوگیا ہے تمام علوم وفنون کے متوالے پریشان ہیں اس لئے کہ راجہ بھوج دنیا میں نہیں رہا ہے۔''

راجہ بھوج جسے تاریخ ہند میں عظیم راجہ بھوج کا نام دیا گیا ہے۔ ہندوستان کے تمام راجاؤں اور مہاراجاؤں میں منفرد حیثیت کا حامل تھا وہ علوم وفنون کا دلدادہ ہونے کے ساتھ ساتھ ہندو دھرم کا عظیم مبلغ بھی تھا۔ یہ راجہ اگرچہ ہندوؤں کے باہمی اتحاد کا علم بردار تھا اور اس نے ہندوستان کی ثقافت کو غیر ہندو حملہ آوروں سے بچانے کے لئے ایک مشترکہ ہندو فوج کی داغ بیل بھی ڈالی تھی مگر یہ اتحاد زیادہ دیر چل نہ سکا اور ہندو راجہ پھر ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوگئے۔ وہ ایک دوسرے کی ریاست پر حملہ کر کے اپنی ریاست کی سرحدوں کو بڑھانے لگے۔ ہندو راجاؤں کی باہمی چپقلش کی وجہ سے غیر ملکی حملہ آوروں کو ہندوستان میں کامیابیاں ملتی رہی ہیں۔ گجرات کے راجہ سے راجہ بھوج کی ریاست کی خوش حالی نہ دیکھی گئی اور اس نے ایک دوسری ریاست کے راجہ

کو ساتھ ملا کر راجہ بھوج کی ریاست پر حملہ کر دیا یہ جنگ کئی دنوں تک چلی مگر اس جنگ میں دشمن کے سپاہی کا ایک تیر راجہ بھوج کے سینے کو چیرتا ہوا دوسری سمت نکل گیا۔ گو کہ راجہ بھوج چل بسا تھا مگر ریاست پر دشمن کا قبضہ نہ ہو سکا۔ راجہ بھوج کے بعد اس کے لواحقین کئی سالوں تک حکومت کرتے رہے مگر بعد میں اپنی نااہلی کی وجہ سے خود مارے گئے اور ریاست کو بھی کھو بیٹھے۔

رسالہ فکر و آگہی دہلی کے بھوپال نمبر میں راجہ بھوج کے بارے میں یہ روایت بھی بیان کی گئی ہے کہ ایک رات وہ اپنے محل کی چھت پر لیٹا ہوا تھا کہ اس نے آسمان پر چاند کو دو ٹکڑے ہوتے ہوئے دیکھا۔ اس نے اس عجیب و غریب واقعے کی تحقیق کے لئے اپنے درباریوں کو اطراف عالم میں دوڑایا جو شخص عرب گیا تھا اس نے واپس آ کر شق القمر کے واقعے کی تفصیل بتائی اور اسے پیغمبرؐ اسلام کا معجزہ بتایا۔ اس شخص نے راجہ بھوج کو اس بات سے بھی باخبر کیا کہ وہ ایک سچے نبیؐ ہیں جن کے دست حق پرست پر لوگ جوق در جوق بیعت کر کے مشرف بہ اسلام ہو رہے ہیں۔ راجہ بھوج اس خبر سے بہت متاثر ہوا اور اس نے پیغمبرؐ اسلام کی خدمت میں ایک وفد روانہ کیا جو کچھ ہندوستانی تحفے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنے ساتھ لے کر گیا تھا۔ کہتے ہیں ان تحائف میں پان کا پتہ بھی شامل تھا۔ جب یہ وفد حضورؐ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا تو حضورؐ نے پان کے پتے کے بارے میں بتایا کہ یہ دافع برص و جذام ہے۔ ہندی وفد کے سربراہ کا نام ماتا دین بتایا جاتا ہے۔ وہ اسی وقت مسلمان ہو گیا اور اس کا نام محی الدین رکھا گیا تھا۔ اس وفد کی واپسی پر ایک عبداللہ نامی صحابی ان کے ساتھ ہندوستان آئے تھے ان کے دست حق پرست پر راجہ بھوج نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا۔ اس روایت کے مطابق راجہ بھوج کی قبر دھار شہر میں عبداللہ صحابی کے پائنتی واقع ہے۔

تاہم اب تحقیق کے بعد یہ ثابت ہو چکا ہے کہ جس راجہ بھوج نے شق القمر

کے واقعے سے متاثر ہو کر اسلام قبول کیا تھا وہ دراصل بھارت کی جنوبی ریاست کیرالہ سے تعلق رکھتا تھا ثبوت کے طور پر وہیں نبویؐ دور کی ایک مسجد اب بھی موجود ہے جس پر تعمیر کا سن 629ء کندہ ہے۔ وکی پیڈیا کے مطابق اس مسجد کا نام چیرامن جامع مسجد ہے جو اسی راجہ کے نام سے موسوم ہے۔ اس راجہ بھوج کا نام اس کے اسلام لانے کے بعد تاج الدین رکھا گیا تھا۔ جہاں تک بھوج پور کے پرمارا خاندان کے راجہ بھوج کے اسلام لانے والی بات ہے وہ اس لئے بھی درست نہیں ہے کہ تاریخی ریکارڈ کے مطابق پرمارا راجہ بھوج ایک کٹر ہندو تھا جس نے سومناتھ کے مندر کی حفاظت کے لئے سخت انتظامات کروائے تھے اس کی فوجوں نے محمود غزنوی کے بیٹے مسعود غزنوی کے سومناتھ پر حملے کو بھی ناکام بنایا تھا۔ شاید موصوف کو یہ تاریخی مغالطہ اس لئے بھی ہوا ہے کہ ہندوستان کے کئی راجاؤں نے بھوج کا لقب اختیار کیا تھا۔ یہ لقب بہت مقدس اور خوش نصیبی کا موجب سمجھا جاتا تھا۔ بہرحال جہاں تک پرمارا خاندان کے راجہ بھوج کا تعلق ہے ہم اسی کے ذکر کو بیان کر رہے ہیں کیوں کہ وہ وسطی ہند سے تعلق رکھتا تھا اس کی راجدھانی بھوج پور تھی۔ اسی شہر سے چند میل کے فاصلے پر اس نے جن دو بڑے تالابوں کو بنایا تھا اور جہاں قریبی پہاڑوں کے برساتی پانی کو اکٹھا کیا جاتا تھا بعد میں ان کے ارد گرد آبادی ہونا شروع ہوگئی تھی کیوں کہ کھیتی باڑی کے لئے یہ جگہ انتہائی موزوں تھی۔ ابتداء میں یہ مقام ایک گاؤں سے زیادہ نہ تھا مگر پانی کی وافر دستیابی، بہترین محل وقوع اور زرخیز زمین کی وجہ سے یہ مقام عوام الناس کے لیے نہایت پرکشش ثابت ہوا۔ مگر راجہ بھوج کے 1030ء میں مرنے کے بعد یہ علاقہ وہ ترقی نہ کر سکا جس کی یہ سرزمین متقاضی تھی۔

میگزین سہ ماہی فکر و آگہی دہلی کے بھوپال نمبر مطبوعہ 1996ء میں محمد احمد سبزواری اپنے مضمون میں راجہ بھوج کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ڈاکٹر فیلن نے

بھوپال یا بھوج پال کے معنی ''شاہ'' کے لکھے ہیں۔ دوسرے معنی میں اسے بھوج کی جگہ یا مقام بھی کہا جاسکتا ہے۔ بھوج کے معنی مقدس کے بھی ہیں۔ یہ ایک متبرک درخت کا نام بھی ہے جسے بھوج پتر یعنی بھوج کے درخت کی چھال جس پر پنڈت جنتر منتر (تعویز) لکھتے ہیں۔ دراصل بھوج ایک لقب ہے اور ہندوستان میں بہت سے راجہ اسی لقب سے مشہور ہوئے۔ مثلاً تاریخ میں ایک راجہ مہیر کا ذکر بھی ملتا ہے جو بھوج کے لقب سے مشہور تھا یہ گوجروں کی شاخ ہری بار سے تعلق رکھتا تھا اس کی راج دھانی قنوج تھی۔ اس کی سلطنت گجرات، مالوہ اور مگدھ تک پھیلی ہوئی تھی اس نے پچاس برس حکومت کی مگراس کے مرنے کے بعداس کے جانشینوں کے ہاتھ سے اکثر علاقے نکل گئے پھر بھی یہ لوگ قنوج پر حکومت کرتے رہے۔ رومیلا تھاپر نے اپنی کتاب تاریخ ہند میں ایک اور راجہ بھوج کا ذکر کیا ہے جس نے ساتویں اور بارہویں صدی عیسوی کے درمیان کسی وقت حکومت کی یہ پرتی ہارا خاندان سے تعلق رکھتا تھا اس نے مغرب میں عربوں اور مشرق میں پالیوں کو روکنے کی ناکام کوششیں کیں۔ وہ اپنی خواہش کے مطابق دکن پر حملہ نہ کرسکا، پھر پروروں Pawars نے مالوہ پر اقتدار حاصل کرلیا ان کی راج دھانی اندور کے قریب دھار تھی اسی خاندان نے بعد میں پرمارا کا لقب اختیار کیا۔ تھاپر اس سلسلے میں وہ کہانی بھی بیان کرتی ہے کہ کس طرح ان کی وہ مقدس گائے جو ہر خواہش کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی کسی دوسرے رشی نے چرالی اور کس طرح کوہ آبو پر اگنی گولا (قربانی کا الاؤ) روشن کیا گیا جس میں سے ایک سورما پیدا ہو جس نے دشمن سے گائے واپس حاصل کرلی تھی۔ پرمار کے معنی ''دشمن کا قاتل'' ہیں پھر یہ خاندان مالوہ پر چھا گیا۔ قاضی واجدالحسینی نے اسی خاندان میں ایک راجہ بھوج کا ذکر کیا ہے۔ 541 سمت میں دھار میں تخت نشین ہوا۔ یہ بڑا عالم فاضل تھا اس کے دربار میں پانچ سو اہل کمال کا ہجوم رہتا تھا واجدی صاحب نے حضرت امیر خسروؒ کے حوالے سے بھوج کا ذکر

کیا ہے جو بعد میں پیشوا کہلایا۔

جناب محمد احمد سبزواری اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ نواب شاہجہاں بیگم (بیگم بھوپال) کی کتاب ''تاج الاقبال'' میں درج ہے کہ راجہ بھوج بانیٔ بھوپال نے شق القمر کا معجزہ اپنی آنکھ سے دیکھا اور آنحضرتؐ کی بعثت کی اطلاع پا کر مسلمان ہوگیا۔ لیکن میں نے اس واقعے کو عربی اور فارسی کی جو کتابیں سیرت پر پڑھی ہیں ان میں کسی جگہ اس کا ذکر نہ پایا اور نہ کسی عالم نے اس واقعے کی جانب اشارہ کیا۔ البتہ یہ روایت ضرور ہے کہ چند مسلمان دھار آئے اور کافروں کے ہاتھوں شہید کر دیئے گئے۔ اس کے بعد عبداللہ چنگال مدینہ منورہ یا مکہ معظّمہ سے دھار تشریف لائے اور راجہ بھوج نے ان کے ذریعے اسلام قبول کیا لیکن اس واقعے کی تاریخ و سال کا علم نہ ہوسکا۔ تصنیف تاج الاقبال میں ہی راجہ بھوج کے اپنے کنبے کے ساتھ مسلمان ہونے کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کا روضہ مرجع عام بن گیا تھا مگر بعد میں گمنامی میں ڈوب گیا۔ پھر شاہجہاں بادشاہ نے اسے از سر نو تعمیر کرایا۔ کتبے پر شاہ کا لفظ لکھا ہوا ہے مگر اس شاہ سے مراد کون سا بادشاہ ہے اس کی تشریح نہیں ہے۔ تاہم زمانے کے لحاظ سے یہ شاہ محمد تغلق ہوسکتا ہے۔ جو تاریخ میں اپنے عجیب و غریب فیصلوں کی وجہ سے بدنام ہے۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ اس نے یہ خطہ فتح کیا تھا اور اس کو بزرگان دین سے بے حد عقیدت تھی۔ اس کے دور میں مالوہ میں خلجیوں کی آزاد حکومت قائم ہوگئی تھی اور اس کا چوتھا سلطان محمود شاہ خلجی تھا تصنیف ہٰذا میں شہنشاہ کو محمود شاہ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے جس نے قبور کو مضبوط اور مستحکم کیا مسجد، حجرے اور لنگر خانے تعمیر کرائے لیکن تعمیر کا سن نہیں لکھا گیا۔

ریاست بھوپال کی ایک تحصیل اور اس کے صدر مقام کا نام گوہر گنج عرف گلیا کھیڑی ہے کہتے ہیں اس قصبے کو کلیان سنگھ نے راجہ بھوج کے زمانے میں آباد کیا تھا۔ اس تحصیل کو ''تحصیل تال'' بھی کہا جاتا ہے کیوں کہ اس پہاڑیوں سے گھری ہوئی وادی پر

راجہ بھوج نے بند باندھ کر ایک بڑی جھیل بنائی تھی اور موجودہ شہر بھوپال کی طرف آنے والی ندی کلیا سوت کو بھی اس سے ملا دیا تھا۔ اس کا رقبہ ڈھائی سو مربع میل تھا اس زمانے میں برصغیر میں اتنی بڑی کوئی جھیل نہیں تھی۔ اس لئے یہ اطراف عالم میں ایک عجوبے کے طور پر مشہور ہوگئی تھی۔ مالوہ کے دوسرے سلطان ہوشنگ الپ خان یا ہوشنگ شاہ جس نے 1405ء - 1435ء میں شہر ہوشنگ آباد بسایا تھا، نے اس بند کا کچھ حصہ کاٹ کر پانی بہا دیا تھا کیوں کہ گھنے جنگلات اور پہاڑیوں کی وجہ سے ڈاکو اس علاقے اور بالخصوص اس کے نو آباد شہر میں آتے اور ان میں لوٹ مار مچایا کرتے تھے۔ کہتے ہیں تین سال کے بعد پانی سے یہاں کی بنجر زمین قابل کاشت ہوگئی اور مالوہ کی آب و ہوا میں فرق آ گیا۔

ایم عرفان اپنے ایک مضمون میں اس جھیل کی وجہ تسمیہ یوں بیان کرتے ہیں:

راجہ بھوج کو برص کا مرض ہوگیا تھا اور جب دواؤں سے کوئی فائدہ نہیں ہوا تو اس نے سنیاسیوں سے رجوع کیا ایک سنیاسی نے بتایا کہ راجہ کو ایک جھیل بنانا چاہیے جس سے بڑی کوئی نہ ہو جس میں سال کے ہر دن کے لحاظ سے 365 چشموں کا پانی جمع ہوا کرے اور ایک خاص دن راجہ کو اس میں اشنان کرنا چاہیے چنانچہ 40 فٹ اونچا اور 100 فٹ چوڑا ایک بند باندھا گیا لیکن جب اس میں گرنے والے چشموں کو گنا گیا تو ان کی تعداد 359 نکلی۔ اس وقت ایک گونڈ سردار کلیا نے ایک اور ندی کا پانی بتایا جس میں چھ چشمے گرتے تھے چنانچہ اس ندی کو کلیا سوت کہا گیا لیکن یہ ندی اس وادی سے باہر بہتی تھی لہٰذا انہوں نے بھوپال کے بڑے تالاب پر ایک دوسرا چھوٹا بند بنایا اور کلیا سوت کو بڑی جھیل سے ملا دیا اس طرح بھوج پور کا بڑا بند اور بھوپال کا چھوٹا بند وجود میں آئے۔ اس طرح دو بندوں کو ایک سمجھنے کی روایت دم توڑ دیتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ مالوہ میں بھوج کا لفظ کافی مشہور رہا ہے۔ صرف ریاست

بھوپال میں بھوجپال کے علاوہ 10 مواضعات کے نام بھوج نگر، بھوج پور، بھوج پور جاگیر، بھوج پورہ اور بھوجا کھیڑی ہیں۔ اس کے علاوہ بھوج پور کی کھائی بھوج پور کی پٹھار اور بھوج پور کا مندر بھی مشہور ہے۔

تحصیل گوہر گنج میں پربت ندی کے کنارے ایک چھوٹا سا گاؤں بھوج پور جاگیر کے نام سے موجود ہے۔ 1941ء میں اس کی آبادی 94 نفوس پر مشتمل تھی۔ سر جان مالکم کا خیال ہے کہ یہاں راجہ بھوج سے پہلے 600 سال قبل ایک بڑا شہر آباد تھا، یہاں ایک نامکمل مندر کے آثار بھی موجود ہیں۔ آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شیوا کا مندر تھا ویسے بھی ہندوؤں کا یہ دیوتا دکن میں زیادہ مقبول ہے۔ مندر کے پاس کافی تراشیدہ پتھر پڑے ہیں اسی مندر کے قریب جینیوں کا ایک مندر ہے جس میں کئی بتوں کے علاوہ ایک 20 فٹ اونچا مہاوید کا بت بھی موجود ہے۔

بھوپال شہر سے 26 میل دور واقع قدیم قلعہ رائے سن اس خطے کی قدامت کا واضح عکاس ہے۔ اس قلعے کی تعمیر بدھ مت کے پیروکاروں نے یہاں کے گونڈ راجاؤں کے ذریعے کرائی تھی۔ یہ قلعہ قدیم دور کے فن تعمیر کا نمونہ ہے۔ جس میں ہر راجہ نے اپنے دور میں اس کی تعمیر و توسیع میں اضافہ کیا اور ضرورت کے مطابق ترمیم بھی کی۔ حکومت کے انتظامی امور و فوجی نقطہ نظر سے یہ قلعہ جنوبی ہندوستان کا دروازہ رہا ہے۔ اس قلعے کی فوجی اہمیت کی وجہ سے ہر بادشاہ نے اسے اپنے اقتدار میں رکھنے کی حتی المقدور کوشش کی اور اسے فتح کرنے میں اپنی شان سمجھی۔

623ھ میں دہلی کے شاہ سلطان التمش نے 692ھ میں سلطان علاء الدین خلجی نے 740ھ میں محمد تغلق شا نے 917ھ میں صاحب خان فاتح نے اس قلعے کو فتح کیا۔ 931ھ میں ہمایوں نے سخت جنگ کے بعد اسے فتح کر کے بھیلسہ کے حاکم قوام خان کے سپرد کیا۔ 938ھ میں بہادر شاہ گجراتی نے 692ھ میں اکبر اعظم نے فتح کیا

اور اسے صدر مقام بنایا۔ گیارہویں صدی میں اورنگ زیب عالم گیر نے فتح کیا۔ تزک عالمگیری میں اس کا پتہ نہیں چلتا ایک عرصے تک یہ قلعہ عالم گیر کے تابع رہا اس قلعے کے آخری قلعہ دار محمد زمان خاں تھے یہ قلعہ دار دہلی کے شہنشاہ کی طرف سے مقرر تھا جو بھوپال کے علاقے کی بھی نگرانی کرتا تھا۔

خیال کیا جاتا ہے کہ رائے سن شہر جہاں یہ قلعہ واقع ہے ایک ہزار سال قبل مسیح میں راجہ رائے سن نے آباد کیا تھا۔ یہ صنعت و حرفت کا مرکز تھا قدیم زمانے میں اس کی آبادی ایک لاکھ سے زیادہ بتائی جاتی ہے۔ یہ تاریخی مقام صدیوں تک مستقل آباد رہا اس میں جاٹوں، راجپوتوں اور بعد میں مسلمانوں نے ایک کے بعد ایک اپنی آزاد حکومتیں قائم کیں۔ راجپوتوں میں راجہ سلہادی جو راجہ چتوڑ گڑھ کا داماد تھا یہاں کا مشہور راجہ ہوا۔ ودیشہ اجین گوالیار کا علاقہ اس کے زیر اثر رہا ہے۔ 938ھ میں بہادر شاہ گجراتی نے راجہ سلہادی سے رائے سن ودیشہ و آشٹہ فتح کر کے اپنے تسلط میں لے لیا تھا۔ اس مقام میں متعدد مساجد و مزارات ہیں جو آج بھی ماضی کے عہد زریں کی یاد دلاتے ہیں۔ اندرون قلعہ 890ھ میں نواب خانم الملک نے مدرسہ و مسجد تعمیر کرائی جس میں 400 طلبہ تعلیم حاصل کرتے تھے۔

تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ جب رام چندر جی اور سیتا چودہ برس کی بنواس سے واپس آئے تو انہوں نے رائے سن میں ایک مقام پر قیام کیا تھا۔ جسے ان کی مناسبت سے ستیا تلائی کا نام دیا گیا ہے۔ مشہور محقق ولز کے مطابق فیروز شاہ تغلق اور تیمور لنگ کے حملوں کے بعد اس خطے میں گونڈوں کے اقتدار کا زمانہ آیا اور انہوں نے اس خطے کے خان دیس کے حکمران اور خلجی سلاطین مالوہ کے زیر اثر رہنے کے باوجود اپنے رجواڑے قائم رکھے اور ان سے لڑائیاں بھی لڑتے رہے۔ شہنشاہ اکبر کے دور میں رائے سن اور تال کے گونڈوں کی حکومتیں باج گزار کے طور پر قائم رہیں۔ اورنگ زیب کی

وفات کے بعد اس علاقے میں گونڈوں کی دو نیم مختار حکومتیں قائم تھیں جو چکلے کہلاتی تھیں ایک چکلہ گنور گڑھ تھا جس میں گنور مروان پور پرگنہ شاہ گنج، چھیپا نیر چکلدی، بلقیس گنج، شمس گڑھ بھوپال اور اندور کے علاقے شامل تھے۔ دوسرا چکلہ چین پور باڑی تھا جس میں چین پور باڑی، چوکی گڑھ، دیوری، بریلی اودے پور اور چند پورہ کے پرگنے شامل تھے۔ ان میں سے اکثر مقامات پر قلعے اور گڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ دونوں چکلوں میں آئے دن لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں۔ اس وقت گنور میں گونڈ راجا نظام شاہ کی حکومت تھی جس کی سات رانیوں میں چوہدری کر یا رام کی بیٹی کملا پتی بھی شامل تھی جو نہ صرف حسن و جمال میں یکتا تھی بلکہ زمانے کے نشیب و فراز سے بھی واقفیت رکھتی تھی۔ چین پور باڑی میں نظام شاہ کا بھتیجا حاکم تھا وہ گنور کے علاقوں میں اکثر لوٹ مار مچایا کرتا تھا خود کملا پتی پر بھی اس کے دانت تھے چنانچہ اس نے سازش سے نظام شاہ کو زہر دے کر مروا دیا مگر کملا پتی آسانی سے اس کے قبضے میں آنے والی شے نہ تھی۔

بھوپال کے خطے کی اسلامی حکومتیں

مالوہ ہندوستان کا وہ اہم ترین علاقہ ہے جس کو ہمیشہ ہندوستان کی تاریخ میں نمایاں حیثیت حاصل رہی ہے۔ ایک وقت تھا جب مالوہ کا علاقہ بھوجپور تک دراز تھا۔ راجہ بھوج کے بعد اس خطے میں کئی اسلامی حکومتیں بھی قائم ہوئی تھیں۔ تصنیف ''ہندوستان کی اسلامی حکومتیں'' میں مصنف شوکت علی فہمی لکھتے ہیں۔ تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں کے باقاعدہ مالوہ فتح کرنے سے قبل بھی مالوہ کے تخت پر مسلمان بادشاہ بیٹھتے رہے۔ چنانچہ چوہان کے آخری راجہ دہرم دیو کے بعد شیخ شاہ نامی کوئی مسلمان بادشاہ 70 سال تک مالوہ کے تخت پر فرماں روائی کرتا رہا لیکن اس کے بعد پھر یہاں کی حکومت ہندو راجہ دہرم راج نے سنبھال لی جس نے 20 سال حکومت کی۔ درہم راج کے بعد شیخ شاہ کا بیٹا علاؤالدین پیر مالوہ کا تخت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا اور بیس سال تک حکومت کرتا رہا۔ اس کے بعد کمال الدین نے 12 سال حکومت کی۔ لیکن کمال الدین کے بعد مالوہ کی حکومت جیت مل چوہان کے قبضہ میں چلی گئی جس نے بیس برس فرماں روائی کی لیکن اس کے بعد پھر ایک مسلمان جلال الدین مالوہ کا حکمراں ہوگیا۔ جلال الدین کے بعد عالم شاہ مالوہ کے تخت پر بیٹھا۔ جو 24 سال حکومت کرتا رہا۔ لیکن عالم شاہ کے بعد پھر ہندو حکمراں مالوہ کی حکومت پر قابض ہو گئے اور اس وقت تک قابض رہے جب تک کہ دہلی کے پٹھان بادشاہوں نے ان سے حکومت چھین کر مالوہ کو دہلی کا ایک صوبہ نہیں بنالیا۔

دہلی کے پٹھان بادشاہوں کے مالوہ فتح کرنے سے قبل وہاں مسلمانوں کا

حکومت کرنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ محمد بن قاسم کے زمانہ ہی سے چند غیر معروف حملہ آور پٹھان ہندوستان پر حملہ کرتے رہے ہیں اور انھوں نے ہندوستان کے بعض حصوں میں غیر معروف حکومتیں بھی قائم کرلی تھیں غالباً ان ہر حملہ آوروں میں وہ بادشاہ بھی تھے جنھوں نے کہ مالوہ کے تخت پر فرماں روائی کی۔

مالوہ پر مسلمانوں کا پہلا حملہ

قدیم زمانہ میں مالوہ کا ایک حصہ چونکہ صوبہ سندھ میں شامل تھا اس لیے اگر دیکھا جائے تو سب سے پہلے محمد بن قاسم نے ہی مالوہ کو فتح کیا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ پورا مالوہ محمد بن قاسم کے زمانے میں فتح نہ ہوسکا تھا۔ محمد بن قاسم کے علاوہ مالوہ کے دوسرے حملہ آور وہ پٹھان تھے جن کا ذکر اوپر آچکا ہے لیکن یہ پتہ نہیں کہ انھوں نے کس زمانہ میں حملہ کیا اور کیونکر مالوہ کے تخت پر قابض ہوئے۔ تاریخی اعتبار سے مالوہ پر سب سے پہلا حملہ 632ھ مطابق 1234ء میں سلطان التمش نے کیا تھا۔ سلطان التمش نے پہلے بھیلسہ کا شہر اور قلعہ فتح کیا، اس کے بعد اجین پر حملہ کرکے اسے تسخیر کیا۔ اجین میں بکر ماجیت کے زمانہ کا ''متھا کا دیو'' نامی جو بت خانہ تھا اسے التمش نے اس لیے مسمار کردیا تھا کیونکہ یہ فتنہ پردازوں کا سب سے بڑا سیاسی مرکز بنا ہوا تھا جو التمش کی حکومت پر برابر چھاپے مارتے رہتے تھے۔ سلطان التمش اور اس کے جانشین یعنی غلام خاندان کے بادشاہ ان فتوحات کے باوجود مالوہ کو حکومت دہلی کا باجگذار صوبہ بنانے میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکے۔

خاندان غلامان کے خاتمہ کے بعد 961ھ مطابق 1291ء میں جلال الدین خلجی نے خود فوج لے کر مالوہ پر چڑھائی کی اجین فتح کیا مالوہ کو تاخت و تاراج کرڈالا۔ غرض کہ خلجیوں کے دورِ حکومت میں مالوہ کا وہ صوبہ جو غلاموں کے خاندان کے زمانہ میں

برائے نام دہلی کا ماتحت صوبہ تھا مستقل طور پر دہلی کی حکومت میں شامل ہو گیا۔ لیکن اس کے بعد بھی مالوہ کے صوبہ میں برابر بغاوتیں برپا ہوتی رہیں۔ چنانچہ 739ھ مطابق 1339ء میں محمد تغلق کے بھانجے بہاء الدین گرشاسب نے راجپوت راجاؤں کے ساتھ متحد ہو کر مالوہ میں ایک بہت بڑی بغاوت کھڑی کر دی تھی جس کو فوراً دبا دیا گیا۔ اسی طرح اور بھی کئی مرتبہ مالوہ کے صوبہ میں راجپوتوں نے سر اُٹھایا مگر ان کو ہر مرتبہ کچل دیا گیا، غرض کہ مالوہ کا صوبہ 796ھ مطابق 1394ء تک دہلی کے بادشاہوں کے قبضہ میں رہا۔ لیکن ناصرالدین محمد شاہ تغلق کے مرنے کے بعد دلاور خاں حاکم مالوہ نے اپنی خودمختاری کا اعلان کر کے مالوہ میں ایک علیحدہ مسلم حکومت قائم کر لی۔

مالوہ کا پہلا بادشاہ دلاور خاں

دلاور خاں غوری، سلطان شہاب الدین غوری کی اولاد میں سے تھا۔ سلطان ناصرالدین محمد شاہ تغلق نے 789ھ مطابق 1387ء میں اسے مالوہ کا حاکم مقرر کیا تھا۔ جب تک ناصرالدین محمد شاہ تغلق زندہ رہا، دلاور خاں اپنے آپ کو دہلی کی حکومت کا اطاعت شعار ظاہر کرتا رہا۔ لیکن ناصرالدین محمد شاہ تغلق کی موت اور تیمور کے حملے کے بعد جب دہلی کی حکومت لب دم تھی تو دلاور خاں غوری نے دہلی کی حکومت سے قطع تعلق کر کے 803ھ مطابق 1401ء میں اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ اس نے اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا اور سکہ چلایا اور مانڈو میں شاندار عمارتیں تعمیر کروائیں۔ 808ھ مطابق 1406ء میں دلاور خاں کے بیٹے الپ خاں نے اسے زہر دیدیا جس سے وہ مر گیا۔

سلطنت مالوہ کے خودمختار بادشاہ

الپ خاں باپ کو زہر دینے کے بعد 808 مطابق 1406ء میں سلطان ہوشنگ کے لقب کے ساتھ مالوہ کے تخت پر بیٹھا اس نے اجین کے بجائے مانڈو کو اپنا

دارالسلطنت قرار دیا۔ گجرات کا بادشاہ مظفر گجراتی جو دلاور خاں کا رشتہ دار اور دوست تھا، جب اسے یہ معلوم ہوا کہ سلطان ہوشنگ نے دلاور خاں کو زہر دے دیا تو وہ ایک بڑی فوج لے کر مالوہ پر حملہ آور ہوا اور سلطان ہوشنگ کو اس نے قید کرلیا۔ مگر سلطان ہوشنگ نے خوشامد کر کے اس قید سے رہائی حاصل کرلی اور اس کے بعد ساری عمر شاہان گجرات سے لڑتا رہا۔ سلطان ہوشنگ نے گوالیار اور دکن کو بھی فتح کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا لیکن کالپی کو اس نے فتح کرلیا تھا۔ سلطان ہوشنگ 30 سال حکومت کرنے کے بعد 9 ذی الحجہ 838ھ مطابق 1434ء کو رحلت کرگیا اس کا مقبرہ جو مانڈو میں ہے۔ عجائبات عالم میں شمار ہوتا ہے۔ اس مقبرہ کی خصوصیت یہ ہے کہ بغیر پانی کے انتظام کے اس کی قبر پر پانی ٹپکتا رہتا ہے، آج تک یہ پتہ نہیں چل سکا کہ پانی کہاں سے آتا ہے اور خودبخود کیونکر پیدا ہوجاتا ہے۔

سلطان ہوشنگ کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا غزنین خان 18 ذی الحجہ 838ھ مطابق 1434ء کو محمد شاہ کا لقب اختیار کرنے کے بعد مالوہ کے تخت پر بیٹھا لیکن اس نے تخت پر بیٹھتے ہی بھائیوں اور عزیزوں کا قتل عام شروع کردیا۔ جس سے امراء اس کے دشمن ہو گئے اور اس دشمنی کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطان محمد شاہ کے سالے محمود خلجی نے بادشاہ کو زہر دے کر ہلاک کردیا، اس بادشاہ نے ایک سال اور چند ماہ حکومت کی۔

سلطان محمود خلجی اپنے بہنوئی سلطان محمد شاہ کو ہلاک کرنے کے بعد 839ء مطابق 1435ء میں مالوہ کے تخت پر بیٹھا۔ چند ہی روز کے بعد اس پر قاتلانہ حملہ ہوا مگر خوش قسمتی سے محمود خلجی بچ گیا، پھر جابجا ملک میں بغاوتیں برپا ہوگئیں۔ اس دوران سلطان احمد شاہ گجراتی نے مالوہ پر حملہ کر کے مانڈو کے قلعہ کو گھیر لیا۔ لیکن اسے واپس جانا پڑا، سلطان محمود خلجی نے 844ھ مطابق 1440ء میں دہلی پر بھی حملہ کیا تھا لیکن صلح کے بعد محمود واپس چلا گیا۔ 845ھ مطابق 1441ء میں چتوڑ کے راجپوتوں نے بغاوت کی

تو اس نے چتوڑ پر حملہ کر کے شہر کو لوٹا اور بت خانوں کو توڑا اور نصیر خاں حاکم کالپی کی تادیب کی جو ملحد ہونے کے بعد لڑکیوں کو گواتا اور نچواتا تھا۔ 855ھ مطابق 1451ء میں سلطان محمود نے گجرات پر حملہ کیا مگر اس معرکہ میں بُری طرح شکست ہوئی۔ اس کے بعد سلطان محمود خلجی نے مارواڑ، ولایت مند، سور، مندل گڑھ، چتوڑ اور دکن میں متعدد لڑائیاں لڑیں۔ یہ اپنے زمانہ کا ایک نہایت ہی انصاف پسند اور بہادر بادشاہ ہوا ہے جو مالوہ پر 34 سال حکومت کرنے کے بعد 19 ذی قعدہ 873ھ مطابق 1469ء میں اس دنیا سے رخصت ہوا۔ اس بادشاہ کے زمانہ میں مالوہ میں خوشحالی عام تھی۔

محمود خلجی کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا سلطان غیاث الدین مالوہ کے تخت پر بیٹھا۔ سلطان غیاث الدین کے عہد حکومت کا سب سے دلچسپ کارنامہ یہ ہے کہ اس نے عورتوں کی ایک فوج بنائی تھی۔ یہ عورتوں کا بے حد دلدادہ تھا مگر بدچلن نہ تھا۔ 906ھ مطابق 1500ء میں اس کے بیٹے ناصرالدین نے اسے زہر دے دیا جس سے وہ ہلاک ہوگیا۔

سلطان ناصرالدین باپ کو زہر سے ہلاک کرنے کے بعد 906ھ مطابق 1500ء میں مالوہ کے تخت پر بیٹھا، اس نے اپنے بھائیوں اور بھتیجوں کا بڑی بے دردی کے ساتھ قتل عام کیا، اس کے تخت پر بیٹھتے ہی بغاوتیں شروع ہوگئیں جن کو اس نے دبا دیا۔ یہ بادشاہ 11 سال حکومت کرنے کے بعد 917ھ مطابق 1511ء میں دنیا سے رُخصت ہوگیا۔

سلطان ناصرالدین کے بعد اس کا چھوٹا بیٹا سلطان محمود تخت پر بیٹھا اور اس کو بھی تخت پر بیٹھتے ہی باغیوں کو کچلنا پڑا، لیکن سلطان محمود کی بدقسمتی کہ اس نے مانڈو میں سلطان بہادر شاہ گجراتی کے مخالفین کو پناہ دے دی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطان بہادر شاہ گجراتی نے ایک بڑی جمعیت کے ساتھ مانڈو پر حملہ کر کے سلطان محمود کو گرفتار کرلیا اور

اسے قلعہ چنپا نیز میں قید کرنے کے لیے روانہ کردیا۔ مگر سلطان محمود راستہ میں مارا گیا۔ اور اس طرح مالوہ کے بادشاہوں کے خاندان کا وہ سلسلہ ختم ہوگیا جس کی بنیاد بہادر خاں نے رکھی تھی۔ غرض کہ مالوہ کی خودمختار اسلامی سلطنت 942ھ مطابق 1534ء میں شاہان گجرات کے قبضہ میں چلی گئی۔

مالوہ کے بادشاہوں کی یہ خودمختار سلطنت تقریباً ڈیڑھ سو برس قائم رہی۔ یہ سلطنت اپنے زمانہ کی ایک نہایت ہی مضبوط حکومت شمار کی جاتی تھی۔ اس حکومت کے فرماں رواؤں نے جو بے نظیر شاندار عمارتیں، اجین، مانڈو اور مالوہ کے دوسرے شہروں میں بنوائیں ہیں وہ آج بھی اس حکومت کی عظمت کا پتہ دے رہی ہیں۔ اگر مسلمان بادشاہوں کی خانہ جنگی نے حکومت مالوہ کو تباہ اور برباد نہ کردیا ہوتا تو شاید یہ حکومت بھی زمانہ دراز تک باقی رہتی۔ لیکن افسوس کہ خود مسلمانوں نے اپنی اس حکومت کو دفن کردیا۔

اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد مالوہ اور اِرد گرد کے حالات

شہنشاہ ہند اورنگ زیب عالم گیرؒ کی وفات کے بعد پورے ملک میں افراتفری اور طوائف الملو کی پھیل گئی ہر طرف بدنظمی تھی اور خود مختاری کا چلن عام تھا۔ اس وقت جو بھی جس خطے میں مغلوں کا گورنر یا نمائندہ تھا وہ وہیں کا مالک بن بیٹھا چھوٹے چھوٹے رئیس اور زمیندار جنہیں ذرا بھی قوت و اقتدار حاصل تھا اپنے اپنے علاقوں کے مالک بن گئے۔ حصول زمین کے لئے ہر طرف جنگ و جدل کا بازار گرم تھا۔ مالوہ و ارد گرد کا علاقہ بشمول گونڈ وانہ ان شورشوں اور بغاوتوں کا خاص مرکز بن گیا۔ اس علاقے میں زیادہ تر گونڈ آباد تھے اور انہیں بادشاہ کی جانب سے بڑی بڑی جاگیریں ملی ہوئی تھیں۔ یہ جاگیردار راجہ کہلاتے تھے ان میں سے بعض کے قبضے میں قدیم زمانے کے بنے ہوئے قلعے بھی تھے۔ شہنشاہ دہلی کی گرفت کا طاقتور ہاتھ جب ان پر سے اٹھ گیا تو ہر راجہ مطلق العنان بن گیا۔ نظام شاہ نامی راجہ گنور کے قلعے کا مالک تھا یہ قلعہ اپنی بلندی، دشوار گزار راستوں اور استحکام کے لحاظ سے تمام قلعوں پر فوقیت رکھتا تھا۔ اس کے علاوہ نظام شاہ کا علاقہ بھی بہ نسبت دوسرے جاگیرداروں کے زیادہ وسیع اور زرخیز تھا اس لئے اس کی طاقت علاقے کے تمام راجاؤں پر غالب تھی۔ قلعہ گنور قدیم زمانے سے بہت مشہور و معروف اور بے شمار انقلابات کا مرکز رہ چکا ہے۔ اس قلعے کے ارد گرد دور دور تک اس قدر گھنا اور ہولناک جنگل ہے کہ اس میں سے انسان کا گزرنا بھی سخت دشوار ہے۔ ان

میں موذی جانوروں اور درندوں کی کثیر تعداد موجود ہے۔قلعہ پہاڑ کی ڈھلان پرعمودی شکل میں موجود ہے۔اس کے صدر دروازے تک پہنچنے کے لئے صرف ایک تنگ راستہ ہے جس کے دونوں طرف گہرے غار ہیں اس طرح یہ قلعہ ناقابل تسخیر بن گیا تھا جس بادشاہ نے اس خطے کو فتح کرنا چاہا اس نے سب سے پہلے اس قلعے کو فتح کرنے کی کوشش کی لیکن کوئی کوئی ہی کامیاب ہوسکا۔

اس مستحکم اور محفوظ قلعے میں بیٹھ کر نظام شاہ اپنے وسیع علاقے پر حکومت کرتا تھا۔اس کی قوت وزور کی وجہ سے قرب وجوار کے راجہ اس سے ڈرتے اور اسے رشک کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ اورنگ زیب بادشاہ کی وفات کے بعد یہاں کے راجاؤں نے اپنے توسیع پسندانہ عزائم کو پورا کرنے کے لئے باہم ایک دوسرے کے خلاف لڑنا شروع کر دیا تھا کئی راجاؤں نے مل کر نظام شاہ کی قوت کو توڑنے کے لئے اس کے خلاف جنگ شروع کی مگر وہ ہر بار ناکام و نامراد رہے۔جب دشمن ان ظاہری کوششوں میں کامیاب نہ ہو سکے تو انہوں نے نظام شاہ کے خلاف ایک خطرناک خفیہ سازش تیار کی۔انہوں نے نہ صرف نظام شاہ سے اپنے تعلقات کو دوستانہ بنایا بلکہ اس کے خلاف گزشتہ مہم جوئی کی معافی بھی مانگی۔اس طرح ان کا نظام شاہ کے ہاں آنا جانا شروع ہوگیا کچھ عرصے بعد چین پور باڑی کے حاکم جو نظام شاہ کا رشتہ دار بھی تھا نے اپنے ہاں ایک بڑی تقریب کا اہتمام کیا اس میں نظام شاہ کو بطور خاص مدعو کیا پھر سازش کے تحت اس کے کھانے میں زہر ملا دیا گیا۔زہر اتنا شدید تھا کہ وہ یہ کھانا کھاتے ہی ہلاک ہوگیا۔جب اس کی بیوی کملا پتی نے اپنے شوہر کی اچانک موت کی خبر سنی وہ اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھی لیکن جب شوہر کا غم ذرا ہلکا ہوا اور اس نے اپنی سرحدوں کے اطراف تباہی و بربادی کی گھٹائیں اڈتی ہوئی دیکھیں وہ خود بیوہ اور بچہ کمسن تھا عزیز رشتہ دار دشمن اور ایسے دشمن کہ شوہر کے قاتل بھی تھے اسے وہ وقت قریب

ہی نہیں بلکہ آنکھ کے سامنے نظر آ رہا تھا جب اس کے عزیز اسے اور اس کے معصوم بیٹے کو موت کے گھاٹ اتار کر اس کے علاقے پر قابض ہو جائیں گے۔ حسن اتفاق سے اسی زمانے میں اورکزئی خاندان کا ایک سپوت دوست محمد خاں قرب و جوار میں داد شجاعت دے رہا تھا سردار موصوف نے قزاقوں اور سرکشوں کو تہ تیغ کر کے اس علاقے کو قتل و غارت گری سے بالکل پاک صاف کر دیا تھا۔ رانی کملا پتی سردار دوست محمد خاں کی بہادری کا حال سن چکی تھی وہ نہ صرف ان سے بہت متاثر تھی بلکہ وقت آ گیا تھا کہ وہ انہیں اپنی مدد کے لئے آواز دے۔ چنانچہ اس نے اپنے ایک بااعتماد کارندے کے ذریعے سردار موصوف کو اپنا دردمندانہ احوال پہنچایا اور ان سے درخواست کی کہ وہ اس کی مدد کریں اور سب سے پہلے اس کے شوہر کا انتقام لیں۔ پھر اس کے علاقے کو دشمنوں کی دست برد سے محفوظ بنا دیں۔ اس کام کے معاوضے میں اس نے ایک لاکھ روپیہ پیش کرنے کا وعدہ کیا۔ دوست محمد خاں جو انتہائی بہادر انسان تھے دشمنوں کے لئے ضرور سخت تھے مگر لاچار اور مجبوروں کے لئے دل میں بے حد درد رکھتے تھے اور ایسے لوگوں کی مدد کے لئے ہمیشہ آمادہ رہتے تھے۔ انہیں رانی کملا پتی کی بے بسی پر رحم آ گیا اور اس کی مدد کے لئے تیار ہو گئے۔

انہوں نے رانی کملا پتی کے سب سے بڑے دشمن اور ان کے شوہر کے قاتل چین پور باڑی کے حکمراں کی فوجی تیاری کا جائزہ لے کر اپنی فوج کے ساتھ اس پر حملہ کر دیا دونوں طرف سے سخت رن پڑا مگر دوست محمد خاں کو فتح حاصل ہوئی اور کملا پتی کے شوہر کے قاتل اور اس کے حمایتیوں کو کیفر کردار تک پہنچا دیا گیا۔

سردار دوست محمد خاں کے اس کارنامے پر رانی کملا پتی بہت خوش ہوئی اور وہ سردار صاحب کی بے حد مشکور بھی تھی مگر چوں کہ وعدے کے مطابق اس کے پاس سردار صاحب کو دینے کے لئے ایک لاکھ روپے کی رقم نہ تھی اس لئے اس نے بھوپال جس کی

حیثیت اس وقت ایک گاؤں سے زیادہ نہ تھی سردار صاحب کو پیش کر دیا اور جاگیری انتظام کے لئے انہیں اپنا مختار بنالیا۔ سردار صاحب نے رانی کملا پتی کے علاقے کو تمام سرکشوں اور باغیوں سے پاک کر دیا۔ ساتھ ہی ایسا معقول انتظام کر دیا کہ پھر کبھی کسی باغی کو سر اٹھانے کی جرأت نہ ہوسکی۔ جب ریاست میں امن و امان قائم ہوگیا تو پھر ریاست کی آمدنی میں بھی اضافہ ہوگیا اس کے بعد رانی کملا پتی جب تک زندہ رہی سردار صاحب کی رہین منت رہی۔ سردار صاحب نے بھی بھائی چارگی کا حق ادا کر دیا گو کہ رانی ملا پتی بہت خوبصورت تھی اور کئی راجہ اس پر بری نیت رکھتے تھے۔ اس کا اپنا دیور بھی اس سے شادی کا خواہاں تھا مگر سردار صاحب ایک باکردار انسان تھے انہوں نے کبھی رانی کملا پتی کو میلی آنکھ سے نہیں دیکھا بلکہ نہ صرف اس کے سارے دشمنوں کا صفایا کر دیا بلکہ اسے امن وسکون کی زندگی گزارنے کا موقع فراہم کر دیا۔

رانی کملا پتی بھی احسان شناس خاتون تھی وہ اگرچہ خوبصورتی میں لاکھوں میں ایک تھی مگر باکردار اور اپنے شوہر کی وفادار تھی۔ وہ راست باز کے ساتھ ساتھ دوراندیش اور ذہین خاتون تھی اس نے اپنے شوہر کے قتل کے بعد اپنی حکومت کو بخیر وخوبی چلایا البتہ اپنے دشمنوں کو ٹھکانے لگانے کے لئے سردار دوست محمد خاں کی خدمات حاصل کرتی رہی اور ان کی بے انتہا قدر کرتی رہی۔ رانی کملا پتی کی دانائی اس کی نہ صرف ریاست بلکہ آس پاس کی ریاستوں میں مشہور ہوگئی تھی اور اس کا نام ضرب المثل کے طور پر لیا جاتا تھا۔ سردار صاحب کو بھوپال بخشنے کے بعد وہ کبھی کبھی بھوپال کے اپنے محل میں آتی تھی۔ یہ محل اب بھی بڑے تالاب کے بند کی دوسری جانب واقع ہے البتہ اس نے دوست محمد خاں کی بھوپال پر حکمرانی کو کبھی چیلنج نہیں کیا بلکہ وہ بھوپال کی ہمیشہ ہمدرد اور خیر خواہ رہی۔

باب 2

سردار دوست محمد خاں کا اقتدار

دوست محمد خاں 1676ء مطابق 1087ھ میں موضع تیراہ صوبہ سرحد میں پیدا ہوئے۔ آپ کا تعلق تیراہ کے اورک زئی قبیلے سے تھا۔ اس قبیلے کا تعلق ایک ایرانی شہزادے اورک زئی سے جوڑا جاتا ہے۔ اس شہزادے کو ایران سے جلا وطن کر دیا گیا تھا اسے کوہاٹ کے بادشاہ نے پناہ دی تھی۔ اورک زئی قبیلے کے لوگ نہایت بہادر، جفاکش اور صوم وصلوٰۃ کے پابند ہیں۔ کچھ محققین نے دوست محمد خاں کو تیرہ کا باشندہ تو قرار دیا ہے مگر تیراہ کو افغانستان کا علاقہ ظاہر کیا ہے جو سراسر غلط ہے۔ تیراہ، اورکزئی ایجنسی (فاٹا) پاکستان میں واقع ہے اور قبائلی علاقے میں شامل ہے۔ تیراہ کے علاقے میں اب بھی کئی ہزار اورکزئی قبائل کے لوگ آباد ہیں یہ علاقہ تقریباً سات سو مربع میل میں پھیلا ہوا ہے۔

دوست محمد خاں بچپن سے ہی ذہین، خوددار اور باہمت واقع ہوئے تھے۔ آپ ایک محبت کرنے والا دل بھی رکھتے تھے جب جوانی کے دائرے میں داخل ہوئے رشتے کی ایک لڑکی کو دل سے چاہنے لگے مگر لڑکی کے باپ نے اس کی منگنی ایک دوسرے نوجوان سے کر دی ٹھیک منگنی والے دن جب یہ تقریب ہو رہی تھی دوست محمد خاں جذبات سے مغلوب ہو گئے اور جس لڑکے کے ساتھ منگنی ہو رہی تھی اس سے جھڑپ ہوگئی اور معاملہ اتنا سنگین ہوگیا کہ آپ کے ہاتھ سے اس کا قتل ہوگیا۔ آپ اس قتل پر بہت افسردہ خاطر ہو کر تیرہ کا علاقہ چھوڑ کر دارالخلافہ دہلی کے لئے روانہ ہوگئے۔ آپ 1696ء میں دہلی پہنچے اور وہاں اپنے ایک شناسا جلال خان کے ہاں ملازمت اختیار کر لی۔ اس خطے پر جلال خان کی عملداری تھی۔ چنانچہ لوہارو کو جلال آباد بھی کہا جاتا

ہے یہ بستی تھانہ بھون کے مشہور قصبے سے 5,4 کلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔ دوست محمد خاں جب جلال خان کے ہاں تھے جلال خان کے بیٹے سے گھر کی ایک ملازمہ کے معاملہ پر جھگڑا ہو گیا، جھگڑے نے اتنا طول پکڑا کہ آپ کے ہاتھ سے اس کا قتل ہو گیا۔ جلال خان ایک بااثر شخص تھا اس کے بیٹے کا قتل ایک سنگین واقعہ تھا۔ گو کہ دوست محمد خاں وہاں سے فوری نکل گئے جلال خان کے لوگوں نے ان کا بہت پیچھا کیا مگر وہ ان کے ہاتھ نہ آئے۔ اس قتل کے بارے میں محمد احمد سبزواری لکھتے ہیں کہ جلال خان کے بیٹے کا قتل اور فرار کچھ قرین قیاس معلوم نہیں ہوتا کیوں کہ اس وقت ان کے والد نور محمد جلال خاں کے ہاں موجود تھے اور اس واقعے کے بعد وہ کافی عرصے تک وہاں مقیم رہے۔ پھر جلال خاندان سے ریاست بھوپال کے حکمرانوں کے روابط بہت عرصے تک قائم رہے۔ بھوپال میں اب بھی بہت سے جلال آبادی خاندان آباد ہیں جن کے وہاں کے رئیسوں سے رشتے قائم تھے۔ نواب سلطان جہاں بیگم کے عہد تک جلال آباد کے اکثر لوگوں کو بھوپال سے وظائف ملتے تھے۔ ان کے مطابق اگر یہ قتل درست ہوتا تو یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ پٹھانوں اور خصوصاً قبائلیوں کے مزاج اور سرشت میں یہ ہے کہ ان کے ہاں خون کا بدلہ خون ہے۔ آج تین سو سال گزرنے کے بعد بھی ان کے ہاں خون کا بدلہ خون ہی ہے۔ اس قتل کے بعد دوست محمد خاں کے والد نور محمد جلال آباد میں محفوظ رہ سکتے تھے اور نہ ہی دوست محمد خاں۔ جلال خان کے آدمی انہیں کہیں نہ کہیں تلاش کر کے بدلہ چکا لیتے۔

بہر حال تاریخ کے مطابق اس قتل کے بعد دوست محمد خاں دہلی پہنچے اور ان کی ملاقات شہنشاہ اورنگ زیب کے ایک سپہ سالار میر فضل اللہ لشکری سے ہوئی۔ لشکری نے آپ کو شاہی فوج میں جگہ دے کر تردی بیگ کے خلاف جنگ میں لگا دیا۔ آپ نے اپنی بہادری کا شاندار مظاہرہ کیا۔ اس کے بعد تردی بیگ کے ایک جنرل کا سر کاٹ کر

لانے کے مشن پر آپ کو مامور کر دیا آپ نے یہ کام کمال ہوشیاری اور بہادری سے انجام دیا اور مطلوبہ جنرل کا سر کاٹ کر میر فضل اللہ لشکری کے روبرو پیش کر دیا جس پر وہ اتنا خوش ہوا کہ اس نے دوست محمد خاں کو شہنشاہ اورنگ زیب کے روبرو پیش کر دیا۔ اورنگ زیب ان کے کارنامے اور بہادری پر بہت خوش ہوئے اور انہیں نہ صرف انعام و اکرام سے نوازا بلکہ وسطی ہند کے علاقے خصوصاً مالوہ کے علاقے میں مغل سلطنت کے استحکام کے لئے روانہ کر دیا۔

اس وقت مالوہ اور اس کے گرد و نواح میں حالات بہت دگرگوں تھے۔ آپ ایسے حالات میں بھی مغل سلطنت کے لئے کام کرتے رہے لیکن 1710ء میں جب اورنگ زیب عالم گیر کا انتقال ہوگیا، مالوہ اور اس کے نواح میں حالات بد سے بدتر ہوگئے۔ پورا علاقہ جنگ و جدل کا میدان بن گیا۔ مختلف خودمختار ریاستیں وجود میں آ گئیں۔ مراٹھوں کا اثر و نفوذ اتنا بڑھ چکا تھا کہ وہ کئی ریاستوں پر قابض ہوگئے۔ ایسے حالات میں دوست محمد خاں نے مغل سلطنت کی ملازمت چھوڑ کر مالوہ کو اپنی قسمت آزمائی کے لئے منتخب کر لیا۔ وہاں انہوں نے کئی راجاؤں کے ہاں ملازمتیں کیں۔ مشکل میں پھنس کر بھی ریاستوں کو ان کے دشمنوں سے بچانے کے لئے اپنی خدمات پیش کیں پھر پرگنہ بیرسیہ کو مستاجری پر حاصل کر کے اپنے قدم جمانے کے مواقع پیدا کر لئے۔ اس زمانے میں انہوں نے اپنے عزیز و اقارب کو بھی مالوہ آنے کی دعوت دی جس پر نہ صرف ان کے خاندان کے لوگ بلکہ دوسرے لوگ بھی مالوہ آ گئے۔ ان کے والد نور محمد خاں بھی ان کی دعوت پر مالوہ تشریف لے آئے۔ اپنے عزیز و اقارب اور دوسرے ہم وطنوں کے مالوہ آنے کے بعد دوست محمد خاں کے حوصلے پہلے سے بھی زیادہ بلند ہوگئے۔ انہوں نے اپنی فوجی طاقت بڑھا کر جگدیش پور نامی ایک چھوٹی ریاست کو فتح کر لیا اور اس کا نام اسلام نگر رکھا اور اسی کو اپنا مستقل مستقر بنا کر ایک نئی ریاست کی

بنیاد ڈالی پھر وہاں استحکام حاصل کرنے کے بعد اردگرد کے علاقوں کو فتح کرنا شروع کیا۔ اس مہم جوئی کے نتیجے میں کافی مال غنیمت حاصل ہوا جسے مغل دربار میں اپنی طرف سے نذرانے کے طور پر پیش کرنے کے لئے بھیج دیا۔ اس کے صلے میں آپ کو دربار دہلی سے ''سردار دلیر جنگ'' کا خطاب عطا ہوا۔ اسی زمانے میں آپ سے ایک بڑی غلطی سرزد ہوگئی۔ آپ نے سادات بارہہ کے ایما پر دکن کے نظام الملک کے خلاف دلاور علی خان کی مدد کی جس کا آپ کو خمیازہ بھگتنا پڑا۔ نظام الملک نے ان کے خلاف اعلانِ جنگ کر کے اسلام نگر پر حملہ کر دیا۔ چوں کہ آپ خود کو نظام الملک سے جنگ کرنے کے قابل نہیں سمجھتے تھے چنانچہ صلح کا راستہ اختیار کیا مگر اس سلسلے میں اپنے بڑے بیٹے یار محمد کو بطور یرغمال نظام الملک کے حوالے کرنا پڑا۔ آپ کا یہ بیٹا آپ کی وفات تک نظام الملک کی تحویل میں رہا۔

اسی دوران رانی کملا پتی نے جو دوست محمد خاں سے بہت متاثر تھی اور کیونکہ دوست محمد خاں نے نہ صرف اس کے شوہر کے قاتلوں کو انجام تک پہنچایا تھا بلکہ اس کی حکومت کو استحکام بخشنے میں اہم کردار ادا کیا تھا، اُس نے پرگنہ، بھوپال کو ان کے حوالے کر دیا۔ اس وقت بھوپال ایک گاؤں تھا مگر آپ نے اس گاؤں کو ایک شہر میں تبدیل کر دیا تھا، یہاں پر ہی آپ نے ایک پرفضا مقام کی ٹیکری پر ایک نئے قلعے کی بنیاد رکھی جو ان کی بیوی کے نام کی مناسبت سے فتح گڑھ کہلایا۔ محمد احمد سبزواری رسالہ سہ ماہی فکرو آگہی دہلی میں اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ بھوپال کا علاقہ شاید 1722-23ء میں کسی وقت سردار دوست محمد خاں کو ملا۔ اس وقت اس مقام کی صورت حال کا اندازہ کچھ یوں ہوتا ہے کہ یہاں ایک بڑا تالاب تھا جس میں فتح گڑھ اور اطراف کے پہاڑی علاقوں کا پانی جمع ہوتا تھا۔ دوسری جانب ریت گھاٹ سے آگے ایک بند تھا جس پر قدیم زمانے کا ایک قلعہ بنا ہوا تھا جو پرانا قلعہ کہلاتا تھا اس میں ایک محل تھا یہ بھی

پرانے زمانے کا تھا۔ یہ علاقہ پہلے گنور کے راجہ کے قبضے میں تھا اور اس کی رانی کملا پتی نے اسے دوست محمد خاں کو دے دیا تھا۔ چنانچہ وہ کبھی کبھار اس محل میں ہوا خوری کے لئے آتی تھی اور اسی مناسبت سے یہ رانی کملا پتی کا محل کہلاتا تھا۔ جس کا راستہ چھوٹے تالاب کی طرف تھا جس کا اس وقت وجود نہ تھا، البتہ بڑا تالاب موجود تھا۔ اس وقت بھوپال کی آبادی ہزار ڈیڑھ ہزار سے زیادہ نہ تھی عام طور پر لوگ پرانے قلعے کے اندر ہی رہتے تھے کچھ غریب محنت کش پرانے قلعے کے جنوبی حصوں میں آباد تھے۔

جہاں تک دوست محمد خاں کی بیویوں کا تعلق ہے تاریخی کتابوں میں ان کی تعداد درج نہیں ہے شاید انہوں نے ایک ہی شادی کی جو منگل گڑھ کے راجہ کی چھوٹی بیٹی تھیں اور مسلمان ہو کر فتح بی بی کے نام سے سرفراز ہوئیں۔ اس شادی سے سردار صاحب کو مالی فائدہ ہوا جس کی بدولت انہوں نے تیس ہزار روپے سالانہ کے عوض بیرسیہ کی مستاجری حاصل کی اور پھر گجرات کا رخ کیا جہاں ان کو اپنے ہی آدمیوں نے نظر بند کر لیا۔ جب فتح بی بی کو اطلاع ملی تو انہوں نے مطلوبہ رقم بھیج کر اپنے شوہر کو قید سے رہائی دلائی۔

جب سردار صاحب کے مالوہ میں قدم جم گئے اور بھوپال بھی انہیں مل گیا تو یہ اپنی بیوی کے ساتھ اسلام نگر سے اکثر راتوں کو بھوپال شکار کے لئے جایا کرتے تھے۔ چنانچہ ایسی ہی مالوہ کی ایک حسین رات میں فتح بی بی نے فرمائش کی کہ ایسی خوبصورت جگہ کو کیوں نہ آباد کیا جائے۔ سردار صاحب اپنی چہیتی اور وفا شعار بیوی کی اس فرمائش کو ٹال نہ سکے اور ایک جمعہ کے مبارک دن قریبی قصبہ رائسن کے قاضی محمد معظم کے ہاتھوں بنیاد کا پہلا پتھر رکھوایا اور دوسرا پتھر ان کی بیوی نے رکھا۔ سردار صاحب اس قلعے کی تعمیر سے اتنے خوش تھے کہ انہوں نے اس کی تعمیر میں خود بھی ہاتھ بٹایا اور مزدوروں کے شانہ بشانہ کام کیا۔ خیال اغلب ہے کہ تعمیر کا کام قلعہ کی پچھلی فصیل سے شروع ہوا جہاں ایک

برج میں ایک چھوٹی سی مسجد تعمیر کی گئی جو آج بھی موجود ہے۔ اس میں ایک منبر ہے اس کو ڈھائی سیڑھی مسجد کہا جاتا ہے۔ یہ بھوپال کی سب سے قدیم مسجد ہے۔ قلعہ کے دو حصے تھے اندرونی حصہ کو بالائی قلعہ کہا جاتا تھا یہاں کچھ رہائشی عمارتیں، اسلحہ خانہ اور ایک بڑی مسجد بھی تعمیر ہوئی تھی جس کے سامنے اب سردار صاحب اور ان کی اہلیہ کی قبریں ہیں۔ قلعہ کے سب سے اونچے حصے پر ایک بہت بڑا دمدمہ بنایا گیا بعد میں مدتوں اس دمدمے سے روزانہ نصف النہار، رمضان میں سحر و افطار، عیدین اور شاہی خاندان کی سال گرہوں پر توپیں داغی جاتی تھیں بعد میں قلعہ میں ایک دھوپ گھڑی بھی نصب کی گئی تھی اور ایک نادر قرآن شریف جس کا طول پانچ فٹ اور عرض ڈھائی فٹ تھا کہیں سے حاصل کر کے رکھا گیا تھا۔ یہ قلمی نسخہ تھا جس کا فارسی میں ترجمہ تھا۔ قلعہ کے چاروں طرف طویل فصیل تیار کروائی گئی تھی جو پرانے قلعہ سے جا کر مل جاتی تھی اس میں چھ دروازے تھے۔ یہ دروازے رات گئے بند کر دیئے جاتے تھے۔

اس وقت بھوپال چونکہ ایک گاؤں سے زیادہ نہ تھا چنانچہ دوست محمد خاں نے اس کی ترقی کی جانب بھی توجہ مبذول کی۔ یہاں امن و امان کی صورت حال چونکہ اطمینان بخش تھی چنانچہ لوگ یہاں آ کر آباد ہونا شروع ہو گئے۔ پانی کی کمی نہ تھی بڑا تال اس وقت موجود تھا البتہ چھوٹا تال نہ تھا اس کے علاوہ قرب و جوار میں بہنے والی ندی کی وجہ سے زراعت کے لئے بھرپور پانی دستیاب تھا۔ کسانوں نے درختوں کو کاٹ کر نئی نئی زمینوں کو کاشت کاری کے لئے استعمال کرنا شروع کیا۔ تعمیراتی کاموں کے جاری رہنے اور فوجی ضروریات کے تحت آبادی میں اضافہ ہوتا گیا۔ چند سال بعد صورت حال یہ ہو گئی کہ رہائش کے لئے شہر پناہ میں جگہ ملنا مشکل ہو گئی۔ چنانچہ لوگوں کو جہاں موقع ملا وہیں آباد ہو گئے۔ قرب و جوار میں برّو کے جنگلات کاٹ کر لوگ آباد ہونا شروع ہو گئے۔ آبادی میں اس اضافے کی وجہ دوست محمد خاں کے قبیلے کے لوگوں کے بڑی

تعداد میں بھوپال میں آباد ہونا تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ جب قلعہ اور فصیل تعمیر ہوگئے تو جانی و مالی تحفظ کے امکانات پیدا ہوگئے۔ اس اطمینان بخش صورت حال کے بعد دوست محمد خاں نے اپنے ہم وطنوں کو یہاں بلانا شروع کیا۔ جو لوگ وہاں آئے ان میں فیروز خیل، یوسف زئی اور جلال آبادی خاندان کے لوگ شامل تھے۔ شہر اور مضافات میں جو محلے آباد ہوئے وہ یا تو شہر پناہ کے دروازوں کے نام سے یا آباد لوگوں کے پیشوں کے لحاظ سے موسوم ہوئے۔ جیسے کنجر پورہ، بھوئی پورہ، کھٹیک پورہ، جوگی پورہ، گھوسی پورہ، چٹائی پورہ، بھنگی پورہ، سلاوٹ پورہ، کولھی پورہ، کمہار پورہ اور مالی پورہ وغیرہ۔ امراء یا عہدوں کے اعتبار سے صرف تین محلوں کے نام ملتے ہیں۔ عاقل پورہ یہ سردار دوست محمد خاں کے ایک بھائی عاقل کے نام پر آباد ہوا۔ عاقل خاں سردار صاحب کے چھوٹے بھائی اور ان کے دیوان بھی تھے۔ ایک اور محلے کا نام ابراہیم پورہ تھا جو سردار صاحب کی بیوی فتح بی بی کا لے پالک بیٹا تھا یہ بچہ ہندو تھا مگر اس کی پرورش فتح بی بی نے کی تھی چنانچہ وہ بڑا ہو کر ایک جوشیلا مسلمان بنا وہ سردار صاحب کا اتنا وفادار تھا کہ جب انہیں گجرات میں محصور کر دیا گیا تو فتح بی بی نے اسی کے ذریعے رقم بھیج کر سردار صاحب کو یرغمالی سے چھڑایا تھا۔ ابراہیم کی قبر ابراہیم پورہ کی مسجد میں واقع ہے۔ یہ مسجد کبھی علم و فضل کے طور پر بہت عظیم مرتبہ کی حامل تھی یہاں سمرقند اور بخارا تک سے طلبہ دینی علم حاصل کرنے آتے تھے۔ یہ بھی ایک قابل ذکر واقعہ ہے کہ آج سے ساٹھ سال پہلے جب اس مسجد کی پہلی تعمیر شروع ہوئی تو ابراہیم کی قبر کو بھی غالباً ہٹایا گیا تھا وجد الحسینی سابق قاضی ریاست کے بیان کے مطابق ان کی میت صحیح و سالم تھی۔

اس وقت چوں کہ بھوپال شہر میں زیادہ آبادی نہیں تھی چنانچہ بعض قبرستان شہر پناہ کے اندر بھی موجود تھے۔ جب شہر میں امراء و رؤسا کی حویلیاں بننا شروع ہوئیں تو ان کی تعمیر میں ایک ہندو دیوان بجے رام کا محل سرفہرست تھا، لیکن نواب شاہ جہاں بیگم کی

تحریر کے مطابق شہر میں سب سے پہلا محل یٰسین محمد خان کا تعمیر ہوا۔ یہ بہت وسیع ہے اور اس میں پیچھے کی طرف پائیگاہ تھی شہر بھوپال میں اس وقت اس سے بڑا کوئی محل نہیں تھا۔

مصنف محمد عبدالرحمٰن اپنی تصنیف ''تاج الاقبال تاریخ ریاست بھوپال'' مطبوعہ 1789ء میں سردار دوست محمد خاں کی جنگی مہمات کی تفصیلات بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جب سردار صاحب مالوہ کے علاقے میں لٹیروں کے ہاتھوں وہاں کے امراء کو بچانے کے لئے اپنی خدمات پیش کررہے تھے، موضع پاراسون کے ٹھاکر علاقے میں لوٹ مار میں مصروف تھے اس سے پرگنہ بیرسیہ بھی محفوظ نہ تھا۔ آپ نے بیرسیہ کا اجارہ تیس ہزار روپے سالانہ پر حاصل کرلیا اور اپنی برادری کے لوگوں کو اپنے آبائی وطن سے بلا کر بیرسیہ کی حفاظت کے انتظامات کرنے کے ساتھ ہی آپ نے پاراسون کے راجپوت رئیس جس سے پورا علاقہ خوف زدہ تھا کو ٹھکانے لگانے کے لئے اپنے ایک شخص کو فقیر کے بھیس میں بھیج دیا۔ جاسوس نے خبر دی کہ اگلا دن ہولی کا ہے راجپوت رئیس رات بھر ناچ رنگ میں مگن رہے گا، وہ وقت اسے ٹھکانے لگانے کے لئے مناسب رہے گا۔ دوست محمد خاں اپنے سپاہیوں کو لے کر وہاں پہنچ گئے اور جب آدھی رات کو محفل شباب پر تھی لوگ مدہوش نشے میں چور تھے۔ سردار صاحب کے لوگ ان پر ٹوٹ پڑے اور انہیں ایک ایک کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس کے بعد پاراسون کے راجپوت رئیس کے ہمدرد دوست محمد خاں کے مقابلے پر آئے۔ آپ کی سپاہ نے انہیں بھی ٹھکانے لگا دیا۔ پھر آپ جگ دیش پور گئے جہاں اصل راجپوت ڈاکو موجود تھے مگر جس وقت دوست محمد خاں وہاں پہنچے وہ لوگ کہیں ڈاکہ ڈالنے نکل گئے تھے۔ وہاں پر اس وقت جو سردار گھروں میں موجود تھے۔ سردار صاحب نے اپنے ایلچی کو بھیج کر ان سے ملاقات کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ انہوں نے اپنی طرف سے دعوت کے ساتھ انہیں ٹھہرنے کے لئے خیمے دیئے۔ سردار صاحب چوں کہ علاقے کو جرائم پیشہ لوگوں سے

صاف کرنا چاہتے تھے چنانچہ انہوں نے ان کی دعوت قبول کر لی مگر اپنے مقصد کو پس پشت نہ ڈالا۔ انہوں نے اپنی سپاہ کو انہیں ٹھکانے لگانے کے لئے اپنی حکمت عملی سے آگاہ کر دیا۔ جب خیمے میں سردار صاحب سے ملاقات کے لئے وہ لوگ آئے سردار صاحب پلاننگ کے تحت ان کے لئے مروجہ روایت کے تحت خاطر داری کیلئے عطر و پان لینے خیمے سے باہر چلے گئے ایسے میں ان کے لوگوں نے فوراً خیمے کی رسیاں کاٹ دیں خیمہ زمین بوس ہوگیا۔ اس آپا دھاپی میں انہوں نے راجپوت لٹیرے سرداروں اور ان کے تیس ساتھیوں کے سر کاٹ ڈالے اور انہیں قریبی ندی میں پھینک دیا۔ اس کے ساتھ پورا جگ دیش پورہ سردار صاحب کے قبضے میں آ گیا۔ اس کا نام اسلام نگر رکھا گیا۔ یہاں سردار صاحب نے ایک شاندار قلعہ تعمیر کروایا اور اس میں سکونت اختیار کر لی۔ پھر قرب وجوار کے علاقے پر بھی قبضہ کرلیا گیا۔

حاکم بھیلسہ محمد فاروق کو آپ کی فتوحات سے بہت فکر لاحق ہوئی چنانچہ اس نے اپنی فوج کو لڑنے کے لئے بھیج دیا۔ اس کی فوج کی کمان اس کے بھائی شیر محمد خان کے سپرد تھی۔ سردار صاحب کے ایک سپاہی راجہ خان میواتی نے اس پر حملہ کر دیا اس نے شیر محمد خان کے سینے میں ایسا بھالا مارا جو اس کے سینے کی ہڈیاں توڑتا ہوا دوسری طرف نکل گیا مگر شیر محمد نے گرتے گرتے راجہ خان میواتی پر تلوار کا ایسا وار کیا کہ اس کے جسم کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ اس طرح دونوں ہی ہلاک ہوگئے۔ ایسے میں سردار صاحب کی فوج میں بھگدڑ مچ گئی جس پر بھیلسہ کی فوج ان کا تعاقب کرنے لگی۔ ایسے میں سردار صاحب نے موقع غنیمت جان کر محمد فاروق کا سر کاٹ لیا اور اپنے منہ پر ڈھاٹا باندھ کر منہ چھپا لیا۔ محمد فاروق کی لاش کو اپنی گود میں اس طرح لے لیا جیسے وہ اپنی فوج کی کمان کر رہا ہو۔ پھر ہاتھی کو بھیلسہ کے قلعہ کی جانب گامزن کر دیا۔ گرفتار نوبت بجانے والوں کو حکم دیا کہ نوبت بجاتے رہیں۔ نوبت کی آواز سن کر قلعے کے لوگ ہاتھی پر مردہ محمد

فاروق کو دوست محمد خاں کی گود میں بیٹھا دیکھ کر اسے زندہ سمجھے۔قلعہ دار نے قلعے کے دروازے کھول دیئے۔ قلعے کے اندر کے لوگ سمجھے کی فتح ہماری ہوئی ہے مگر قلعے میں داخل ہوکر سردار صاحب نے فوراً فاروق کی لاش کو عوام کے سامنے پھینک دیا۔لوگ سمجھ گئے کہ محمد فاروق کو شکست ہی نہیں ہوئی بلکہ اسے مار دیا گیا ہے چنانچہ بھیلسہ بھی دوست محمد خاں کے قبضے میں آ گیا۔اس کے بعد وہیں کے ایک حکمران دیا بہادر نے اپ کی بڑھتی ہوئی طاقت سے ٹکر لینے کی ٹھانی مگر اسے بھی منہ کی کھانی پڑی اس کے بعد اوجین کا علاقہ بمعہ مال غنیمت سردار صاحب کے حصے میں آ گیا۔

سادات بارہہ کے ایماء پر انہوں نے نظام الملک کے خلاف دلاور علی خان کی مدد کی جو گھاٹے کا سودا ثابت ہوا اس کے خمیازے میں اپنے بڑے بیٹے یار محمد کو بطور یرغمال نظام حیدر آباد کے حوالے کرنا پڑا۔لڑائی 1132ھ میں برہان پور کے قریب لڑی گئی اس میں دوست محمد خاں کی جانب سے پانچ سو گھڑ سوار اور 250 شتر سوار تھے مگر فوج کے سپہ سالار کے مارے جانے کی وجہ سے یہ جنگ نظام الملک نے جیت لی تھی۔ اس کے بعد 1727 میں دوست محمد خاں کی وفات ہوگئی۔ جب آپ کے انتقال کی خبر نظام الملک تک پہنچی اس نے آپ کے بیٹے یار محمد خان کو خلعت شاہی کے ساتھ رہا کر دیا اور اسے انتہائی شاندار طریقے سے اسلام نگر روانہ کیا تا کہ وہ وہاں اقتدار سنبھال سکے۔ دوست محمد خاں کی وفات کے بعد چونکہ اسلام نگر میں یار محمد نہ تھے چنانچہ ان سے چھوٹے بیٹے سلطان محمد خاں کو مسند نشین کر دیا گیا تھا۔ اسلام نگر واپس آ کر یار محمد خاں نے انہیں جاگیر دے کر مسند ریاست سے علیحدہ کر دیا۔

جناب محمد احمد سبزواری نے دوست محمد خاں کی شمالی اور وسطی ہند آمد کے بارے میں مختلف مصنفین کی جانب سے لکھی گئی تاریخوں کا ایک تفصیلی تجزیہ پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر اشفاق نے اپنی کتاب کے صفحہ 12 پر دوست محمد خاں کی شمالی ہند آمد کا سال

1109ھ لکھا ہے اور ان کی عمر 21 سال بتائی ہے چونکہ ایم عرفان نے یہی تاریخیں ان کے والد نور محمد خاں کی آمد کی بتائی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ دونوں باپ بیٹے ایک ساتھ یا مختصر وقفے سے شمالی ہند پہنچے مگر تاریخوں میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ کسی نے لکھا 1695ء میں دہلی پہنچے اور جلال خان کے ہاں نوکری کی (ڈاکٹر اشفاق کا فٹ نوٹ کتاب کے صفحہ 13 پر ہے) بھوپال گزیٹیر میں ہے کہ وہ بہادر شاہ کی حکومت کے پہلے سال دہلی پہنچے اگر یہ درست ہے تو پھر ان کی اورنگ زیب کے روبرو پیشی اور دربار میں قدم بوسی کی داستان کی صداقت مشکوک ہو جاتی ہے۔ اگر 1695ء والی تاریخ کو صحیح مان لیا جائے تو ان کا میر فضل اللہ لشکر شاہی کے سپہ سالار سے ملنا سیّد برادرز کی خدمت پر مامور ہونا اور پھر تردی بیگ کے خلاف لشکر کشی میں اس کے ایک جنرل کا سر کاٹ کر لانے کی بات کچھ عجیب ہو جاتی ہے۔ دوسری جانب دکن میں ان کو شہنشاہ اورنگ زیب کے سامنے پیش کیا جانا جہاں وہ بادشاہ کے تحسینی کلمات کے بعد رخصت ہونے پر دو مرتبہ زمین بوس ہوئے۔ حالانکہ یہ بادشاہ زمین بوسی یا سر ٹیکی کی رسم بہت عرصہ پہلے ختم کر چکا تھا۔

بہرحال مختلف روایات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ دوست محمد خاں اوّلاً لوہاری جلال آباد آئے (اس خطے میں لوہاری نام کے دو قصبے ہیں چوں کہ اولالذکر ایک اورک زئی پٹھان سردار جلال خان کی قبضے میں تھا لہٰذا اس کو جلال آباد کہا جانے لگا۔ یہ بستی تھانہ بھون کے مشہور قصبے سے 4 یا 5 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ پہلے یہاں سے شاہدرہ سہارن پور لائٹ ریلوے گزرتی تھی اور تھانہ بھون کا اسٹیشن بھی تھا اب یہ بڑی لائن پر ہے۔ دوست محمد خاں یا ان کے والد کا یہاں آنا تو درست ہے مگر جلال خان کے بیٹے کو قتل کر کے وہاں سے فرار ہونا کچھ قرین قیاس معلوم نہیں ہوتا۔ کیوں کہ ان کے والد اس وقت وہاں تھے اور وہ کافی طویل عرصے کے بعد اپنے بیٹے کے پاس بیرسیہ

آئے۔ جلال خان کے بیٹے کے قتل کے بعد نور محمد خاں جلال آباد میں کیسے محفوظ رہ سکتے تھے بالخصوص ایسی صورت میں جب کہ کافی عرصے تک دوست محمد خاں کی حیثیت کچھ زیادہ بلند نہ تھی اور ایک مرتبہ تو خود ان کے آدمیوں نے ہی ان کو نظر بند کر دیا تھا۔

محمد احمد سبزواری سردار دوست محمد خاں کی وفات کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ ان کی عمر 65 یا 66 کے درمیان بنتی ہے۔ جب کہ 1726ء کے حساب سے وہ صرف 50 سال رہ جاتی ہے۔ 1740ء کے لحاظ سے وہ اتنی ہی بنتی ہے اور تاریخی اعداد کے لحاظ سے تاریخ کا ہجری سال 1153ھ نکلتا ہے۔ اب جب کہ مورخین کے لحاظ سے سردار صاحب کا سالِ وفات 1726 ہے تو ان کے جانشین کو اس کے بعد ہی ریاست کا انتظام سنبھال لینا چاہیے تھا چنانچہ انہوں نے یار محمد کا زمانہ 42-1726ء لکھا ہے حالانکہ یہ اپنے والد کے انتقال کے وقت حیدر آباد دکن میں تھے اور بھوپال میں ان کے خوردسال بھائی سلطان محمد خاں کو مسند نشین کر دیا گیا تھا۔ بہرحال یہ 1154ھ یا 1742ء میں تخت نشین ہوئے۔ ''امیر اکبر ریاست'' تاریخ جلوس ہے۔ تقریباً 16 سال حکومت کی اور 1167ھ مطابق 1753ء میں وفات پائی۔ جوان باغ جہاں'' تاریخ وفات ہے لہٰذا ان کا دور 42-1726ء کے بجائے 55-1742ء تک کا بنتا ہے۔ یہ اسلام نگر میں قلعہ سے باہر کچھ فاصلے پر مدفون ہیں۔

سردار دوست محمد خاں کی اولاد اور بھائی

محمد احمد سبزواری کے مطابق دوست محمد خاں نے صرف ایک شادی کی۔ ان کی بیوی ریاست منگل گڑھ کے حکمران کی بیٹی تھی۔ یہ شادی دوست محمد خاں کے لیے بہت منفعت بخش ثابت ہوئی تھی۔ وہ اپنی وفادار بیوی کو بہت چاہتے تھے اور اس کی فرمائش پر فتح گڑھ کا قلعہ تعمیر کرایا تھا۔ یہ قلعہ نہایت خوب صورت اور مضبوط تھا۔ اس کا سنگ بنیاد

بروز جمعہ 9 ذوالحج 1140ھ مطابق 1727ء میں رائیسن کے قاضی محمد معظم نے رکھا تھا۔ جب کہ بنیاد کا دوسرا پتھر فتح بی بی نے اپنے ہاتھ سے رکھا تھا۔ آپ کے 6 فرزند تھے جن کے نام۔ یار محمد خاں، سلطان محمد خاں، صدر محمد خاں، فاضل محمد خاں، واصل محمد خاں اور بہادر خاں تھے۔ اس کے علاوہ آپ کی پانچ بیٹیاں بھی تھیں۔ دوست محمد خاں کے پانچ بھائی تھے جن کے نام شیر محمد خاں، الف محمد خاں، شاہ محمد خاں، میر احمد خاں اور عاقل محمد خاں تھے۔ یہ چاروں بھائی مختلف جنگوں میں مارے گئے تھے۔ شیر محمد خاں محمد خان کی لڑائی میں مارے گئے۔ الف محمد خاں باپور امرہٹہ کی لڑائی میں مارے گئے، شاہ محمد خاں دیوا بھاؤ افر راجہ دھار کی جنگ میں مارے گئے۔ میر احمد خاں دلاور علی خان سے جنگ میں مارے گئے صرف عاقل محمد خاں بچے تھے جو دیوان بھوپال کے منصب پر فائز تھے۔

محمد عبدالرحمٰن اپنی تصنیف میں رقم طراز ہیں کہ دوست محمد خاں نے اپنی زندگی میں کئی جنگیں لڑیں اکثر میں کامیاب رہے مگر ان میں انہیں تیس سے زیادہ زخم آئے تھے۔

نواب یار محمد خاں

دوست محمد خاں کی وفات کے بعد ان کے دوسرے بیٹے سلطان محمد خاں کو مسند نشین کر دیا گیا تھا کیوں کہ ان کا بڑا بیٹا یار محمد خاں نظام دکن کی یرغمالی میں تھا۔ دوست محمد خاں کی وفات کی خبر سن کر نظام نے یار محمد خاں کو اسلام نگر بھیج دیا تاکہ وہ اپنے باپ کی مسند کو سنبھال سکے۔ دراصل نظام دوست محمد خاں سے ناراض چلے آ رہے تھے اب وہ ان کے بعد ان کے بیٹے کے ذریعے اسلام نگر کی ریاست پر اپنا کنٹرول رکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ یار محمد خاں کو بہت تحفے تحائف کے ساتھ شاندار طریقے سے روانہ کیا گیا۔ یار محمد خاں نے اسلام نگر پہنچ کر اپنے چھوٹے بھائی سلطان محمد خاں کو جاگیر دے کر مسند ریاست سے علیحدہ کر دیا اور خود مسند نشین ہو گئے۔ اس سے پہلے ان کے چچا عاقل محمد خاں ریاست کے دیوان چلے آ رہے تھے ان کے انتقال کے بعد بجی رام نامی ایک پرانے خدمت گار ریاست کو ریاست کا دیوان مقرر کر دیا گیا۔ اس کے بعد وہ مملکت کی سرحدوں کو توسیع دینے کی بابت متوجہ ہوئے۔ ریاست کے اردگرد واقع کئی پرگنات کو حاصل کرنے کے بعد کوٹہ بوندی کے راجہ سے جنگ کی جس میں کامیاب ہوئے اس پر راجہ کوٹہ بوندی نے بہت سے نذرانے پیش کئے۔ پھر رامپورہ برکھا بھان اور کرودڑ میں جنگیں ہوئیں جن میں بہت سے مرد و زن اسیر ہوئے ان ہی میں ایک حسین و جمیل لڑکی اسیر ہوئی جو کسی برہمن یا راجپوت کی بیٹی تھی۔ وہ آپ کی منظور نظر ٹھہری۔ آپ کو وہ اس قدر پسند آئی کہ اسے مشرف بہ اسلام کر کے عقد کر لیا۔ یہ خاتون بہت ذہین با تدبیر اور شوہر کی فرمانبردار تھیں۔ یہی خاتون ماجی ممولا کے نام سے مشہور

ہوئیں۔ ان کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ انہوں نے یار محمد خاں کی ایک اور بیوی کے بطن سے پیدا ہونے والے بیٹے فیض محمد خاں کی پرورش کی تھی۔ جب یار محمد کا 1167ھ میں انتقال ہوا تو فیض محمد خاں کی عمر کل 11 سال تھی۔ چنانچہ انہوں نے ان کی کم سنی کی وجہ سے ریاست کا انتظام خود سنبھال لیا مگر انہیں ریاست کو چلانا بہت دشوار کر دیا گیا۔ سازشوں کی وجہ سے ریاست کا نصف حصہ مرہٹوں کو دینا پڑا گو بعد میں اس کا کچھ حصہ اپنی دور اندیشی اور تدبر کی بناء پر واپس لے لیا تھا۔ آپ اگرچہ ایک نو مسلم تھیں مگر انتہائی دیندار اور زہد و تقویٰ والی تھیں۔ ان کی انہی خوبیوں کی وجہ سے کسی بزرگ نے انہیں ''قدسیہ'' کا خطاب مرحمت فرمایا تھا۔ بعد میں اس خطاب کی توثیق مغلیہ دربار سے بھی ہوئی تھی۔ وہ صوم وصلوٰۃ کی پابند ایک راسخ العقیدہ مسلمان خاتون تھیں اور ہر قسم کے تعصب سے پاک تھیں اسی لئے ہندو اور مسلمانوں میں یکساں مقبول تھیں۔ دونوں اقوام کے لوگ انہیں ماں جی کے نام سے پکارتے تھے۔ ماں جی نے پہلی مسجد ریت گھاٹ میں بنوائی تھی یہی شہر کی پہلی جامع مسجد تھی مسجد کافی کشادہ اور خوبصورت ہے یہ مسجد آج بھی ہے۔ اس میں ایک مکان اور چند کمرے موجود ہیں اس کے احاطے میں کچھ پرانی قبریں بھی موجود ہیں۔ اس مسجد کی تعمیر سے چوں کہ نمازیوں کا مسئلہ حل نہیں ہوا تھا چنانچہ آپ نے ایک بڑی مسجد سیڑھی گھاٹ پر تعمیر کروائی اس میں مردوں کے علاوہ خواتین کے لئے بھی نماز کی جگہ تھی۔ آپ نے سیڑھی گھاٹ سے ذرا نیچے تالاب کے کنارے تیسری مسجد تعمیر کرائی جو لال املی والی مسجد کہلاتی ہے۔ یہاں دراصل دو املی کے درخت ہیں جن کی املی کا رنگ لال ہے۔ انہوں نے شہر میں پانی کی قلت کو دور کرنے کے لئے کئی گہری باؤلیاں بھی کھدوائی تھیں۔ یہ باؤلیاں آج بھی موجود ہیں۔

ماں جی ممولا نے فیض محمد خاں کی پرورش تو کی ہی تھی ساتھ ہی ایک نو مسلم برہمن زادے کی بھی پرورش کی تھی۔ یہ چھوٹے خان کے نام سے موسوم ہوئے ماں جی

نے انہیں دیوان ریاست بنایا تھا۔ چھوٹے خان نے ریاست میں کئی اصلاحات کی تھیں۔شہر پناہ کے ارد گرد خندقیں بھی کھدوائی تھیں۔آپ نے پاترا ندی پر پُل بھی بنوایا تھا جو پختہ پُل کہلاتا ہے۔اسی طرح بان گنگا ندی پر بھی ایک پشتہ تعمیر کرایا تھا جس سے چھوٹا تال وجود میں آیا۔آپ نے شہر میں کئی پرانی سڑکوں کی مرمت کرائی اور کئی نئی سڑکیں بھی تعمیر کرائی تھیں۔شہر میں روزی کے مواقع پیدا ہونے کی وجہ سے قرب و جوار کے شہروں کے لوگ یہاں جوق در جوق آباد ہونے لگے۔تھوڑے ہی دنوں میں شہر پناہ کے اندر جگہ نہ رہی۔چنانچہ لوگ شہر پناہ کے باہر مکان بنا کر رہنے لگے۔چھوٹے خان نے شہر سے چوریوں اور ڈکیتیوں کا خاتمہ کر دیا تھا۔کچھ وقت کے لئے یہاں پنڈاروں نے لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا تھا۔چھوٹے خان نے ان کی سرکوبی کے لئے فوج بھیجی جو چار سو پنڈاروں کو قید کر کے بھوپال لے آئی تھی۔کچھ دن انہیں قید میں رکھا گیا اس کے بعد ہر پنڈارے کو ایک پگڑی اور کچھ نقدی دے کر آزاد کر دیا تھا۔اس حسن سلوک کے بعد پنڈاروں نے پھر کبھی ادھر کا رخ نہیں کیا اور کچھ ایسے بھی تھے جو بھوپال میں ہی مستقل آباد ہو گئے تھے۔

اسی دور میں مرہٹوں نے بھوپال کے ارد گرد کے علاقوں میں زبردست طاقت حاصل کر لی تھی اتفاق سے ریاست بھوپال چاروں طرف سے مرہٹہ ریاستوں سے گھری ہوئی تھی شمال مغرب میں سندھیا کی گوالیار اسٹیٹ جنوب میں بھونسلہ اور ہلکر اسٹیٹس واقع تھیں۔ایک طرف ریاست ٹونک اور دوسری طرف مالوہ کی ریاست تھی جس پر پیشوا قابض تھا۔اسے اپنے آپ پر بہت فخر و غرور تھا پہلے والیٔ ٹونک اور اس کے بعد غنیم کی فوجوں نے 1814ء میں ریاست بھوپال پر حملہ کر دیا۔چھ ماہ سے زیادہ عرصہ تک شہر کا محاصرہ رہا بلکہ بعض وقت تو دشمن فصیلوں پر چڑھنے میں کامیاب ہو گیا مگر شہریوں بالخصوص خواتین نے بڑی بہادری دکھائی اور دشمن پر کھپروں، کنکر، پتھر اور

بارودی ہانڈیوں کی بوچھاڑ کر کے اُسے پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ اس وقت بیرونی شہر کی کچھ آبادی قلعے کے اندر آ گئی یا ادھر ادھر بھاگ گئی۔ شہر میں غلہ اور دوسری خوردنی اشیاء نایاب ہوگئیں تو لوگ جانوروں کی کھالوں، درختوں کی چھال پتے اِملی کے بیج ابال کر کھانے لگے تھے۔ ایسے وقت میں ایک ہندو تاجر دلیپ سنگھ ٹھاکرے نے بڑے تالاب کی طرف سے سامان کو شہر میں پہنچانے کا سلسلہ جاری رکھا جس سے شہر میں غذائی قلت پر بڑی حد تک قابو پا لیا گیا تھا۔ دشمن کے محاصرہ ختم کرنے کے بعد انعام کے طور پر اسے سرکاری طور پر بارہ ہزار روپے دیئے گئے تھے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ یار محمد خاں کا 1167ھ میں انتقال ہوگیا تھا۔ یار محمد خاں کی پوری زندگی اسلام نگر میں گزری تھی چنانچہ وہ وہیں مدفون ہوئے۔ ان کی اولاد میں چار بیٹیاں اور پانچ بیٹے تھے۔ لڑکوں کے نام فیض محمد خاں، حیات محمد خاں، سیّد محمد خاں، حسین محمد خاں اور یٰسین محمد خاں تھے۔ ان کی وفات کے بعد بڑے بیٹے فیض محمد خاں کو مسند پر بٹھایا گیا تھا مگر چوں کہ ابتداء میں وہ کم سن تھے اس لئے ان کی حکومت کی باگ ڈور ماں جی ممولا کے ہاتھ میں تھی۔ ساتھ ہی دیوان چھوٹے خان ریاست کے انتظامی معاملات چلاتے رہے مگر بالغ ہونے پر انہوں نے ریاست کے معاملات اپنے ہاتھ میں لے لئے تھے۔

نواب فیض محمد خاں

یار محمد خاں کے انتقال کے بعد فیض محمد خاں کو اسلام نگر کے تخت پر بٹھا دیا گیا مگر ادھر بھوپال میں ارکان ریاست ٹیکا رام اور ابراہیم خان وغیرہ نے یار محمد خاں کے چھوٹے بھائی سلطان محمد خاں کو رئیس بھوپال کا منصب دے دیا تھا جس پر بجی رام پانچ ہزار فوج کا لشکر لے کر سلطان محمد خاں کے حامیوں اور لشکر سے لڑنے کے لئے اسلام نگر سے بھوپال آئے۔ دونوں اطراف سے توپیں اور بندوقیں چلنے لگیں چین پورہ باڑی کا عامل اس لڑائی کی خبر سن کر بھوپال آیا اور سلطان محمد خاں کو پیغام بھیجا کہ مجھے آپ قلعے کے اندر بلا لیں میں بجی رام کے قصے کو دم بھر میں ختم کر دوں گا۔ سلطان محمد خاں اس کی بات کو سچ سمجھے اور اس کی سپاہ کے لئے قلعے کے دروازے کھلوا دیئے۔ اس نے قلعے کے اندر آتے ہی شہر پناہ کے برجوں پر اپنی فوج مامور کر دی اور شہر پناہ کے تمام دروازوں پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد سلطان محمد خاں اور اس کی سپاہ کو قلعے سے باہر نکلنے کا حکم دیا۔ ساتھ ہی فیض محمد خاں سے اپنی وفاداری کا اعلان کیا۔ سلطان محمد کہاں خاموش بیٹھنے والا تھا وہ سامانِ حرب کے حصول میں مصروف ہو گیا اور تھوڑے ہی دنوں کے بعد ایک لشکر جرار کے ساتھ مقابلے پر آ گیا۔ بیرون شہر شمال کی جانب زبردست رن پڑا۔ فیض محمد خاں بھی قلعے سے باہر اپنی فوجوں کا حوصلہ بڑھانے لگے۔ دونوں جانب کے سپاہی خوب دل کھول کر لڑے۔ جب سلطان محمد کی سپاہ کمزوری دکھانے لگی یہ ماجرا دیکھ کر سلطان محمد میدان سے بھاگ نکلے اس کے ساتھ ہی ان کی فوج مین انتشار پھیل گیا۔ سلطان محمد وہاں سے بھاگ کر مدد کے لئے والئ کوروائی نواب عزت خان کے پاس

گئے مگر وہ ان کی مدد کے لئے تیار نہ ہوا۔ ادھر سے ناکام ہو کر وہ راحت گڑھ پہنچے اور وہاں کے قلعہ دار ہزاری کو اپنے ساتھ ملا لیا اور قلعہ میں قیام پذیر ہو گئے وہاں بھی لڑائی کا سامان اکٹھا کرنا شروع کر دیا جب فیض محمد خاں کو یہ خبر ملی وہ ان کے تعاقب میں راحت گڑھ پہنچ گئے مگر بعد میں سطان محمد خاں سے مصالحت کر لی اور راحت گڑھ کا قلعہ ان کے حوالے کر دیا ساتھ ہی کچھ جائیدادیں بھی انہیں دے دیں۔ اس طرح فیصلہ ہوا کہ آئندہ کبھی وہ اور ان کے بھائی صدر محمد خاں ریاست بھوپال کے معاملات میں دخل نہیں دیں گے۔ اس معاملے سے فراغت کے بعد وہ راستے میں سیر و شکار کرتے ہوئے بھوپال میں داخل ہوئے ریاست کے انتظامی امور اپنی سوتیلی ماں ممولا بی کے حوالے کر دیئے۔ کالو رام نامی مشعل چی جو سلطان محمد خاں سے لڑائی میں مارا گیا تھا اس کا فیض محمد خاں کو بہت افسوس تھا اسے اسلام نگر کے کنارے عیدگاہ کے قریب احترام سے جلایا گیا۔ بعد میں وہاں ایک چبوترہ بنا کر ہندوؤں نے اس مقام پر پوجا شروع کر دی تھی اس وقت نوید علی خان خواجہ سرا عالم گیر ثانی کی جانب سے قلعہ رائسن کا قلعہ دار تھا اسے اپنے فرائض میں کوتاہی کے سبب اس سے قلعہ داری چھین لی اس کا احوال بادشاہ کو دہلی روانہ کیا جس کے انصرام کا پروانہ فیض محمد خاں کے نام جاری ہو گیا۔ اس وقت پونا کا پیشوا جو یار محمد خاں سے شکست کھا چکا تھا۔ فیض محمد خاں سے بدلہ لینے کے لئے ریاست بھوپال آن پہنچا۔ حالات کے ناسازگار ہونے کی وجہ سے اس کا مقابلہ کرنے کی بجائے ماں جی ممولا سے مشاورت کے بعد بھیلسہ شجاع پور آشٹہ اور سیہور اس کے حوالے کر دیے پھر 1167ھ میں سدا شو راؤ اور بسواس راؤ دکن سے احمد شاہ ابدالی کا مقابلہ کرنے کے لئے پانی پت روانہ ہوئے تو انہوں نے راستے میں جاتے ہوئے بھوپال پہنچ کر فیض محمد خاں سے ان کے قافلے میں شامل ہونے کو کہا مگر فیض محمد خاں نے انکار کر دیا جس پر سدا شو راؤ نے دھمکی دی کہ واپسی پر وہ بھوپال کو تہہ و بالا کر کے

رہیں گے جس پر فیض محمد خاں نے کہا کہ ان شاء اللہ تمہیں ایسا کرنے کا موقع ہی نہیں ملے گا اور پھر یہی ہوا کہ پانی پت میں احمد شاہ ابدالی کے ہاتھوں اسے شکست ہوئی اور اس کی تمام ہی فوج موت کے گھاٹ اتار دی گئی۔ اس جنگ میں مال غنیمت کے طور پر پچاس ہزار گھوڑے، دو لاکھ بیل، پانچ سو اونٹ اور بیس ہزار اونٹ مع نقد جنس ابدالی کے ہاتھ لگے۔ اس جنگ میں گوالیار کا سندھیا بھی شریک تھا بھاگتے ہوئے نہ صرف شدید زخمی ہوا بلکہ اس کا تمام مال واسباب بھی احمد شاہ ابدالی کے ہاتھ آ گیا۔ اس جنگ میں سدا شوراؤ کی شکست پر ریاست بھوپال میں اطمینان کا سانس لیا گیا۔ اس وقت بجی رام ریاست بھوپال کا دیوان تھا اس کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے گھاسی رام کو ریاست بھوپال کا دیوان مقرر کیا گیا۔ وہ اپنے باپ بجی رام کے مقابلے میں بہت متعصب تھا اس نے اعلیٰ عہدوں پر مسلمانوں کو نظر انداز کیا۔ ریاست میں گائے ذبیحہ پر پابندی لگائی اور قصابوں کو سزائیں دیں۔ اس کے تعصب پن سے ریاست کے پٹھان ناخوش تھے انہوں نے اسے راہ راست پر آنے کی تلقین کی مگر جب وہ باز نہ آیا تو اسے کسی نے زہر دے دیا جس سے وہ ہلاک ہو گیا۔ اس کے بعد عزت خان کو ریاست کا دیوان مقرر کر دیا گیا۔ فیض محمد خاں استسقا کے عارضے میں مبتلا تھے وہ بروز جمعہ 11 ذی قعد 1191ھ میں انتقال کر گئے اور قلعے میں دفن کئے گئے۔

☆☆☆

نواب حیات محمد خاں

فیض محمد خاں 1777ء میں انتقال کر گئے وہ لاولد تھے چنانچہ ان کے انتقال کے بعد ان کے چھوٹے بھائی حیات محمد خاں ریاست بھوپال کے نواب مقرر ہوئے۔ ماں جی ممولا اس وقت بھی حیات تھیں۔ چنانچہ حیات محمد خاں کی تقرری میں ان کا مشورہ بھی شامل تھا لیکن ان کے انتخاب کے سلسلے میں فیض محمد خاں کی بیوہ بہو بیگم کو اعتراض تھا۔ سردار صاحب کے پوتے شریف محمد خاں کو بھی نہ صرف اعتراض تھا بلکہ وہ تو آمادۂ فساد تھے دیوان یاسین محمد خان کے انتقال کے بعد ان کا بیٹا بھی بہو بیگم کے موقف کا حامی تھا۔ ڈر تھا کہ کہیں حیات محمد خاں اور بہو بیگم کے حامیوں کے درمیان جنگ نہ چھڑ جائے ایسے میں خاندان کی بزرگ خاتون ماں جی ممولا درمیان میں آئیں اور انہوں نے بہو بیگم کو کہا کہ ریاست بغیر مرد کے نہیں چلتی۔ چنانچہ بہتر ہے کہ یار محمد خاں کے صاحب زادوں میں سے تمہیں جو پسند آئے اسے نواب مقرر کر دیا جائے۔ اس مشورہ پر بہو بیگم نے بہت کچھ سوچ سمجھ کر حیات محمد خاں کے ہی ریاست کا نواب مقرر ہونے پر رضامندی ظاہر کر دی۔ حیات محمد خاں کے نواب مقرر ہونے کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک اعلیٰ عہدیدار کرنل گڈرڈ صاحب ریاست بھوپال تشریف لائے۔ حیات محمد خاں نے ان کی خوب خاطر مدارت کی اس پر کرنل گڈرڈ بہت خوش ہوئے اور جاتے ہوئے ریاست بھوپال سے دوستی کا معاہدہ کر گئے جس میں لکھا گیا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی ریاست بھوپال کی سلامتی کی ذمہ دار رہے گی اور نواب خاندان کی نسل در نسل حفاظت کرے گی۔ کرنل گڈرڈ کا یہ دورہ ستمبر 1777ء مطابق رمضان 1192ھ میں ہوا تھا گو کہ حیات محمد

خاں ریاست کے خود مختار تھے مگر ایک طرف بہو بیگم صاحبہ اپنا حکم چلاتی تھیں تو دوسری جانب خاندان کی بزرگ خاتون ہونے کے ناطے ماں جی ممولا کا سبھی ارکان دولت احترام کرتے اور ان کا کہا نہ ٹالتے تھے نواب حیات محمد خاں کے چار غلام تھے جن میں ایک برہمن زادہ بھی تھا وہ مسلمان ہوگیا تھا اس کا نام چھوٹے خاں تھا۔ حیات محمد خاں نے اسے ریاست کا دیوان مقرر کر دیا تھا۔ یہ شخص بہت جہاں دیدہ تھا۔ اس نے ریاست کے اردگرد واقع ریاستوں سے راہ ورسم مضبوط کر لیے تھے۔

بہو بیگم چھوٹے خان کی دیوانی سے ناخوش تھیں۔ انہوں نے شریف محمد خان سے شکایت کی کہ حیات محمد خاں نے چھوٹے خان کو ریاست کا مالک بنا دیا ہے پورا خاندان اس کے رحم وکرم پر ہے۔ تمہیں غیرت نہیں آتی کہ تم اس کے آگے سر جھکاتے ہو۔ اگر میں مرد ہوتی تو اس غلام زادے چھوٹے خان سے نمٹ لیتی۔ شریف محمد خاں نے کہا کہ ہم کیا کر سکتے ہیں نواب صاحب جو چاہے سو کریں انہیں بھلا کون روک سکتا ہے۔ بہو بیگم نے ان کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا کہ ان کے پاس بہت پیسہ ہے اگر وہ کچھ کر سکیں تو وہ پیسہ خرچ کر سکتی ہیں۔ شریف محمد خاں جو دوست محمد خاں کے پوتے اور فاضل محمد خاں کے بیٹے تھے نے بہو بیگم کی پیش کش قبول کر لی اور حیات محمد خاں کے خلاف بغاوت بلند کرنے لگے۔ پہلے اپنے بھائیوں کو اعتماد میں لیا پھر فوج وسامان حرب اکٹھا کرنے لگے مگر جب اس کام کے لئے پیسہ مانگا تو بہو بیگم پہلو تہی کرنے لگیں جس پر شریف محمد خاں سخت برہم ہو کر سیہور چلے گئے وہاں خود فوج کو آراستہ کرنے کا قصد کیا تا کہ گنور کے قلعے کو حاصل کیا جائے۔ گنور کے قلعہ دار گولی خان کو ملا لیا گیا نواب حیات محمد خاں کو جب یہ خبر ملی انہوں نے سید کاظم علی کو کچھ سوار اور پیادے دے کر گنور قلعہ کی حفاظت کے لئے روانہ کیا قلعے کے نیچے دونوں فوجوں میں سخت لڑائی ہوئی شریف محمد خاں کی فوج مقابلے میں کمزور پڑ گئی اور وہ بھاگ کھڑی ہوئی مگر کاظم علی مارے گئے۔

حیات محمد خاں نے قلعہ گنور پر اپنے قبضے پر اطمینان کا سانس لیا مگر اس کی حفاظت کے لئے مزید فوج روانہ کر دی۔ گنور کے قلعے دار کولی خان کو بھوپال لا کر قید کر دیا گیا۔ ادھر شریف محمد خاں اپنے جنون سے باز نہ آئے اور وہ اپنے بھائیوں کو ساتھ ملا کر مزید فوج لے کر بھوپال پر حملہ آور ہوئے مگر حیات محمد خاں کے اشارے پر چھوٹے خان نے حسین محمد خان مرزا خیل اور انور خان کمال زئی کو فوج دے کر مقابلے کے لئے روانہ کیا۔ بھوپال سے پانچ کوس دور مغرب کی سمت میں دونوں فوجوں میں گھمسان کا رن پڑا۔

یہ واقعہ 1201ھ کا ہے۔ اس لڑائی کا دائرہ کار کافی بڑھ گیا تھا اس کی آگ بھوپال شہر تک پہنچ گئی تھی مگر حیات محمد خاں کے فوجیوں نے حکمت سے کام لے کر شریف محمد خاں کی فوج کو زیر کر لیا اور شریف محمد خاں اور ان کے ساتھیوں کو قتل کر کے سر کاٹ لئے گئے جنہیں حیات محمد خاں کے روبرو پیش کیا گیا جس پر انہیں سخت صدمہ ہوا۔ کیوں کہ شریف محمد خاں اگرچہ باغی تھا مگر ان کا خونی رشتے دار تھا۔ حیات محمد خاں کے خلاف ابھی بھی بغاوت تھمی نہیں تھی۔ مخالفین کا اصل ہدف چھوٹے خان تھے جن سے ریاست کے پٹھان بہت بیزار تھے وہ انہیں کسی طرح ٹھکانے لگانا چاہتے تھے مگر حیات محمد خاں ان کی طرف داری میں سب سے آگے تھے چنانچہ ٹھیک عید والے دن جب حیات محمد خاں عیدگاہ سے نماز پڑھ کر ماں جی مولا کے پرانے قلعے میں گئے باغیوں نے انہیں ٹھکانے لگانے کے لئے پرانے قلعے میں اپنے آدمی بھیج دیئے۔ نجات محمد خاں پسر یٰسین محمد خاں آگے آیا اور نواب صاحب سے سوالات کی بوچھاڑ کر دی اور شکایت کی آپ نے ایک غیر پٹھان کو پٹھانوں پر حاکم بنا دیا ہے اس کو یا تو آپ خود ہٹا دیں ورنہ ہمیں اجازت دیں کہ ہم اسے ختم کر دیں۔ نواب صاحب نے کہا کہ وہ میرا زرخرید غلام نہیں اس کو میں نے بیٹے کی طرح پالا ہے ایک نیک اور پارسا شخص ہے اس کی عقل مندی کی وجہ سے اسے ریاست کا دیوان مقرر کیا گیا ہے پھر اس نے ابھی تک کوئی نمک

حرامی نہیں کی ہے کہ اس کو اس کی سزا دی جائے البتہ اگر تم سے اس نے کوئی گستاخی کی ہے تو بتاؤ میں اسے اس کی سزا دوں۔ ابھی یہ بات ہو رہی تھی کہ نجات محمد خان نے اچانک نواب صاحب پر حملہ کر دیا اس نے خنجر مارا تھا کہ پرس رام چوبدار فوراً سامنے آ گیا اور اس نے نجات محمد خان کے سر پر چاندی کا عسا دے مارا یہ منظر دیکھ کر محل کی عورتوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ نواب صاحب دوڑ کر محل میں چلے گئے مگر ان کے لوگوں نے نجات محمد خان اور دیگر حملہ آوروں کو جان سے مار دیا۔ کولی خان یہ خبر سن کر براستہ ندی اپنی جاگیر کی طرف چلے گئے۔ اس معرکے میں نواب صاحب کا ایک جاں نثار بھولا ناتھ مارا گیا۔ اس واقعے نے چھوٹے خان پر بہت اثر کیا وہ اپنی سلامتی کے سلسلے میں سخت پریشان ہو گئے۔ ان سے کچھ غلطیاں ضرور ہو گئی تھیں جن سے کئی پٹھانوں کو تکلیف پہنچی تھی۔ کئی ایک جان سے گئے اور کئی کو شہر سے نکال دیا گیا۔ چناں چہ شہر کو محفوظ بنانے کے لئے بھوپال کے آس پاس کئی چوکیاں بنائی گئیں جس سے شہر میں کافی حد تک امن قائم ہو گیا۔ چھوٹے خان نے بھوپال شہر کے شرق میں بہنے والی بان گنگا ندی پر ایک بند بنوایا۔ شہر کے گرد خندقیں بھی کھدوائیں۔ قلعہ فتح گڑھ کی تعمیر و مرمت کرائی اور اس میں اپنی رہائش کے لئے محل تعمیر کروایا۔ اسی اثناء میں ماں جی ممولا کا انتقال ہو گیا۔

چھوٹے خان درمیانہ قد اور متناسب جسم کے آدمی تھے گفتگو بہت دھیمی اور عاجزی سے کرتے تھے ان کا لباس ہندوؤں سے بہت ملتا جلتا تھا۔ 1209ھ میں 40 برس کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا۔ قلعہ فتح گڑھ میں مدفون ہوئے ان کا بیٹا امیر محمد خان کئی ارکان حکومت کی حمایت سے دیوان ریاست مقرر ہوا مگر وہ جلد ہی بدنام ہو گیا۔ اس لیے کہ جن لوگوں نے اس کی حمایت کی تھی وہ اُن کے زیر سایہ رعیت پر طرح طرح کے ظلم وستم کرنے لگا جب حیات محمد خاں تک یہ خبریں پہنچیں تو انہوں نے دیوان امیر محمد

خان کو برخاست اور ان کے حمائیتیوں کو موقوف کر دیا اور حکم دیا کہ وہ فوراً بھوپال سے چلے جائیں۔ نواب صاحب کے اس حکم پر وہ بغاوت پر اتر آئے اور قلعہ فتح گڑھ پر قبضہ کر کے وہاں سے توپ کے گولے مکانوں پر برسانے لگے۔ جب نواب صاحب کی فوج مقابلے کے لئے گئی وہ قلعہ سے نکل کر شہر میں چھ لاکھ روپے سے زیادہ کا مال و اسباب لوٹ کر ناگ پور بھاگ گئے۔ وہاں راجہ گھوجی بھوسنلیا کے نوکر ہو گئے۔ ساتھ ہی راجہ کو بھڑکا کر ہوشنگ آباد شہر پر قبضہ کرنے کے لئے آمادہ کر لیا۔ وہ راجہ کی چالیس ہزار فوج کے ساتھ ہوشنگ آباد پہنچے جب نواب حیات محمد خاں کو ہوشنگ آباد کے محاصرے کی خبر ملی انہوں نے دس ہزار فوج بھیج دی جس نے وہاں پہلے سے موجود دو ہزار فوج کے ساتھ مل کر حملہ آور فوج کا مقابلہ شروع کر دیا۔ کئی روز تک لڑائی چلتی رہی پھر مولوی محمد خان کابلی والا سو سپاہیوں کو ساتھ لے کر قلعہ کے باہر نکلے اور اس بہادری سے لڑے کہ ناگ پور کی فوج بھاگنے پر مجبور ہو گئی مگر ایسے میں مولوی محمد خان ماتھے پر گولی لگنے سے ہلاک ہو گئے۔ مخالف فوج کو اس سے بہت حوصلہ ملا اور وہ دوبارہ جنگ میں مصروف ہو گئی اور بالآخر ہوشنگ آباد کا قلعہ ان کے قبضے میں چلا گیا۔ یہ جنگ 1210ھ کے شروع میں ہوئی تھی۔ اس جنگ میں بھوپال کی فوج کا بہت نقصان ہوا اور اسے بالآخر نربدا ندی کو پار کر کے بھوپال واپس آنا پڑا۔ اس کے ساتھ ہی نواب حیات محمد خاں نے ہمت رام کو راجگی کا خطاب دے کر دیوان ریاست مقرر کیا۔

اسی اثناء میں یہ واقعہ پیش آیا کہ شریف محمد خاں کا بیٹا وزیر محمد خاں بھوپال لوٹ آیا مگر اسے شہر پناہ کے باہر ہی روک لیا گیا اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ وہ نواب حیات محمد خاں کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے جاؤ نواب صاحب کو خبر کر دو کہ شریف محمد خاں کا بیٹا وزیر محمد خاں ان سے ملاقات کرنے آیا ہے۔ دربانوں نے یہ خبر نواب صاحب تک پہنچائی، نواب صاحب نے فوراً اسے بلانے کے لئے کہا۔ وہ محل

میں آیا مگر پہلے نواب شفقت سے ملاقات ہوئی جنہیں اس نے بتایا کہ وہ بھوپال سے نکل کر کئی ریاستوں میں جا کر رہنے لگا اور وہاں نوکریاں کیں لیکن اس کے بھوپال چھوڑنے کا اصل سبب چھوٹے خان کا اس پر ظلم و ستم تھا۔ مزید بتایا کہ اسے بھوپال کے خراب حالات کا سن کر بہت افسوس ہوا اور وہ ریاست کی خدمت کرنے کے جذبے کے ساتھ یہاں واپس آیا ہے۔ یہ سن کر نواب حیات محمد خاں نے اسے گلے سے لگا لیا اور کہا کہ تم میرے بیٹے ہو اور تم یقیناً ریاست کا درد رکھتے ہو اور اس کے حالات کو بہتر بنانے کے لئے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرو گے پھر چند ماہ بعد راجہ ہمت رام کو دیوانی سے معزول کر کے وزیر محمد خاں کو دیوان مقرر کرنا چاہا مگر ان کے فرزند غوث محمد خاں نے منع کیا ساتھ ہی بیگم نواب حیات محمد خاں نے بھی منع کیا اور کہا کہ یہ شخص اپنے بزرگوں پر ہونے والے مظالم کا بدلہ لینا چاہتا ہے۔ اسی اثناء میں مرید محمد خاں پسر سلطان محمد خاں بھوپال آیا ذیقعد 1210ھ میں اس نے شہر کے باہر اپنے باپ کے باغ میں قیام کیا اور اپنے باپ کو خوب یاد کیا۔ دوسرے دن نواب صاحب سے ملاقات کی اور انہیں خوشامدی باتوں سے راضی کر لیا۔ غوث محمد خاں بھی اس سے خوش ہوئے مگر سب سے زیادہ خوش بیگم حیات محمد خاں ہوئیں مگر دور اندیش پٹھان اس کے آنے سے خوش نہ ہوئے اور کہنے لگے کہ اس کے آنے سے ضرور ریاست کو نقصان ہو گا چوں کہ نواب صاحب کو وہ راضی کر چکا تھا چنانچہ اسے ریاست کا دیوان بنا دیا گیا۔ وہ یہ عہدہ پاتے ہی اپنے پرانے دشمنوں کو ستانے لگا پہلے اس نے پرانے دیوان بجی رام کی بیوہ کو ستایا راجہ ہمت رام اور اس کے بھانجے منشی خیالی رام کو بلاوجہ ڈیڑھ مہینے قید رکھا اور پھر دس ہزار روپے لے کر چھوڑ دیا۔ فوج کی تنخواہیں روک لیں ہر گھر سے ٹیکس وصول کرنے لگا۔ جب فوج نے شور مچایا تو وہ بیگم حیات محمد خاں کے پاس گیا اور ان سے رقم حاصل کرنے کی کوشش کی تا کہ فوج کی تنخواہیں دی جائیں۔ مگر بیگم صاحبہ نے صاف منع کر دیا اور کہا کہ تم دیوان ہو

یہ کام تمہارا ہے کہ تم ان کی تنخواہوں کا کہیں سے بندوبست کرو۔ یہ گفتگو پردے کے پیچھے ہو رہی تھی۔ بیگم صاحبہ کا کورا جواب سن کر مرید خاں سخت برہم ہوا اور اس نے وہاں موجود اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا وہ پردے کے اندر گھس گئے اور بیگم صاحبہ کو مع گلاب خواجہ سرا اور محمد علی بوہرہ وغیرہ کو مار ڈالا ساتھ ہی محل میں موجود نقدی و دوسری قیمتی اشیاء کو لوٹ کر راحت گڑھ بھیج دیا۔ اس کے ساتھ ہی مرید خاں نے چالاکی سے یہ مشہور کر دیا کہ میں نے غوث محمد خاں پسر حیات محمد خاں کے اشارے پر یہ کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی باغی ہو کر قلعہ فتح گڑھ پر قابض ہو گیا اور وہاں عوام کو تنگ کرنے لگا۔ رعایا کو اتنا ستایا گیا کہ لوگ آدھی رات کو ہاتھ اٹھا اٹھا کر اس کے لئے بددعائیں کرتے تھے۔

وہ ایک دن کشتی میں سوار ہو کر نواب فیض محمد خاں کے مقبرے میں گیا اور وہاں ایک غریب لڑکی سے نکاح کر لیا۔ وہ مقبرے میں سویا ہوا تھا کہ خواب ایسا ڈراؤنا دیکھا کہ گھبرا کر لڑکی کو ساتھ لے کر قلعہ فتح گڑھ واپس آ گیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ جس وقت اس لڑکی کے قریب جاتا تھا دیوانوں کی طرح گھبرا کر کمرے سے باہر آ جاتا تھا اور کہتا تھا کہ میرے پورے بدن میں آگ لگی ہوئی ہے۔ اس کے حالات ایسے تھے کہ نہ اسے جاگتے چین تھا اور نہ سونے میں سکون۔ جب وہ سونے کی کوشش کرتا اسے دہشت ناک شکلیں جو جن اور بھوت کی تھیں تنگ کرتیں اور مارنے کی کوشش کرتی تھیں۔ ایسے میں بھی مرید خاں وزیر محمد خاں کی دشمنی کو نہ بھولا اس نے رحیم خان عامل باڑی کو خط لکھا کہ جیسے ہی وزیر محمد خاں وہاں آئیں انہیں قتل کر دیا جائے۔ اتفاق سے یہ خط وزیر محمد خاں کے ہاتھ لگ گیا۔ وزیر محمد خاں نے سازشی خط پڑھ کر رحیم خان پر حملہ کر دیا وہ قلعہ گنور گڑھ چھوڑ کر بھاگ گیا۔ وزیر محمد خاں نے قلعہ اور توپ خانے پر قبضہ کر لیا۔ اسی اثناء میں نواب حیات محمد خاں نے کولی خان کو نیابت کا وعدہ کر کے اپنی مدد کے لئے بلا لیا۔

کولی خاں آنبا پانی سے چلے اور اسی وقت وزیر محمد خاں باڑی سے روانہ

ہوئے دونوں ایک ساتھ بھوپال میں داخل ہوئے۔ دونوں کی آمد کی خبر سن کر مرید خاں نے گوالیار کے بالا راؤ کو اپنی مدد کے لئے پیغام بھیجا جس پر وہ بیس ہزار فوج لے کر بھوپال پہنچا مگر شرط رکھی کہ مرید خاں پہلے کوئی قلعہ دے جس پر مرید خاں نے اسے اسلام نگر دے دیا مگر بحکم موتی بیگم خواہر حیات محمد خاں قلعہ دار اسلام نگر قادر محمد خاں نے راؤ اور مرید خاں کی سپاہ پر توپوں کے گولوں کا مینہ برسا دیا جس سے پسپا ہو کر مرید خاں وہاں سے بھاگ کر قلعہ رائسن پہنچ گیا اور یہ قلعہ راؤ کو دے دیا۔ اس نے بھان مل کو قلعہ دار مقرر کر کے اپنی سپاہ کے ساتھ پھر بھوپال پر حملہ آور ہوا مگر غوث محمد خاں نے وزیر محمد خاں کے ساتھ مل کر مخالف سپاہ پر ایسا جوابی حملہ کیا کہ زلزلہ برپا ہو گیا بارود کے دھوئیں سے سورج بھی چھپ گیا تھا۔ ایک دوسرے نے خوب خون کی ہولی کھیلی بالآخر راؤ کو شکست ہوئی۔ مرید خاں بھاگ گیا مگر راؤ نے اسے گرفتار کر کے لڑائی میں نقصان کا ازالہ کرنے کو کہا۔ اس کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی چنانچہ اسے گرفتار کر کے قید میں ڈال دیا گیا۔ مرید خاں وہیں تشدد سے ہلاک ہو گیا۔ دو دن تک اس کی لاش لٹکتی رہی پھر اسے دفن کرنے کا حکم دیا گیا۔ بھوپال کے لوگ مرید خاں کو برے نام سے پکارتے تھے اور جب کوئی اس کی قبر پر جاتا تھا اس کی قبر پر پانچ جوتے مارتا تھا۔ اس کے بعد حیات محمد خاں نے وزیر محمد خاں کو وزیر الدولہ کا خطاب دے کر معمار ریاست بنا دیا۔ اس وقت رائیسن کا قلعہ بھان مل کے قبضے میں تھا۔ وزیر محمد نے ولائت محمد خاں کو رائسن بھیج کر قلعے کا محاصرہ کرنے کی ہدایت کی۔ بھان مل نے قلعے کے اندر رہنے والوں کو خوب لوٹا اور بعد میں انہیں قلعے سے باہر نکال دیا۔ ساتھ ہی ولائت محمد خاں کے قلعہ کے طویل محاصرے سے تنگ آ کر وزیر محمد کو پیغام بھیجا کہ اگر وہ تیس ہزار روپیہ دیں تو وہ قلعے کو خالی کر دے گا۔ وزیر محمد خاں نے جب اس کی فرمائش کو پورا کر دیا تو وہ توپوں کو قلعے سے گرا کر اور بارود کو پانی میں ملا کر قلعہ خالی کر کے سرونج چلا گیا۔ یہ واقعہ سنہ 1212ھ

میں رونما ہوا تھا۔ اس کے بعد وزیر محمد خاں ہوشنگ آباد میں راؤ کے قبضے کی جانب متوجہ ہوئے انہوں نے قلعہ ہوشنگ آباد کے قلعہ دار کو ملا کر قلعہ واپس لے لیا۔ والیٔ ناگ پور نے یہ خبر سن کر اپنی چالیس ہزار فوج بھیج دی جب کہ بھوپال کی کل فوج پانچ ہزار تھی۔ دونوں جانب سے کاٹ مار ہوئی ایک وقت ایسا آیا کہ وزیر محمد خاں میدان میں اکیلے رہ گئے۔ دشمن نے انہیں مارنا چاہا مگر وہ اپنے گھوڑے پر سوار قلعہ کی جانب بھاگے راستے میں بارہ گز چوڑی خندق تھی اسے پار کرنا آسان نہ تھا مگر ان کا گھوڑا اس خندق کو پار کر گیا اور دشمن یہ تماشا دیکھ کر حیران رہ گئے۔ پھر وزیر محمد خاں قلعے کے اندر سے دشمن پر کاری ضرب لگاتے رہے مگر آخر کار وہ قلعہ خالی کر کے براستہ نربدا ندی گنور کے جنگل میں پہنچ گئے اور وہاں سے بھوپال آ گئے۔ اس طرح قلعے پر ناگ پور کی فوج کا پھر قبضہ ہو گیا۔

نواب حیات محمد خاں تن آسان انسان تھے وہ وزیر محمد خاں کی جنگ جویانہ طبیعت سے بہت پریشان ہوئے۔ انہوں نے اسے اپنے لئے خطرہ سمجھ کر اسے اپنے بیٹے غوث محمد خاں کے مشورے سے ہٹا کر اکبر خاں کو نیابت عطا کر دی مگر ان سے ریاست کا انتظام نہ چل سکا۔ ادھر وزیر محمد خاں کا حکومت کے خلاف کارروائیاں بہت بڑھ چکی تھیں۔ چنانچہ غوث محمد خاں نے راؤ سندھیہ سے مدد طلب کی کہ وہ وزیر محمد خاں کو ریاست سے نکال دیں۔ راؤ نے حکیم اسد علی کو بھوپال بھیجا۔ وزیر محمد خاں تاڑ گئے کہ ان کے خلاف کوئی کارروائی ہونے والی ہے مگر حکیم اسد علی ایک جہاں دیدہ شخص تھے انہوں نے حیات محمد خاں اور غوث محمد خاں کو سمجھایا کہ وہ ریاست کا انتظام کسی اور سے نہیں چلا سکتے چنانچہ وزیر محمد خاں ہی اس کام کے لئے موزوں ہیں۔ حکیم اسد علی کا مشورہ مان لیا گیا اور وزیر محمد خاں پھر سے ریاست کا انتظام چلانے لگے مگر پھر انہوں نے کوئی غلطی نہیں کی۔ نواب حیات محمد خاں 16 رمضان المبارک 1223ھ میں چل بسے۔

☆☆☆

نواب غوث محمد خاں

آپ 4 شوال 1223ھ کو ریاست بھوپال کے والی مقرر ہوئے۔ وزیر محمد خاں کے دیوان ہوتے ہوئے نہ ان کے والد کو ریاست کی جانب سے کوئی فکر لاحق تھی اور نہ ہی غوث محمد خاں کو کوئی فکر تھی البتہ وزیر محمد خاں کی جنگ جویانہ ذہنیت سے دونوں باپ بیٹے پریشان تھے مگر وزیر محمد خاں نے اپنی بہادری اور شجاعت سے پورے علاقے میں ایسی دھاک بٹھا دی تھی کہ لوگ ان کا نام سنتے ہی دہل جاتے تھے۔ ان کا نام بانڈے گھوڑے والا پڑ گیا تھا۔ ناگپور اور گوالیار کے راجہ وزیر محمد خاں سے بہت ناراض تھے اس لئے کہ ایک تو انہوں نے کئی دفعہ ان دونوں کی فوجوں کو شکست دی تھی تو دوسری طرف ان کی رعایا کو بھی تکلیفیں دی تھیں۔ 1224ھ میں دونوں ریاستوں کی فوجیں بھوپال کے گرد جمع ہو گئیں۔ ناگ پور کی فوج کے سربراہ صدیق علی خاں نے نواب غوث محمد خاں سے کہا کہ وزیر محمد خاں نے اپنے بزرگوں کے اچھے رویے کو چھوڑ دیا ہے اس نے راجہ رگھو جی اور سندھیہ کی رعایا کو بھی بہت ستایا ہے اگر وہ ہمارے ہاتھ لگا ہم اسے پکڑ کر لے جائیں گے اور اگر نہ ملا تو آپ اس کے بیوی بچوں کو ہمارے حوالے کر دو۔ غوث محمد نے کہا کہ بیوی بچوں کا اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔ اس پر صدیق علی خاں نے کہا کہ اگر تم انہیں نہیں دیتے تو پھر اپنے بڑے بیٹے کو ہمارے ساتھ کر دو تاکہ تمام فساد دافع ہو جائے۔ نواب صاحب نے یہ تجویز قبول کر لی اور اپنے بڑے بیٹے معز محمد خاں کو ان کے ساتھ کر دیا۔ ناگ پور پہنچنے پر راجہ رگھو جی خود معز محمد خاں سے ملنے آیا وہ وہاں ایک سال تک آرام سے رہے اور خوب خاطر مدارت ہوئی اس کے بعد خلعت دے کر

رخصت کر دیا گیا۔ غوث محمد خاں کو جب یہ خبر ملی وہ اپنے بیٹے کو لینے کئی کوس تک آئے
اور بیٹے کو دھوم دھام سے محل لے گئے۔

ادھر وزیر محمد خاں سے والی ٹونک نواب امیر خاں نے ناگ پور کے خلاف لڑنے کے لئے مدد چاہی۔ اس جنگ میں انگریزوں کی فوج بھی درمیان میں آ گئی جس کا نذر محمد خاں نے بے حد احترام کیا کیونکہ انگریز کرنل گڈرڈ نے کمپنی کی جانب سے ریاست بھوپال کے بزرگوں کو ہمیشہ اپنی مدد دینے اور ان کی حفاظت کا وعدہ کیا تھا۔ نواب غوث محمد خاں کا پورا ہی دور لڑائیوں سے بھرپور تھا۔ وزیر محمد خاں ان لڑائیوں میں پیش پیش رہے کئی خطروں کو مول لیا مگر ہمیشہ محفوظ رہے۔ انہوں نے غوث محمد خاں کے دیوان کی حیثیت سے سات بڑی لڑائیاں لڑیں۔ زیادہ تر لڑائیاں ناگ پور اور گوالیار کی فوجوں سے لڑی گئیں۔ وزیر محمد خاں کاروبارِ حکومت پر چھا گئے تھے مگر غوث محمد خاں کی نوابی کی حیثیت کم پڑ گئی تھی۔ غوث محمد خاں خاص طور پر جگوا کی لڑائی کے بعد وزیر محمد خاں سے مغلوب ہو گئے تھے گوشہ نشین اور بے اختیار ہو گئے تھے۔ حکومت کے وزیر محمد خاں کے پاس جانے کے بعد مشکل سے گزارا کرنا پڑا۔ 1826ء میں آپ کا انتقال ہو گیا۔ وزیر محمد خاں کا بھی بعارضہ تپ دق 1816ء میں انتقال ہو گیا تھا۔ ان کی وفات کے بعد ان کے دو بیٹوں امیر محمد خاں اور نظر محمد خاں میں سے چھوٹے بیٹے نظر محمد خاں کو نواب کا خطاب عطا ہوا۔

☆☆☆

نواب نظر محمد خاں

آپ نے ریاست کے نظام کو اس خیر وخوبی سے چلایا کہ چند ہی دنوں میں ریاست کے حالات سدھرنے لگے۔ سب سے پہلے آپ نے مولوی نظام الدین کی سفارت میں ریذیڈنٹ صاحب بہادر شاہ جہاں آباد سے رابطہ کیا اور ان سے رشتے کو مضبوط کیا۔ 22 ربیع الآخر 1232ھ میں جمعے کے دن آپ کی شادی گوہر بیگم دختر نواب غوث محمد خاں سے ہوگئی۔ جب انگریز فوج ہوشنگ آباد میں پنڈاروں کی سرکوبی کے لئے آئی نواب صاحب نے حکیم شہزاد مسیح کو ان کے پاس بھیجا اور انگریزی فوج کو اپنی طرف سے مکمل مدد کی پیش کش کی۔ آپ نے عملی طور پر مدد کرنے کے لئے اکاون لاکھ روپے کا زیور و جواہر فروخت کر کے یہ رقم انگریزوں کے حوالے کر دی۔ اس دن سے ریاست بھوپال کی دوستی حکام انگلشیہ سے پکی ہوگئی۔ اس کے جواب میں نواب نظر محمد خاں کو پانچ پرگنے اور قلعہ اسلام نگر اور سند کے طور پر تمغہ عطا کیا گیا۔ 22 ویں محرم 1235ھ کو جمعرات کے دن سیر و شکار کی غرض سے قلعہ اسلام نگر گئے سوتے میں بھرے طمنچے سے کان کو کھجلایا جس سے گولی چل گئی وہ سر سے نکل کر دیوار میں جا گھسی اس کے ساتھ ہی آپ کا انتقال ہوگیا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ وہ اپنی صاحب زادی سکندر بیگم کو زانو پر بٹھا کر کھلا رہے تھے کہ پہلو میں بھرا ہوا طمنچہ رکھا ہوا تھا ان کے سالے محمد خاں جو اس وقت صرف آٹھ سال کے تھے نے وہ طمنچہ اٹھالیا اور ان کے ہاتھ سے چل گیا گولی نظر محمد خاں کے سر سے نکل گئی۔ یہ روایت درست ہے کیوں کہ اسے انگریز تاریخ داں میجر ولیم ہاف صاحب نے بھی لکھا ہے۔ بہر کیف صرف تین برس نو مہینے اور چھ دن حکومت

کر کے نظر محمد خاں صرف اٹھائیس برس کی عمر میں انتقال فرما گئے۔ بڑے باغ میں دفن کیے گئے۔

ان کے اور انگریز سرکار کے درمیان جو معاہدہ طے پایا تھا اس کے نکات اس طرح تھے:

1- دونوں فریقوں کے درمیان دوستی اور یکجہتی بمطابق سرکار کمپنی بہادر اور نواب نظیر الدولہ نظر محمد خاں بہادر اور ان کی اولاد کے درمیان نسل درنسل قائم رہے گی اور ایک کا دشمن دوسرے کا دشمن اور ایک کا دوست دوسرے کا دوست ہوگا۔

2- بھوپال ریاست کی حفاظت کی ذمہ دار کمپنی سرکار ہوگی۔

3- نواب نظیر الدولہ نظر محمد خاں بہادر اور ان کی اولادیں نسل درنسل سرکار کمپنی بہادر کی اطاعت کریں گے۔

4- ریاست بھوپال کمپنی بہادر کو بغیر اطلاع کسی بھی پڑوسی سے تعلقات بنانے اور بگاڑنے کی مجاز نہیں۔

5- نواب موصوف کسی کے ساتھ جھگڑا فساد نہیں کریں گے اگر اتفاقاً کسی کے ساتھ ہو جائے تو اس کا فیصلہ عدل و انصاف سے کمپنی سرکار کرے گی۔

6- ریاست بھوپال چھ سو سوار اور چار سو پیادے کمپنی سرکار کو فراہم کرے گی اور اگر ضرورت پڑی تو ریاست کا نظم ونسق چلانے والی فوج بھی کمپنی بہادر کو فراہم کی جائے گی۔

7- ریاست بھوپال میں انگریزی فوج کی آمد و رفت میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالی جائے اور انگریزی فوج کی ریاست میں چھاؤنی قائم کرنے کے لئے نواب موصوف دو ہزار گز زمین فراہم کریں گے البتہ انگریزی فوج سے ریاست کو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔

8- نواب موصوف اور ان کی اولادیں انگریزی فوج کو غلہ و دیگر چیزیں فراہم کرنے میں مدد کریں گی اور ان چیزوں پر کوئی چنگی و محصول وصول نہیں کریں گی۔

9- نواب صاحب اور ان کی اولاد ریاست کی مالک و مختار ہیں کمپنی سرکار ان کے اندرونی معاملے میں کوئی مداخلت نہیں کرے گی۔

10- نواب صاحب کی آمدنی بڑھانے کے لئے پانچ پرگنے جن میں آشٹہ، اچھاور، سیہور، دوراہسہ اور دیبی پورہ شامل ہیں نواب صاحب کو عطا کر دیئے ہیں۔

11- یہ عہد نامہ گیارہ دفعات پر مشتمل ہے۔ بمقام رائسن کپتان اسٹورٹ صاحب بہادر اور کرم محمد خاں بہادر اور حکیم شہزاد مسیح کے درمیان طے ہوا اور اس پر دستخط ہوئے و مہر لگائی گئی۔ کپتان اسٹورٹ صاحب بہادر اقرار کرتے ہیں کہ تین ہفتے میں اس عہد نامے پر نواب گورنر جنرل بہادر کی مہر و دستخط کرا کے نواب موصوف کو دے دیں گے اس کے علاوہ کرم محمد خاں اور حکیم شہزاد مسیح بھی اقرار کرتے ہیں کہ وہ نواب نظیرالدولہ نظر محمد خاں بہادر کی مہر و دستخط اس عہد نامے پر کروا کے دے دیں گے۔ مورخہ 26 فروری 1818ء مطابق 19 ویں ربیع الآخر 1233ھ کو یہ معاہدہ طے ہوا۔

اس معاہدے کے بعد سیہور میں انگریزی پولیٹیکل ایجنٹ کا تقرر عمل میں آیا اور ساتھ ہی ایک قطعہ اراضی چھاؤنی کے لئے مخصوص کر دی گئی اور ہزار سوار و پیادہ سیہور میں متعین کر دیئے گئے جن کی تنخواہ ریاست بھوپال ادا کرتی تھی یہ سلسلہ نواب قدسیہ بیگم کے عہد میں بھی جاری رہا۔ اس وقت فوج کے لئے ایک لاکھ 80 ہزار روپیہ نقد فراہم کیا جاتا تھا۔ نواب جہانگیر محمد خاں کے دور میں بھی یہ جاری رہا۔ اس وقت رقم میں دس ہزار روپے کا اضافہ کر دیا گیا۔ 1818ء مطابق 1233ھ میں طے ہونے والے معاہدے کی رو سے فوج کو تنخواہ کی مد میں مزید اضافہ ہوتا رہا اور نواب سکندر بیگم صاحبہ

کے دور میں یہ رقم دو لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔ اس وقت نواب گورنر جنرل کمپنی سرکار نے جولائی 1849ء سے یہ طے کر دیا تھا کہ ریاست بھوپال ہر سال فوج کے خرچ کے لئے مبلغ دو لاکھ روپے بھیجا کرے گی۔ اس پیش رفت پر گورنر جنرل بہادر نے نہایت خوشی کا اظہار کیا اور بیگم صاحبہ کی تعریف کی تھی۔ ایک سند بھی جاری کر دی تھی کہ قلعہ اور شہر اسلام نگر بمعہ ملحقات کے جو اگلے زمانے سے بھوپال کے نوابین کے قبضے میں تھے نسل در نسل انہیں بخش دیئے گئے۔ ساتھ ہی گورنر جنرل صاحب بہادر نے یہ بھی امید ظاہر کی کہ ریاست کے نوابین اور ان کی اولاد بھی کمپنی بہادر کا ہر طرح خیال رکھیں گے اور اپنا حق ادا کرتے رہیں گے۔

KUTUB KHANA JALALI BOOKS JALALI

نواب قدسیہ بیگم

نواب نظیر الدولہ نظر محمد خاں کی اچانک حادثاتی موت کے بعد میاں کرم محمد خان اور حکیم شہزاد مسیح نے میجر ہنری صاحب بہادر پولیٹیکل ایجنٹ کی اجازت سے نظر محمد خاں کی بیوہ گوہر بیگم صاحبہ قدسیہ کو مختار ریاست بھوپال قرار دے دیا اور خود بطور دیوان ریاست کے انتظامی معاملات میں مشغول ہو گئے۔ اس وقت قدسیہ بیگم کی بیٹی سکندر بیگم اٹھارہ برس چھ مہینے اور چودہ دن کی تھیں۔ نائبین ریاست نے پولیٹیکل ایجنٹ صاحب بہادر کو یہ تجویز بھی دی کہ جو شخص سکندر بیگم کا شوہر بنے وہی رئیس ریاست بنے گا۔ سکندر بیگم کے بالغ قرار پانے پر ایجنٹ صاحب بہادر کے مشورے سے نواب میر محمد خاں بن میاں امیر محمد خاں بن وزیر محمد خاں سے منگنی کر دی گئی لیکن جلد ہی سکندر بیگم نے انہیں ناپسند کر دیا جس پر نواب منیر محمد خاں آمادۂ جنگ ہو گئے۔ 4 ربیع الاول 1243ھ سے چار دن تک ریاست میں خانہ جنگی و خونریزی جاری رہی۔ ہربرٹ صاحب بہادر ایجنٹ اس خانہ جنگی سے بیزار نظر آئے۔ انہوں نے قدسیہ بیگم کو ایک خط میں لکھا کہ میں آپ کے پاس آ رہا ہوں اور کپتان جانسن صاحب فوراً سیہور سے بھوپال آ کر اس فساد کو ختم کرائیں گے۔ آپ بھی ایسی کوشش کریں کہ میرے بھوپال پہنچنے سے پہلے ہی یہ فساد ختم ہو جائے۔ جب منیر محمد خاں نے حالات اپنے مخالف دیکھے تو لڑائی ختم کر دی۔ جس پر انہیں چوالیس ہزار روپیہ سال کی جاگیر عطا کی گئی۔ اس کے بعد نواب جہانگیر محمد خاں سے سکندر بیگم کی شادی کی بات طے پا گئی۔ ان کو نواب نظیر الدولہ شمشیر جنگ بہادر کا خطاب دیا گیا۔ انہیں دولہا نواب بھی کہا جاتا تھا۔ اسی اثناء میں حکیم شہزاد مسیح کا چوبیس

جمادی الآخر 1244ھ میں انتقال ہوگیا۔ نواب قدسیہ بیگم نے نواب جہانگیر خاں کی تربیت کے لئے مولوی عبدالقادر اور ملا شہاب الدین کو مقرر کیا اور میر واصل علی کو بتجویز ایجنٹ بہادر صاحب معلّم مقرر کیا گیا۔

1249ھ مطابق 1833ء کے ماہ جنوری میں گورنر جنرل لارڈ بنٹک کلکتے سے ساگر تشریف لائے نواب جہانگیر محمد خاں بہادر کرم محمد خاں اور دیوان خوش وقت رائے ساگر جاکر گورنر جنرل سے ملے ملاقات میں خلعت عطا کی حصول اقتدار ریاست اور سکندر بیگم سے شادی کا حکم ملا۔ میجر الویس صاحب بہادر کو حکم دیا کہ قدسیہ بیگم صاحبہ کو کہیں کہ وہ نواب جہانگیر محمد خاں صاحب کا نکاح کرادیں البتہ اختیارات کے لئے کچھ دن رکنے کو کہا۔ کرم محمد خان 1250ھ میں انتقال کر گئے چنانچہ قدسیہ بیگم نے خوش وقت رائے کو عہدہ نیابت پر فائز کیا۔ علی شاہ کالے خاں اور محمد تراب خاں وغیرہ ان کے مقرب مقرر ہوئے۔ میجر الویس صاحب بہادر کی اجمیر بدلی ہونے کے بعد ولکنسن صاحب بہادر بھوپال تشریف لائے اور ان کی موجودگی میں 18 ذی الحجہ 1250ھ مطابق 1835ء بروز جمعہ سکندر بیگم کا نکاح نواب جہانگیر محمد خاں سے ہوگیا۔ اس کے بعد نواب جہانگیر خاں نے حکومت کرنے کا اختیار مانگا۔ ربیع الآخر 1252ھ کو حضرت شیخ عبدالقادر گیلانیؒ کا عرس منعقد ہوا محل میں چاروں طرف چراغاں کیا گیا تمام خاندان کے لوگ اس وقت موجود تھے کہ سکندر بیگم کو ایک اہلکار ہمیر سنگھ نے خبر دی کہ نواب جہانگیر خاں اور نواب قدسیہ بیگم کے قتل کی سازش کی گئی ہے۔ اس معاملے میں کچھ لوگ گرفتار کر کے لائے گئے ہیں رسم فاتحہ کے بعد قدسیہ بیگم اپنے محل کو چلی گئیں اور کالے خاں کو حکم دیا کہ وہ نواب جہانگیر خاں کی حفاظت کے لئے دستہ مقرر کریں۔ نواب قدسیہ کے حکم سے کئی سازشیوں کو بھوپال شہر سے نکال دیا گیا تھا۔ 1253ھ مطابق 1837ء میں گورنر جنرل صاحب بہادر کے حکم سے نواب قدسیہ بیگم نے ریاست بھوپال کا اقتدار

نواب جہانگیر محمد خاں کو تفویض کر دیا۔ نواب قدسیہ بیگم کا دور ریاست کے لئے بہت قیمتی ثابت ہوا۔ انہوں نے مسلمانوں اور ہندوؤں کو خوب نوازا۔ غریبوں کے لئے لنگر خانے کھولے ہندوؤں کو غذا کا کچا سامان مفت فراہم کرنے کا انتظام کیا۔ محکمہ آب رسانی قائم کیا اور پانچ ہزار روپے کی خطیر رقم خرچ کر کے گھر گھر نلکے لگوائے۔ ایک انگریز مسٹر کک کو اس کام پر مامور کیا۔ سڑکوں پر بھی نل لگائے گئے جس سے عام لوگوں کو کافی سہولت ہوگئی۔ بھوپال کو کھنڈوہ اور آگرہ سے ملانے کے لئے ریلوے لائن کی تعمیر کا کام شروع کرایا گیا۔ بیگم صاحبہ جو بڑی سرکار کے نام سے عوام میں مقبول تھیں کا سب سے اہم کارنامہ 1832ء میں شہر کی سب سے بڑی جامع مسجد کی تعمیر تھا جس کی تعمیر آپ کے زمانے میں شروع ہوئی اور 25 سال بعد 1857ء میں مکمل ہوئی۔

نواب جہانگیر محمد خاں

آپ کا دور 1837ء میں شروع ہوا اور سات سال بعد 1844ء میں اختتام پذیر ہوگیا۔ اسد علی خاں ماموں ان کے نائب ریاست اور میر واصل علی وکیل مقرر ہوئے۔ چند روز تک میاں بیوی میں خوب بنی پھر آپس میں ناراضگی ہوگئی جس کی وجہ سکندر بیگم کی بے پردگی تھی جہانگیر محمد خاں ایک پٹھان تھے اور پٹھان خواتین کے پردے کے سلسلے میں بہت سخت ہوتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے بیگم صاحبہ کو تنبیہ کی مگر نہ ماننے پر ان کے ہاتھ پر تلوار ماردی زخم ایسا ہوا کہ چار ٹانکے آئے جب زخم صحیح نہ ہوا تو اسلام نگر منتقل ہوگئیں اور وہاں سے منشی جمال الدین خاں کو اندور بھیجا جہاں سے وہ محمد شفاعت جراح کو علاج کے لئے اسلام نگر لائے۔ ان کی دوا سے زخم صحیح ہوگیا۔ نواب جہانگیر خاں نہایت غیرت مند اور سخی تھے ان کی سخاوت کی وجہ سے غریبوں کو کافی مالی امداد مہیا ہوئی۔ انہوں نے 1256ھ میں بھوپال میں جہانگیر آباد محلے کی بنیاد ڈالی جس شخص نے وہاں مکان بنایا اس کو خزانے سے روپیہ عنایت کیا۔ انہوں نے اہل علم و ہنر کی قدردانی کی۔ عین عالم شباب میں معدہ کی بیماری میں مبتلا ہوگئے۔ حکیم وارث علی خاں نے ان کا ہر طرح علاج کیا مگر کوئی افاقہ نہ ہوا۔ نواب سکندر بیگم جو ان سے ناراض تھیں نے اسلام نگر سے آکر ان کی عیادت کی بالآخر 28 ذیقعد 1260ھ کو صرف 26 سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ ان کے عہد میں غلے کی بہت ارزانی تھی۔ گندم ایک روپے میں 80 سیر تک فروخت ہوتی تھی۔ دیگر اشیائے ضروریہ بھی بہت سستی تھیں۔ علم کو فروغ دینے کی وجہ سے بھوپال کے لوگوں میں حصولِ علم کا جذبہ بیدار ہوا۔

نواب سکندر بیگم

نواب جہانگیر محمد خاں کے انتقال کے بعد ریاست کا انتظام چلانے کے لئے سکندر بیگم کو والیٔ ریاست مقرر کیا گیا اس لئے کہ ان کی بیٹی شاہجہاں بیگم ابھی نابالغ تھیں گوکہ قانونی طور پر جہانگیر محمد خاں کی اولاد کو ہی والیٔ ریاست ہونا چاہیے تھا مگر شاہجہاں بیگم کی کم سنی کی وجہ سے سکندر بیگم کو یہ بار اپنے کندھوں پر اٹھانا پڑا۔ انہوں نے ریاست کو آئینی ریاست بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ریاست کا نظم و نسق باقاعدہ طور پر چلانے کے لئے مختلف محکمے قائم کئے، عہدوں کی جدید تنظیم کی۔ فوجی افسروں کو پہلے جاگیریں عطا کی جاتی تھیں جن سے وہ اپنا خرچ چلاتے تھے مگر آپ نے جائیداد اور جاگیروں کی بجائے انہیں تنخواہیں دینے کا سلسلہ رائج کیا۔ آپ نے قواعد جنگ کی تعلیم کا انتظام کیا۔ توپ خانے کو باقاعدہ بنایا۔ ریاست کی ضروریات کے لئے مطبع خانہ قائم کیا جسے مطبع سکندری کا نام دیا گیا۔ اور فارسی کی بجائے اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا۔ ریاست حیدر آباد میں اس کے 24 سال بعد 1884ء میں اُردو کو سرکاری زبان قرار دیا گیا تھا۔ آپ نے بھوپال میں کئی نئی سڑکیں تعمیر کرائیں اور پرانی سڑکوں کو چوڑا اور پکا کرایا۔ بعض سڑکیں اتنی تنگ تھیں کہ ان سے صرف ایک گھڑ سوار ہی نکل سکتا تھا انہیں کشادہ کرانے کے علاوہ خاص شاہراہوں پر ہر پچاس گز کے بعد ستونوں پر روغنی لیمپ (ہنڈے) نصب کرائے۔ گلی کوچوں میں مٹی کے تیل کی لالٹینیں لگوائیں جو رات کے اندھیرے میں روشنی دیتی تھیں۔ آپ کے دور میں 1857ء میں جنگ آزادی شروع ہوئی اسے انگریزوں نے غدر کا نام دیا تھا۔ اس میں نوابین ریاست اور رؤسائے

ہند کی اکثریت نے کمپنی بہادر کا ساتھ دیا تھا، ریاست بھوپال میں بھی انبا پانی سیہور اور خود بھوپال شہر میں بغاوت کے آثار ظاہر ہوئے مگر سکندر بیگم انگریزوں سے مختلف معاہدات میں جکڑے ہونے کی وجہ سے اپنی ریاست میں انگریزوں کی خلاف بغاوت کو کچلنے میں مصروف رہیں۔ سکندر بیگم نے غدر کے خاتمے کے بعد دہلی کی جامع مسجد کے اصطبل کے طور پر استعمال کو ختم کرایا وہاں پھر سے پنج وقتہ نماز بحال ہوگئی۔ آپ نے خود پہلے نماز پڑھی اور پھر مسجد کو مسلمانوں کے سپرد کر دیا۔ جب سکندر بیگم حج کے لئے گئیں تو وہاں سے ایک عالم دین زین العابدین صاحب کو اپنے ساتھ لائیں اس سے پہلے ان ہی کے چچازاد بھائی شیخ حسین بن محسن الیمانی بھوپال تشریف لا چکے تھے۔ آپ نے زین العابدین صاحب کو قاضی ریاست مقرر کیا، نواب شاہ جہاں بیگم کا نکاح انہوں نے ہی پڑھایا تھا۔ اس سلسلے میں انہیں ایک کیسہ اشرفی اور ایک ہاتھی عطا کیا گیا تھا۔ انہوں نے ہاتھی کو رکھنے سے معذرت کر لی تھی چنانچہ بیگم صاحبہ نے انہیں جاگیر میں دو گاؤں عطا کئے تھے۔ نواب سکندر بیگم نے 1860ء سے 1868ء تک ریاست کی خدمت کی اور بعد میں شاہجہاں بیگم کی شادی کے بعد ریاست کا اقتدار شاہجہاں بیگم کو سونپ دیا۔

☆☆☆

نواب شاہجہاں بیگم

جب شاہجہاں بیگم کی عمر شادی کے لائق ہوگئی سکندر جہاں بیگم نے بذریعہ پولیٹیکل ایجنٹ گورنر جنرل بہادر کو یہ عرض داشت بھیجی کہ بیٹی کی اب شادی ہو جانا چاہیے جس پر گورنر جنرل صاحب نے سکندر بیگم کو اختیار دے دیا کہ وہ ریاست کے اندر اور باہر سے کوئی لڑکا پسند کرلیں۔ چنانچہ قرب و جوار کی ریاستوں اور خود بھوپال کے پڑھے لکھے نوجوان قسمت آزمائی کے لئے سکندر بیگم کے روبرو پیش ہونے لگے۔ آپ نے ان درجنوں نوجوانوں میں سے صرف چھ نوجوانوں کو منتخب کرلیا۔ اس کے بعد گورنر جنرل کو خبر کی گئی کہ چھ نوجوانوں کو پسند کرلیا گیا ہے۔ گورنر جنرل نے جواب بھیجا کہ وہ اس میں سے کوئی ایک پسند کرلیں۔ سکندر بیگم کو ان تمام میں باقی محمد خاں نصیر جنگ لائق اور شریف لگے۔ وہ ریاست بھوپال کے ہی باسی تھے۔ پھر سکندر بیگم نے گورنر جنرل کے سامنے یہ مسئلہ پیش کیا چونکہ منتخب نوجوان شاہی خاندان سے نہیں ہے اس لئے شاہجہاں بیگم کو والی ریاست رکھا جائے جبکہ باقی محمد خاں نصیر جنگ کو شاہجہاں بیگم کا نائب مقرر کیا جائے۔ گورنر جنرل نے یہ بات مان لی ساتھ ہی سکندر بیگم کو شادی کے بعد بھی شاہجہاں بیگم کی نائب اور مشیر ہونے کی منظوری دے دی۔ 1271ھ میں شاہجہاں بیگم کا نکاح باقی محمد خاں نصیر جنگ سے ہوگیا اس کے ساتھ ہی شاہجہاں بیگم ریاست کی والی مقرر ہوگئیں۔

شاہجہاں بیگم نے اپنے دور میں کئی کارنامے انجام دیئے انہوں نے غریبوں کی دادرسی کے لئے انتظامات کیئے، ریاست کو ترقی دینے کے لئے بھی کئی اقدامات

کیے، نواب سکندر بیگم کے زمانے میں ڈاک کا نظام صرف سرکار تک محدود تھا آپ نے اسے ترقی دے کر ہر تحصیل اور تھانے تک وسیع کیا تا کہ رعایا بھی ڈاک کے نظام سے مستفید ہو سکے۔ آپ نے پوری ریاست میں ڈاک خانے قائم کیے اور سرکاری ڈاک کے لئے علیحدہ سے ریاستی ٹکٹ جاری کیے۔ انہوں نے ریاست بھوپال کا اپنا سکہ جاری کیا ایک مطبع شاہجہانی کے نام سے قائم کیا۔ آپ ہی کے دور میں ریاست سے پہلا اخبار ''عمدۃ الاخبار'' کے نام سے جاری ہوا۔ اس کے ایڈیٹر مشہور صحافی حکیم اصغر حسین تھے۔ ایک ایلو پیتھک اسپتال قائم کیا جس کا افتتاح وائسرائے کی بیوی لیڈی لینڈو سے کروایا۔ انگریزی تعلیم کے لئے جہانگیریہ اسکول قائم کیا اور شاہجہاں آباد میں سات لاکھ روپے کے سرمائے سے روئی دھننے کا ایک کارخانہ قائم کروایا۔ اس کارخانے میں دو سو سے زائد مرد اور عورتیں ملازم تھیں۔ آپ نے ایک آٹا پینے کی مشین بھی لگوائی تھی۔ آپ نے شاہجہاں آباد آباد کرایا یہ پلاننگ کے تحت آباد کیا گیا تھا۔ اس میں مختلف محلات مثلاً تاج محل، عالی منزل، سرخ محل، سبز محل وغیرہ تعمیر کرائے۔ 1881ء میں آپ نے تاج محل میں رہائش اختیار کی اور تاج محل کی تیاری کا جشن بڑے دھوم دھام سے منایا گیا۔ غربا کو کھانا کھلایا گیا، خواص کو طعام کے بعد مرجانی اور مقشی ہار اور سونے چاندی کے ورقوں میں لپٹی ہوئی پان کی گلوریاں تقسیم کی گئیں۔ محل میں ایک مکان ساون بھادوں کے نام سے بنایا گیا اس کے جشن میں خادموں اور خواصوں کو زعفرانی جوڑے دیئے گئے۔ خواص کو رنگ سے بھرا ہوا ایک چاندی کا کٹورا، خاص دان اور ایک پچکاری دی گئی۔ اعلیٰ شخصیات کی پچکاری سونے کی تھی اندرون محل ایک مینا بازار اور اس کے ایک حصے میں پری بازار لگایا جہاں صرف خواتین کی دکانیں تھیں۔ تاج محل کے بالکل برابر ان کا ارادہ ایک مسجد تعمیر کرنے کا تھا۔ اگر یہ ان کے منصوبے کے مطابق تیار ہو جاتی تو تاج المساجد دنیا کی ایک نادر مسجد ہوتی مگر یہ ادھوری ہی رہ گئی۔ اس کا رقبہ دہلی کی جامع

مسجد سے بڑا ہے۔ اس کے فرش، مینار اور گنبد کے لئے بلوری ٹائل منگوائے گئے تھے مگر علماء نے فتویٰ دیا کہ بلوری فرش پر نماز جائز نہیں ہے۔ لہٰذا اس میں سرخ پتھر لگایا گیا۔ اس کے دو دروازے بہت بلند رکھے گئے۔ اس کے ایک طرف موتیا تالاب تھا جو اس مسجد کا حوض معلوم ہوتا تھا۔ اس پر آپ نے پندرہ سولہ لاکھ روپے خرچ کئے مگر ان کی زندگی میں اس کی تعمیر مکمل نہ ہوسکی۔ یہ مسجد کوئی ستر سال سے اوپر کسمپرسی کے عالم میں پڑی رہی بالآخر ایک مرد مجاہد محمد عمران خاں ندوی نے ہمت باندھی اس نے مصیبتیں، مشقتیں اور ریاضتیں جھیل کر اپنوں اور غیروں سے لاکھوں روپیہ جمع کر کے اس مسجد کو مکمل کرایا۔ شاہجہاں بیگم نے تاج محل کے عقب میں واقع پہاڑی پر عیدگاہ تعمیر کرائی جس میں خواتین کے لئے بھی ایک حصہ وقف تھا۔ اس میں ایک طرف عیدالضحیٰ پر اونٹ کو نحر کرنے کی جگہ بھی بنوائی گئی تھی اپنی مرحومہ نواسی کی یاد میں مدرسہ سلیمانیہ تعمیر کرایا جس کا نام اورینٹل سلیمانیہ اسکول رکھا گیا اس کا الحاق کلکتہ یونیورسٹی سے کیا گیا۔ ہمایوں منزل کے برابر والے حصے میں لڑکیوں کے لئے وکٹوریہ اسکول قائم کیا گیا۔ دور شاہجہانی ریاست بھوپال کے لئے ایک مثالی دور ثابت ہوا اس دور میں ریاست کا صحیح امیج ابھر کر سامنے آیا۔

مشہور مصنفہ، شاعرہ اور سابق قومی مجلس شوریٰ پاکستان کی ممبر محترمہ قمرالنساء قمر اپنے ایک مقالے میں نواب شاہ جہاں بیگم کے بارے میں لکھتی ہیں:

نواب شاہجہاں بیگم ریاست بھوپال کی نامور خاتون حکمران تھیں جنہوں نے کم عمری میں ریاست کی ذمہ داریوں کا بارِ گراں سنبھالا تھا۔ جب پورا ہندوستان انگریزوں کے تسلط میں آچکا تھا اور 1857ء کی جنگ آزادی نے مسلمانوں کو ناکامی کے ساتھ تباہ حال کر دیا تھا صدیوں کے بسے بسائے گھر کیا شہر تک اجڑ چکے تھے لوگ دربدر ہو کر رہ گئے تھے جائے امان اور روزگار کی تلاش میں نگر نگر پھر رہے تھے جدھر ذرا

سی امید کی کرن نظر آتی ادھر ہی دوڑے چلے جاتے۔ پورے برصغیر کے حالات ابتر تھے
مگر ایسے دورِ پرفتن میں وندھیا چل کے پہاڑوں میں گھری ہوئی ریاست بھوپال زمانے
کی گردش اور جنگ آزادی کے حوادث سے کچھ نہ کچھ محفوظ تھی یہاں اتنا ضرور تھا کہ
لٹے پٹے مسلمان جو فکر معاش اور سکون کی تلاش میں بھوپال کی طرف آتے ملکہ کی طرف
سے انہیں حوصلہ دیا جاتا اور روزگار فراہم کیا جاتا۔ بھوپال کی پرسکون فضاؤں کا اس سے
بڑھ کر ثبوت کیا ہوگا کہ جتنا علمی اور تحقیقی کام نواب شاہجہاں بیگم کے دور میں ہوا وہ نہ تو
ان سے پہلے ہوا اور نہ بعد میں۔ بڑے بڑے عالم، مشاہیر، دانشور، فضلاء، شعراء،
ادیب اسی دور میں ملکہ کی جانب سے بے انتہا حوصلہ افزائیوں اور فکر معاش کی بندشوں
سے آزاد ہو کر نہایت بے فکری اور سکون کے ساتھ دینی، علمی اور تحقیقی خدمات انجام
دیتے رہے۔ تبلیغ دین پر بھی نواب شاہجہاں بیگم کی بھرپور توجہ تھی آپ دین اسلام پر سختی
سے کاربند تھیں۔ خود بھی کئی کتابوں کی مصنفہ تھیں۔ بھوپال کی آخری خاتون حکمران
نواب سلطان جہاں جو آپ کی بیٹی تھیں نے بھی کئی کتابیں تصنیف کی تھیں۔

دین سے آپ کی محبت کا عالم یہ تھا کہ بھوپال علماء، فضلاء کا زبردست مرکز بن
گیا تھا۔ بیگم صاحبہ کا دور مشرقی تہذیب وتمدن اور تعمیر وترقی کا دور تھا ان کے دور میں
بھوپال میں وسیع تعمیرات ہوئیں آپ کو مساجد تعمیر کرانے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔
یہ اعزاز بھی شاہ جہاں بیگم کو ہی جاتا ہے کہ وہ برصغیر کی پہلی خاتون حکمران ہیں جنہوں
نے 1889ء میں اپنے سفر برطانیہ کے دوران لندن (سرے) میں مسلمانوں کے لئے
پہلی مسجد شاہجہانی تعمیر کرائی۔ قمر النساء نے مولانا وہاج الدین چشتیؒ کی تصنیف ''بیگماتِ
بھوپال'' سے شاہجہاں بیگم کی ذاتی زندگی کا ایک ناقابل فراموش واقعہ نقل کیا ہے جو بیگم
صاحبہ کے ذہنی وروحانی اسلامی جذبہ سے سرشار میلانات کا پتہ دیتا ہے۔ شہر کی آبادی
سے ملحق سلسلہ نقشبندیہ کے اس دور کے مشہور ومعروف بزرگ حضرت شیخ کامل پیر ابو

احمد صاحبؒ کی خانقاہ تھی جس کے در و دیوار سے تقدس پھوٹتا تھا۔ یہاں بھوپال کا ہر مرد و زن بچہ و بوڑھا اس آستانے کو شمعِ رحمت اور چراغ رحمت محسوس کرتے ہوئے پروانہ وار نثار ہو جانے کو اپنی خوش قسمتی سمجھتا تھا۔ صبح چاشت کی نماز کے بعد ظہر تک شیخ کی خانقاہ میں حاضری دینے والوں اور حصولِ علم کے لئے آنے والوں کا ہجوم رہتا تھا۔ ان اوقات کے علاوہ صرف وہ لوگ اس طرف قدم بڑھانے کی جسارت کرتے تھے جو مقربین یا متوسلین شیخ تھے تہجد کی نماز کے بعد ذکر و فکر اور مجاہدات کی محفل گرم رہتی تھی اور فجر طلوع ہونے کے بعد وہیں فجر کی نماز با جماعت ادا کی جاتی۔ اس کے بعد شیخ خانقاہ کے اپنے خصوصی حجرے میں داخل ہو جاتے اور اہل حلقہ اپنے گھروں کو واپس چلے جاتے تھے۔ اِکا دُکا خادم وہیں خانقاہ کے کونے کھدرے میں پڑ جاتے تھے۔ عین ایسے وقت میں روزانہ ایک حسین و جمیل نوجوان بیوہ سادہ کپڑوں میں ملبوس ایک چادر میں اچھی طرح لپٹی ہوئی آہستہ آہستہ محتاط قدموں سے ڈرتی دبکتی خانقاہ میں داخل ہوتی جھاڑو اُٹھا کر پوری خانقاہ میں جھاڑو دیتی۔ صحن میں لگے درختوں میں پانی ڈالتی، پینے کے پانی کے مٹکے بھرتی اور پھر جس طرح دبے پاؤں آتی ویسے ہی ہولے ہولے قدموں سے باہر نکل جاتی تھی تاکہ شیخ کو اس کی موجودگی کی خبر نہ ہو سکے۔ جب کبھی شیخؒ کی اس نوجوان بیوہ پر نظر پڑتی وہ اسے تلخ و درشت لہجے میں ڈانٹ کر باہر نکال دیتے اور آج پھر کوئی ناگہانی آہٹ ہوئی اور شیخ اپنے حجرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئے بیوہ نے گھبرا کر جھاڑو وہیں زمین پر چھوڑ دی اور کھڑی ہوگئی۔ غبار آلود چہرہ جو کام کرنے کی وجہ سے کھلا ہوا تھا لرزتے ہاتھوں کے سہارے چادر سے اچھی طرح ڈھانپ لیا۔ شیخ نے فرمایا میں نے آپ سے کتنی دفعہ عرض کیا کہ فقیر کی خانقاہ میں تشریف نہ لایا کریں۔ اس سے قبل دروازے کے کھلنے کی آہٹ کے ساتھ ہی وہ باہر نکل جاتی تھی لیکن آج اس کے پیر بھاری ہوگئے ایسا محسوس ہوا کہ زمین نے قدموں کو جکڑ لیا تھا اور وہ ہل بھی نہ سکی جسم

ساکت ہوگیا۔ زبان گنگ ہوگئی مگر آنکھیں مچل گئیں۔ بڑی بڑی آنکھیں ڈبڈبا گئیں، ہچکیوں نے جیسے بند توڑ دیا اور آنسوؤں کا دریا بہہ نکلا اور اس کے دھارے نے ایسا زور پکڑا کہ شیخ کے جلال کو بھی بہا لے گیا۔ خوف سے لرزتا ہچکیوں سے ہلتا سراپا احتجاج کر رہا تھا کہ اس بیوہ کو اس تھوڑے سے نیک کام سے کیوں محروم کیا جا رہا ہے؟ شیخ خانقاہ کی شفقت ان کے جلال پر غالب آ گئی۔ شیخ خانقاہ کی حالت متغیر ہوگئی۔ انہوں نے نہایت شفقت اور انتہائی نرم انداز میں فرمایا ''آپ پہلے کسی سے نکاح کریں اس کے بعد آپ کو میری خانقاہ میں آنے کی اجازت ہے۔ ہچکیاں رک گئیں، آنسو تھم گئے، سینہ خوشی سے پھول گیا، دل زور زور سے دھڑکنے لگا، پیر ہلکے ہوگئے۔ وہ سلام کر کے تیز تیز قدموں سے باہر آ گئی۔ چہرہ بدستور ڈھکا رہا لیکن خانقاہ سے باہر آتے ہی اس کی چال میں فرق آ گیا۔ اب اس کی چال سے وقار و تمکنت برس رہا تھا جیسے کسی ملکہ کا ورود ہو رہا ہو جس کا رعب و دبدبہ چہرے پر پڑے نقاب سے چھن چھن کر پوری فضا کو ساکت و مبہوت کیے ہوئے تھا۔ وہ ابھی شاہانہ کروفر سے چند قدم ہی چلی تھی کہ شاہی سواری کی بگھی اور محافظ دستہ آن پہنچا جو خانقاہ سے دور کھڑا ہوا اس کے آنے کا منتظر تھا۔ وہ سوار ہوگئی اور سواری محلات شاہی کی طرف روانہ ہوگئی۔ یہ حسین بیوہ بھوپال کی فرمانروا شاہجہان بیگم تھیں۔

آپ نے 57 برس تک حکومت کی آپ کا دور 1844ء میں شروع ہوا اور 1901ء میں اختتام پذیر ہوگیا۔

☆☆☆

نواب سلطان جہاں بیگم

آپ کو کیخسرو سلطان جہاں بیگم کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ آپ یکم مئی 1860ء مطابق 9 شوال 1276ھ میں نواب شاہ جہاں بیگم کے بطن سے پیدا ہوئیں۔ 17 نومبر 1868ء کو آپ کو گورنر جنرل ہند کے ایجنٹ کی جانب سے خلعت ولی عہدی عطا کیا گیا۔ اور آپ کی والدہ شاہ جہاں بیگم کو خلعت صدارت عطا کی گئی اور سلطان جہاں کی کمسنی کی وجہ سے انتظام حکومت چلانا آپ کے ذمے رہا۔ جس کے جواب میں شاہ جہاں بیگم نے گورنر جنرل کے علاوہ ملکہ معظّمہ وکٹوریہ کا شکریہ ادا کیا اس خوشی میں توپ کے گولے داغ کر سلامی پیش کی گئی ساتھ ہی ارکان ریاست نے نذرانے پیش کئے۔ شاہ جہاں بیگم نے دعا کی کہ جس طرح ان کی والدہ سکندر بیگم نے اپنی پوری زندگی سرکار انگلشیہ کی خیرخواہی اور عوام الناس کی خدمت میں گزاری اسی طرح وہ بھی اپنی زندگی گزاریں گی۔ اس موقع پر شاہجہاں بیگم نے دربار میں تقریر بھی کی جس میں سرکار انگلشیہ اور ملکہ معظّمہ وکٹوریہ کی بندہ پروری کی دل کھول کر تعریفیں کی گئیں۔ ساتھ ہی کاروبارِ حکومت کو عوام کی فلاح و بہبود کے لئے وقف کرنے کا اعلان کیا گیا۔

اس وقت بھوپال شہر میں غلہ کی گرانی تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ سکندر بیگم کے زمانے میں کسانوں کو پابند کیا گیا تھا کہ وہ جو غلہ شہر میں لائیں گے اس پر پورا ٹیکس لیا جائے گا البتہ جو انگریز چھاؤنیوں میں جائے گا اس پر نصف ٹیکس لیا جائے گا۔ یہ کسانوں کے لئے ایک بڑا بوجھ تھا چنانچہ انہوں نے بھوپال شہر میں غلہ لانا کم کر دیا تھا۔ شاہجہاں

بیگم نے اپنی والدہ کے احکامات کو ہٹا لیا اور بھوپال شہر میں غلہ لانے پر محصول معاف کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد بھوپال شہر میں غلے کی فراوانی کے علاوہ غلہ سستا بھی ہو گیا۔ حکومت کی جانب سے یہ احکامات 10 فروری 1869ء کو جاری کئے گئے تھے۔ فوج، پولیس اور دوسرے سرکاری محکموں کو کم تنخواہوں کے ملنے کی شکایت ایک عرصے سے چلی آ رہی تھی آپ نے ان کے حالات کا جائزہ لینے کے بعد ان کی تنخواہوں میں اضافہ کر دیا۔ آپ نے بذریعہ اشتہار ریاست کے تمام سرکاری اہلکاروں کو متنبہ کیا کہ انہیں کسی شہری سے رشوت نہیں لینا چاہئے اور اگر کوئی اہلکار رشوت لیتا ہوا یا کسی کے خلاف شکایت آئی اور رشوت لینا ثابت ہو گیا تو اسے فوری طور پر نوکری سے برخاست کر دیا جائے گا، ساتھ ہی مناسب سزا بھی دی جائے گی۔ آپ نے لگان کے سلسلے میں سرکاری اہلکاروں کو احکامات جاری کئے کہ کوئی بھی اہلکار کاشت کاروں سے مقررہ لگان سے زیادہ رقم وصول نہ کرے اور کسی نے زیادہ لگان وصول کی ہو تو وہ فوراً واپس کر دے۔ آپ نے اس دوران دسمبر 1869ء میں ملکہ کٹوریہ کو تہنیتی خط بھیجا اور اس کے جواب میں لندن سے معقول جواب آیا اس کے بعد آپ کو دورۂ کلکتہ کی دعوت دی گئی۔ آپ دسمبر 1869ء میں کلکتے کے لئے روانہ ہوئیں کچھ سفر ریل اور کچھ دریاؤں سے کرتی ہوئیں کلکتہ پہنچ گئیں۔ وہاں گورنر جنرل ہند سے ملاقات کی ساتھ ہی کلکتہ کی سیر کی وہاں فورٹ ولیم کالج و عجائب گھر کا دورہ کیا۔ اس وقت جنوری 1870ء میں کلکتہ کی کل آبادی چار لاکھ پچاس ہزار تھی جب کہ پورے برصغیر کی آبادی چوبیس کروڑ ایک لاکھ تھی اس وقت امریکہ کی کل آبادی سات کروڑ آٹھ لاکھ تھی۔ اس سفر میں جو اخراجات ہوئے تھے وہ ایک لاکھ ستاسی ہزار نو سو روپے پونے بارہ آنے تھے۔ ان اخراجات میں سفری اخراجات کے علاوہ کلکتہ میں انگریز حکام کو پیش کئے گئے تحائف اور اہلکاروں کو دی گئی بخشش کے اخراجات بھی شامل تھے۔ آپ نے سکہ جاری کیا البتہ اوزان اور ناپنے

کے پیمانے پہلے والے رہے۔ انتظامی و قانونی معاملات میں اصلاحات کی گئیں۔ مالی امور سے متعلق مقدمات کے فیصلے کے لئے مختلف سرکاری افسران کا تقرر کیا گیا تا کہ لوگوں کے مالی معاملات سے متعلق تنازعات کے انصاف کے ساتھ فیصلے ہوسکیں۔ گورنر جنرل کی جانب سے آپ کو عقد ثانی کے لئے کہا گیا تا کہ ریاست کے انتظام کو چلانے میں شوہر کی مدد حاصل ہو سکے۔

شاہجہاں بیگم شریعت پر چلنے والی خاتون تھیں۔ آپ کے شوہر انتقال کر گئے تھے۔ اسلام میں عقد ثانی کی اجازت دی گئی ہے آپ نے پہلے تو کبھی عقد ثانی کے لئے نہیں سوچا تھا مگر گورنر جنرل کے مشورے کے بعد اس امور پر غور کرنا شروع کیا اور بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچ گئیں کہ ان کے لئے عقد ثانی مفید رہے گا۔ اس وقت ان کے منشی سید محمد صدیق حسن خاں تھے وہ نہایت شریف اور اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ پھر حکومتی امور کے سلسلے میں ان سے مشورہ بھی کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ آپ نے ان کا انتخاب کر لیا اور جون 1871ء میں ان کے ساتھ آپ کا نکاح ہو گیا۔ اس کے بعد بیگم صاحبہ نے انگریز سرکار کو خط لکھا کہ چوں کہ انہوں نے گورنر جنرل کے مشورے کے مطابق عقد ثانی کر لیا ہے چنانچہ ان کے شوہر کو شایان شان خطاب عطا کیا جائے۔ انگریز سرکار نے انہیں نواب والا جاہ امیر الملک کا خطاب عطا فرمایا۔ نکاح کی خوشی میں شہر کے تمام محتاجوں کو کھانا کھلانے کے علاوہ معززین شہر اور اعلیٰ مرتبے کے حامل اہلکاران ریاست کی شاندار دعوت کی گئی۔

انصاف کے تقاضوں کے مطابق جو قوانین بنائے گئے اس کی رو سے طوائفوں کو پابند کیا گیا کہ ان کے ہاں جو لڑکیاں ہیں انہیں اپنی پسند کے مطابق شادی کرنے سے نہ روکا جائے البتہ شادی کے بعد وہ اپنے زیورات اور دیگر اسباب نائکہ کے پاس چھوڑ کر جائیں تا کہ اس کا حق پرورش ادا ہو سکے۔ جب کلکتہ سے ڈیوک آف ایڈن ملکہ

عالیہ وکٹوریہ سے ملاقات کرنے لندن جانے لگے تو ولی عہد سلطان جہاں بیگم نے ان کے لئے ہنر مندی اور دست کاری کے بہترین نمونے بھیجے۔ جب نمونے لندن ملکہ وکٹوریہ کے روبرو پیش کئے گئے انہوں نے انہیں بہت پسند کیا۔نومبر 1872 ء میں ملکہ معظّمہ کی جانب سے ایک خط موصول ہوا کہ وہ بیگم شاہجہاں و دیگر والیانِ ریاست کو ان کی وفاداری کے عوض اسٹار آف انڈیا کا خطاب عطا فرمائیں گی جو کہ وائسرائے ہند صاحب لندن سے بمبئی پہنچ کر عطا کریں گے۔اس دعوت نامے کے بعد نواب شاہجہاں بیگم، سلطان جہاں بیگم اور دیگر اعلیٰ منتخب ارکان بمبئی کے لئے روانہ ہوئے۔ پانی کے جہاز سے جب وائسرائے ہند صاحب بمبئی تشریف لائے تو تمام والیانِ ریاست نے ان کا استقبال کیا اور ان کے محل میں مختصر ملاقات کی۔ اگلے دن وائسرائے نے تمام والیانِ ریاست کو اسٹار آف انڈیا کا خطاب عطا فرمایا اور ان کی وفاداری کی تعریف کی۔ اس موقع پر نواب شاہ جہاں بیگم نے سب کے سامنے ایک شاندار تقریر کی جس میں انگریز سرکار اور خصوصاً ملکہ وکٹوریہ کی دل کھول کر تعریف کی گئی۔آپ نے تمام والیانِ ریاست جو وہاں موجود تھے کو کہا کہ وہ ملکہ معظّمہ کا دل سے شکر ادا کریں کیوں کہ انہی کی وجہ سے ہماری ریاستیں قائم و دائم ہیں اگر ان کی فوجیں ہماری مدد نہ کرتیں تو ہمارے دشمن کبھی کا ہمیں نیست و نابود کر چکے ہوتے۔آپ نے گورنر جنرل سے درخواست کی کہ وہ ان کی تقریر کو ملکہ معظّمہ تک پہنچا دیں۔آپ کے پورے دور میں ریاست بھوپال کے انگریزوں کے ساتھ انتہائی دوستانہ تعلقات قائم رہے۔انگریز سرکار آپ کی ریاست پر خاص مہربان رہی کیوں کہ ریاست بھوپال نے 1857 ء کی جنگ آزادی کے زمانے میں انگریزوں کی خصوصی طور پر مدد کی تھی۔ ریاست بھوپال کے ہندو مسلمان آزادی پسندوں کو سرے عام پھانسیاں دیں یا انہیں گولیوں سے اڑوا دیا گیا۔آپ کے دور میں بھوپال میں ریلوے لائن پڑی اور پھر بھوپال کا براہ راست کلکتہ اور دہلی سے رابطہ ممکن

ہوگیا۔ آپ کا 1901ء میں انتقال ہوگیا۔ ان کے بعد سلطان جہاں بیگم جو اس وقت تک ولی عہد تھیں ریاست کی سربراہ مقرر ہوئیں۔ آپ بھی والدہ کے نقش قدم پر چلتی رہیں اور انگریزوں کی خیر خواہی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ آپ نے کم وبیش 26 سال تک ریاست کی خدمت کی۔ آپ کے تین بیٹے تھے۔ جن میں حمیداللہ خاں سب سے چھوٹے تھے۔ دونوں بڑے بیٹوں کے انتقال کی وجہ سے حمیداللہ خاں ریاست کے ولی عہد بنے جب 1926ء میں سلطان جہاں بیگم کی وفات ہوئی تو حمیداللہ خاں ریاست کے نواب مقرر کئے گئے۔

سلطانی دور میں تعمیرات:

آپ نے اپنے دور میں بھوپال شہر میں بہت سی نئی تعمیرات کروائیں جن میں مساجد اور سرکاری دفاتر و رہائشی محل شامل ہیں۔ انہوں نے اپنے پرانے محل میں جہاں وہ ولی عہدی کے زمانے میں رہائش پذیر تھیں آصفیہ نام کی مسجد تعمیر کرائی جہاں وہ اندرونی راستے سے نماز جمعہ ادا کرنے جاتی تھیں۔ ریاست کی سربراہ بننے کے بعد حضرت شاہ ضیاالدینؒ کی ٹیکری کو صحت افزاء مقام کے طور پر منتخب کر کے اسے آباد کیا اور اس کا نام اپنے مرحوم شوہر کے نام پر احمد آباد رکھا۔ یہیں آپ نے اپنی رہائش کے لئے قصر سلطانی اور مہمانوں کے لئے راحت منزل تعمیر کرائی۔ ان دونوں عمارتوں کے درمیان باغ کو "ضیا الابصار" کا نام دیا۔ قصرِ سلطانی میں ایک مسجد بنوائی جسے مسجد عبرت کا نام دیا اس کے آس پاس ملازمین خاص کے لئے مکانات بنوائے۔ پہاڑی کے اوپر سے بہنے والے پانی کے لئے ایک پل بنوایا اور اس کو شیریں ندی کا نام دیا۔ ندی اور تالاب کے سنگم پر ایک چھوٹا برقی اسٹیشن لگوایا جو محلات کو روشنی فراہم کرتا تھا۔ احمد آباد سے شہر آنے والے دونوں راستوں پر اعلیٰ عہدیداروں کے لئے بنگلے ریونیو کورٹ، پی

ڈبلیوڈی کا دفتر، ہائی کورٹ بلڈنگ جس کا پرنس آف ویلز ایڈورڈ ہشتم نے افتتاح کیا۔ اسی وقت ایک عالی شان لائبریری کی عمارت تعمیر کرائی گئی۔ جہانگیر آباد میں نیٹو ہال تعمیر کروایا جس کی خوبصورتی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ لال کوٹھی جسے دربار ہال کے طور پر استعمال ہونا تھا مگر ایسا نہ ہو سکا یہ کبھی فوجی ہیڈ کوارٹر تو کبھی اسکیٹنگ ہال کے طور پر استعمال ہوتی رہی۔

تعلیم کے فروغ کے لئے بیگم صاحبہ نے دوررس اقدامات اٹھائے۔ الیگزینڈر ہائی اسکول کی عمارت تعمیر کرائی یہ سنگ سرخ سے تعمیر کردہ ایک خوش نما عمارت ہے بدقسمتی سے اس میں کوئی اسکول تو نہ کھل سکا بعد میں اس عمارت کو ایڈورڈ میوزیم اور ہال کے طور پر استعمال کیا گیا۔ آپ کا قائم کردہ بے نظیر اسکول ایک اعلیٰ معیاری تعلیم گاہ تھی اس کا پرنسپل ایک انگریز تھا جو اسی اسکول کے ایک حصے میں رہائش پذیر تھا۔ اس میں طلباء کے لئے بھی رہائش کا انتظام تھا اس اسکول میں طلباء کا یونی فارم علی گڑھ کالج کی طرح تھا۔ طلباء کے یونی فارم میں چوڑے پائنچے کا پائجامہ، سیاہ شیروانی، نیلا صافہ، سیاہ موزے شامل تھے دراصل یہی بھوپال کا درباری لباس بھی تھا۔ اس اسکول کا 1914ء میں پہلے الٰہ آباد یونیورسٹی اور بعد میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے الحاق کر دیا گیا تھا۔

اپنے شوہر کے نام سے جامعہ احمدیہ قائم کیا، یہاں بنگال، پنجاب، صوبہ سرحد اور افغانستان سے طلبہ حصولِ علم کے لئے آیا کرتے تھے اور ریاست کے سازگار حالات دیکھ کر حصول علم کے بعد یہیں مستقل سکونت اختیار کر لیتے تھے۔ اپنے حافظ قرآن بیٹے کے نام سے عبیدیہ اسکول کھولا جہاں حفاظ اور قاری تیار کئے جاتے تھے اس اسکول کی دو منزلہ عمارت تاج محل کو جانے والی سڑک کے کنارے واقع تھیں۔ فروغ علم کے سلسلے میں لوئر مڈل کے معیار تک کے شہر میں چھ اسکول کھولے۔ ان میں ایک صنعت وحرفت سے متعلق بھی تھا۔ صحت کے شعبے کے فروغ کے لئے پھول محل میں یونانی طب کی درس

گاہ آصفیہ طبیہ کالج کے نام سے قائم کی جہاں طلباء کو ادویہ کی شناخت، دوا سازی اور آپریشن کرنا بھی سکھایا جاتا تھا۔ کالج کا ایک بورڈنگ ہاؤس بھی تھا۔ یہاں طلبہ کو وظیفے بھی دیئے جاتے تھے۔ آپ نے طالبات کے لئے سلطانیہ اسکول قائم کیا۔ 1920ء میں اس اسکول کی چار لڑکیاں الہ آباد یونیورسٹی کے مڈل امتحان میں شریک ہوئی تھیں۔ یہ بھوپال کی لڑکیوں کے لئے کسی یونیورسٹی کے امتحان میں شریک ہونے کا پہلا موقع تھا۔ بعد میں اس اسکول کا الحاق علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے کر دیا گیا تھا۔ آپ نے طب کے شعبے کو بہت اہمیت دی تھی 1911ء میں کوتوالی کی عمارت میں پرنس آف ویلز اسپتال قائم کیا۔ شاہجہاں آباد، جہانگیر آباد اور احمد آباد میں اسپتال قائم کئے۔ نرسوں کی تعلیم کے لئے بلقیسیہ نرسنگ ہوم اور ریت گھاٹ پر ہومیو پیتھک اسپتال قائم کیا۔ 1909ء میں سیڑھی گھاٹ پر پاور ہاؤس قائم کرایا جس سے احمد آباد سے لال کوٹھی تک کے تمام مکان روشن ہو گئے پھر دیگر علاقوں کے لوگوں کو بھی اجازت دے دی گئی کہ وہ بھی بجلی کے کنیکشن لے سکتے ہیں۔ اس زمانے میں بھوپال میں پہلا برف خانہ قائم ہوا۔ 1905ء میں خواتین کے لئے پرنس آف ویلز کلب قائم کیا جہاں کتابوں، اخباروں اور زنانہ کھیلوں کا سرکاری خرچ پر انتظام کیا جاتا تھا۔ یہاں جلسے بھی ہوتے تھے جن میں خواتین تقاریر کیا کرتی تھیں۔ 1914ء میں مینا بازار کا اضافہ کیا گیا جس میں عورتوں کی دستکاری کی دکانیں ہوتی تھیں اور وہی خرید و فروخت کیا کرتی تھیں۔ یہ کلب ریاست پر بھارت کے قبضے تک چلتا رہا۔

ڈاکٹر نفیس بانو نواب سلطان جہاں بیگم کے بارے میں لکھتی ہیں:

"آپ ہندوستان کے انقلاب پرور دور میں 9 جولائی 1858ء کو پیدا ہوئیں۔ نواب سلطان جہاں بیگم ایسا مبارک قدم لے کر آئیں کہ آپ کی نانی سکندر جہاں بیگم کو حکومت برطانیہ کی جانب سے جلیل القدر منصب اور اعزاز سے سرفراز فرمایا

گیا وہ اپنی نواسی کو بہت مبارک سمجھتی تھیں۔ آپ کا جشن ولادت نہایت دھوم دھام سے منایا گیا۔ نانی سکندر جہاں والد نواب امراء الدولہ باقی محمد خاں نصرت جنگ اور والدہ شاہ جہاں بیگم کی آغوش شفقت میں پروان چڑھیں۔ زندگی کی پانچویں منزل آئی تو 3 نومبر 1863 کو رسم بسم اللہ ادا کی گئی اور یکتائے روزگار اساتذہ کی نگرانی میں تعلیمی زندگی کا آغاز ہوا۔ اپنی خداداد ذہانت و ذکاوت سے جلد ہی اردو، فارسی، انگریزی اور پشتو میں مہارت حاصل کر لی ساتھ ہی مذہبی تعلیم کا بھی درس لیا۔ قرآن پاک پر اتنا عبور تھا کہ بات بات میں قرآنی آیات پڑھ دیا کرتی تھیں۔ خواجہ حسن نظامی نے ان کی وفات کے موقع پر کہا تھا ''مجھے ہندوستان کی کسی ایسی عورت کا علم نہیں جس کو قرآن مجید پر اتنا عبور ہو۔ وہ ارکانِ شریعت کی اتنی پابند تھیں کہ سفر و حضر نیز بیماری میں بھی نماز قضا نہ کرتیں۔ زیارت کعبہ اور سعادت حج سے بھی مستفید ہوئیں۔ ہمیشہ اسلامی پردے کو ملحوظ رکھا غیر مردوں سے مصافحہ کرنا پڑتا تو اس طرح کہ ہاتھ دستانوں میں چھپے ہوتے۔ البتہ جب 71 برس کی ہوئیں تو چہرے سے پردہ ہٹا دیا تھا۔ تاہم آپ بے جا ترک پردہ کے خلاف تھیں۔ آپ محض حکمران نہ تھیں بلکہ ایک اچھی گھر گرہست اور منتظم خاتون بھی تھیں۔ کبھی کبھی چولہے ہانڈی کے کام میں بھی حصہ لیتیں۔ رمضان المبارک میں نماز ظہر کے بعد اکثر چولہے کے قریب جاتیں اور اپنے ہاتھ سے کوئی ڈش تیار کرتیں۔ فیضی ہمشیرگان سے آپ کے بہت اچھے گھریلو تعلقات تھے اکثر ان کے ساتھ پک نک پر جاتیں۔ خود سادہ کھانا کھاتیں البتہ مہمانوں کے لئے پرتکلف غذائیں تیار کرواتیں۔ فرصت کے اوقات میں مطالعہ کرتیں۔ سوزن کاری و کشیدہ کاری کے کاموں میں بھی منہمک رہتیں۔ علی گڑھ الہ آباد اور لندن کی نمائشوں میں اپنی دست کاریاں بھیجا کرتیں جنہیں بہت پذیرائی حاصل ہوتی۔ مصوری ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ حد یہ کہ کہیں جاتیں تو گاڑی میں مصوری کے ساز و سامان رکھ لیتیں جہاں کہیں قدرت کے دل فریب مناظر

نظر آتے ان کی تصویر کشی کے لئے خاکہ مکمل کر لیتیں اور پھر گھر آ کر رنگ بھر دیتیں۔

آپ گیارہ برس کی عمر میں ولی عہد کے منصب پر فائز ہوئیں۔ رسم تقریب کے سلسلے میں دربار منعقد ہوا۔ ایجنٹ نواب گورنر جنرل اور حاضرین کے سامنے آپ نے اپنی کم سنی میں ایسی اثر انگیز اور دل نشین تقریر کی کہ حاضرین دربار آپ کی فہم و فراست اور مدبرانہ لیاقت و صلاحیت کا لوہا مان گئے۔ آپ کو شاندار عمارات کی تعمیر کا بہت شوق تھا۔ ایوان صدر منزل، باغ حیات افزاء، ان کے اس شوق کی نشاندہی کرتی ہیں۔ ولی عہدی کے زمانے میں مختلف شاہی درباروں میں شرکت کی۔ 1875ء میں والدہ کے ساتھ پرنس آف ویلز کے دربار میں کلکتہ گئیں۔ 1877ء میں دہلی کے قیصری دربار اور 1884ء میں کلکتہ میں لارڈ رپن کے دربار میں تشریف لے گئیں۔ 17 برس کی ہوئیں تو ضلع مظفر نگر کے ایک معزز و ممتاز نواب احمد علی خاں کے ساتھ یکم فروری 1875ء میں رشتہ ازدواج میں منسلک ہوگئیں۔ شادی کی تقریب نہایت تزک و احتشام سے منائی گئی۔ دو کروڑ روپے مہر رکھا گیا۔ دولہا کو چالیس ہزار روپے کی جاگیر دی گئی اور نظیرالدولہ سلطان دولہا کے خطاب سے نوازا گیا۔ نواب سلطان جہاں کو چھ لاکھ 36 ہزار 8 سو پانچ روپے کا جہیز ملا۔ وہ شادی سے پہلے 80 ہزار روپے سالانہ کی جاگیر کی مالک تھیں اور بعد میں بھی رہیں۔ آپ کی ازدواجی زندگی نہایت کامیاب اور خوش گوار تھی دو بیٹیاں اور تین بیٹے پیدا ہوئے سب سے چھوٹے بیٹے نواب زادہ میجر حاجی محمد حمید اللہ کو آپ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں زمام ریاست ان کے ہاتھ میں دے دی تھی۔ آپ 1925ء میں انتقال کر گئی تھیں۔ 1902ء میں آپ کے شوہر انتقال کر گئے تھے جو آپ کے مشیر خاص اور معتمد تھے۔ مولوی صدیق حسن سے آپ کی والدہ کا عقد ثانی آپ کی زندگی کا المیہ بن گیا تھا۔ ماں بیٹی میں ناچاقی اور رنجش پیدا ہوگئی جو تمام عمر جاری رہی۔

آپ 17 جون 1901ء میں والدہ شاہ جہاں کے انتقال کے بعد حکومت برطانیہ کی جانب سے ریاست بھوپال کی رئیسہ مقرر ہوئیں۔ ریاست کی عنان ہاتھ میں آتے ہی ریاست کی ترقی اور اصلاح کی جانب توجہ مبذول کی محکمہ پولیس، جیل اور فوج کی تنظیم نو کی بھوپال کے عوام کی فلاح و بہبود کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بجلی کا محکمہ قائم کر کے گھر گھر بجلی پہنچانے کا بندوبست کیا ساتھ ہی ٹیلی فون کی ابتداء کی۔ کئی قدیم شکستہ تاریخی عمارتوں کی مرمت کروائی۔ اپنی والدہ کے زمانے میں جو لائبریری قائم کی گئی تھی اس کی توسیع کرائی اور کتابوں کی تعداد بڑھائی۔ تعلیم پر خصوصی توجہ مرکوز کی۔ نئے اسکول کھولے اور تعلیمی نصاب میں مفید مضامین شامل کروائے۔ تعلیم نسواں پر آپ نے خصوصی توجہ فرمائی تھی۔ جاہل اور بے سہارا خواتین کے لئے دست کاری سکھانے کے اسکول قائم کئے۔ یہاں بٹوے بنانے سے لے کر صابن اور عطر سازی بھی خواتین کو سکھائی جاتی تھی۔ آپ نے قومی اداروں کی بھی سرپرستی فرمائی تھی اور ان کے لئے وظیفے مقرر کئے تھے۔ انجمن ترقی اردو کو ماہانہ وظیفہ دیا جاتا تھا۔ ندوۃ العلماء کو ابتداء میں 600 روپے سالانہ امداد دی جاتی تھی جسے بعد میں 2600 کر دیا گیا تھا۔

نواب حمیداللہ خاں

آپ 9 ستمبر 1894ء کو پیدا ہوئے۔ والدین کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے اسی وجہ سے چھوٹے میاں کے نام سے بھی مشہور تھے۔ آپ سے بڑے دو بھائی تھے۔ سب سے بڑے بھائی نصراللہ خاں تھے جنہیں 9 اکتوبر 1901ء کو والدہ سلطان جہاں بیگم نے اپنا ولی عہد مقرر کر دیا تھا۔ آپ کے منجھلے بھائی عبیداللہ خاں تھے جو شملہ پہاڑی پر شان دار کوٹھی میں رہتے تھے لیکن آپ کا زیادہ تر وقت بمبئی میں گزرتا تھا۔ وہیں کاروبار کرتے تھے ریس اور ہاکی سے گہری دلچسپی تھی۔ عبیداللہ گولڈ کپ ریس اور عبیداللہ پلیٹ ریس ان ہی کی یادگار ہیں۔ بھوپال میں عبیداللہ گولڈ کپ ہاکی ٹورنامنٹ آپ کی ہی ہاکی سے دلچسپی کا مظہر ہے۔ آپ کے تین بیٹے تھے وہ بھی ہاکی، کشتی رانی اور گھڑ سواری کا شوق رکھتے تھے۔ حمیداللہ خاں کے بڑے بھائی جنہیں ولی عہد بھی مقرر کیا گیا تھا جوانی میں ہی انتقال کر گئے تھے چنانچہ اس کے بعد سلطان جہاں بیگم نے آپ کو ولی عہد مقرر کیا تھا۔ آپ کی تعلیم الیگزینڈر ہائی اسکول بھوپال میں ہوئی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی اے کیا۔ آپ کی تربیت آزادانہ ماحول میں ہوئی تھی زمانہ طالب علمی سے ہی آپ کے برصغیر کے سیاسی مشاہیر سے تعلقات تھے۔ آپ 1926ء میں اپنی والدہ کی موت کے بعد ریاست بھوپال کے نواب مقرر ہوئے۔ آپ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر دیوان رؤسائے ہند کے چانسلر رہے۔ برصغیر کی سیاست میں بھی آپ کا بہت اہم کردار رہا۔ تقسیم ہند کے وقت آپ بہت فعال تھے۔ آپ نے قیام پاکستان کے سلسلے میں قائداعظم محمد علی جناحؒ کی بہت مدد کی کہتے ہیں کہ پاکستان

کے قیام کے سلسلے میں گاندھی کے دستخط بہت ضروری تھے مگر گاندھی سے بھارت ماتا کی تقسیم کے پروانہ پر دستخط کرانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ یہ مشکل ترین کام نواب حمید اللہ خاں نے بہت آسانی سے سرانجام دے دیا تھا۔ آپ کی پاکستان نوازی کی وجہ سے کانگریسی لیڈر آپ کی ریاست کے خلاف ہو گئے تھے اور انہوں نے نواب صاحب سے پاکستان نوازی کا بدلہ ان کی ریاست کو بھارت میں ضم کر کے لے لیا تھا۔

آپ کو درویش صفت انسان بھی کہا جاتا ہے کیوں کہ آپ ایک بڑی ریاست کے نواب ہوتے ہوئے کسی قسم کے لہو ولعب میں نہیں پھنسے۔ آپ نے کوئی نیا محل تعمیر نہیں کرایا بلکہ اپنی والدہ کے تعمیر کردہ قصر سلطانی میں ہی ساری عمر گزار دی۔ آپ نے اپنے عوام کی خوش حالی کو ہمیشہ مقدم رکھا اور ان کی ضروریات اور سہولیات کا بہت خیال رکھا۔ آپ نے اپنا عہدہ سنبھال کر سب سے پہلے ایک بڑا طاقت ور پاور ہاؤس تعمیر کرایا جس کی بدولت شہر کی سڑکوں اور گلی کوچوں تک بجلی پہنچ گئی۔ ایک کپڑے کا کارخانہ بھی قائم کیا جہاں ایک ہزار افراد کو روزگار میسر آ گیا تھا۔ آپ نے بھوپال میں برف کے کارخانے، گتے کی فیکٹریاں وغیرہ لگوائیں۔

دوسری عالمی جنگ کے موقع پر آپ نے جنگی قیدیوں کو رکھنے کے لئے برٹش گورنمنٹ کی فرمائش پر اپنے موضع بیراگڑھ کو کیمپ بنانے کے لئے دے دیا تھا۔ ان کیمپوں کے آباد ہونے کے بعد شہر میں جہاں گوشت سبزی انڈے مرغی کی قیمتیں بڑھ گئی تھیں بھوپال کے لوگوں کو روزگار مہیا ہو گیا تھا اس وقت بھوپال کے ٹھیکیداروں اور تانگے والوں نے خوب کمائی کی۔ جنگی قیدیوں کے جانے کے بعد ان کیمپوں کو 1947ء میں فرقہ وارانہ فسادات کے مارے مسلمانوں کی رہائش کے لئے وقف کر دیا گیا تھا۔

آپ کے عہد میں بھوپال نے جہاں دیگر شعبوں میں ترقی کی وہاں شعر و

ادب کے شعبے میں بھی کافی ترقی ہوئی۔ بھوپال شعر و ادب کا گہوارہ بن گیا تھا۔ بھوپال میں اکثر مشاعرے منعقد ہوتے، برصغیر کے تمام ہی شاعر و ادیب بھوپال تشریف لے جاتے اور نواب صاحب کے مہمان خاص بنتے۔ علامہ محمد اقبالؒ بھی بھوپال میں رہائش پذیر رہ چکے ہیں۔ وہاں آپ نے سازگار ماحول پا کر کئی معرکتہ الآراء نظمیں تصنیف کی تھیں۔ اس عہد نے کئی نامور ادیب اور شاعر پیدا کئے۔ کئی تاریخ دانوں نے بھی اس دھرتی پر جنم لیا جن میں محمد احمد سبزواری کا نام ہمیشہ تر و تازہ رہے گا۔ کرکٹ، ہاکی اور فٹ بال کے بھی کئی عظیم کھلاڑی یہاں ابھرے پاکستان کی ابتدائی ہاکی ٹیم میں بھوپال کے کئی کھلاڑی شامل تھے۔ جنہوں نے پاکستان کا نام سر بلند کیا تھا۔

نواب حمید اللہ خاں کے دور میں ہی بھوپال میں ہوائی اڈہ تعمیر ہوا۔ جس سے بھوپال کا براہ راست برصغیر کے تمام بڑے شہروں سے رابطہ قائم ہوگیا تھا۔ بھوپال کی ریاست جو حیدر آباد دکن کے بعد برصغیر کی سب سے بڑی ریاست تھی 30 مئی 1949ء کو بھارتی حکمرانوں کے تعصب کا نشانہ بن کر بھارت میں ضم کر دی گئی۔ اسے چیف کمشنری میں تبدیل کر دیا گیا۔ انڈین سول سروس کے سینئر افسران یہاں چیف کمشنر ہوتے رہے۔ ابتدائی دور بڑا افراتفری کا رہا بعد میں حکومت ہند نے ریاستوں کی تشکیل نو کے تحت بھوپال کو پارٹ سی کی ریاست قرار دے دیا۔ پھر ذمہ دار حکومت قائم ہوئی اور سب سے پہلے چیف منسٹر ڈاکٹر شنکر دیال شرما مقرر ہوئے۔ پہلے سرکاری زبان اردو تھی انضمام کے فوراً بعد ہندی کو ریاست کی سرکاری زبان قرار دے دیا گیا۔ پرانے ملازمین کا صفایا کر دیا گیا ان کی جگہ دوسرے صوبوں کے حکام نے لے لی۔ باہر سے آنے والوں کا انداز فاتحین کا سا تھا۔ چھانٹی کی وجہ سے بیروزگاری میں اضافہ ہوگیا۔ ریاست کے لوگ یا تو دوسرے صوبوں میں نوکریاں تلاش کرنے لگے یا پھر پاکستان کا رخ کرنے لگے۔

آپ اپنی ریاست کے 30 مئی 1949ء کو بھارت میں ضم ہونے کے بعد خود کو بھارت کا قیدی خیال کرنے لگے تھے۔ آپ کی ریاست کی حالت زار بھی آپ کو خون کے آنسو رُلاتی تھی ان حالات نے آپ کو دلبرداشتہ کر دیا تھا۔ بالآخر آپ 4 فروری 1960ء کو انتقال فرما گئے۔

☆☆☆

KUTUB KHANA JALALI BOOKS JALALI
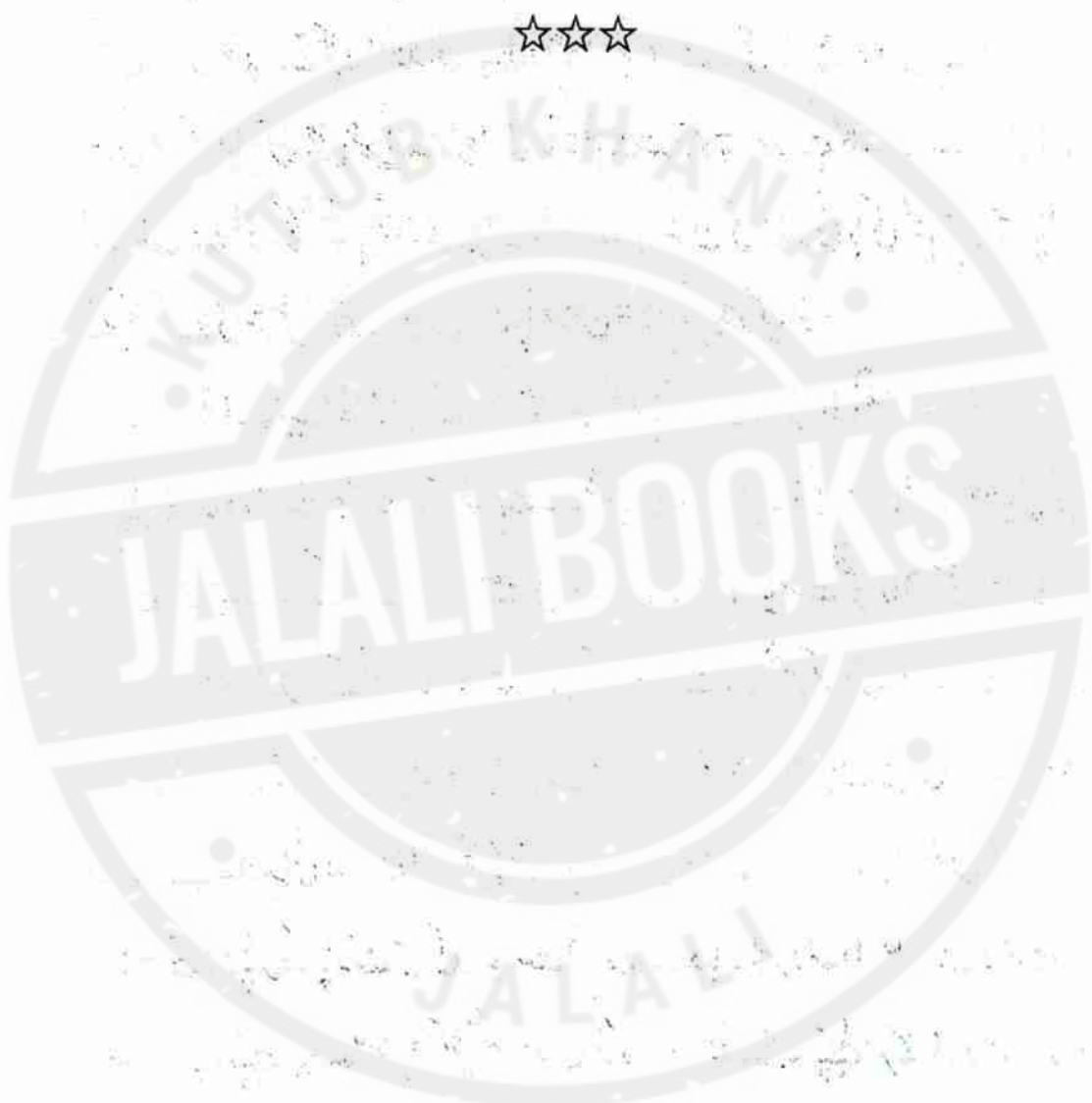
باب 3

نوابینِ بھوپال کی رواداری

ریاست بھوپال کے حکمرانوں میں رواداری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ انہوں نے اپنی رعایا کے ساتھ ایسا مثالی رویہ اختیار کیا تھا جو ہندوستان کی دوسری ریاستوں میں کم کم ہی نظر آتا تھا۔ انہوں نے اپنی رعایا کو کبھی اپنا محکوم یا کم تر نہیں سمجھا ہمیشہ ان کی ہمت افزائی اور قدر دانی کی۔ ان کا عدل و انصاف بھی بے مثال تھا۔ کبھی کسی شہری کی حق تلفی نہیں ہونے دی۔ موجودہ دور میں ہی نہیں بلکہ ہر دور میں یہ اصول سیاست کارفرما رہا ہے کہ ہر حکومت اپنی رعایا کے صرف اس طبقے پر نوازشات کی برسات کرتی ہے جن سے حکومت کو کوئی نہ کوئی غرض یا مطلب کارفرما ہوتا ہے۔ تاہم ریاست بھوپال نے اپنی رعایا میں تفریق نہیں کی۔ ان کے لئے تمام رعایا یکساں محترم اور قابل عزت رہی ہے۔ نہ کسی کے ساتھ کوئی غرض وابستہ رہی ہے اور نہ ہی کسی طبقے کو اپنے مفاد کے لئے آلہ کار بنانے کا مقصد پیش نظر رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ والیانِ ریاست کو اپنی رعایا نوازی اور شرافت نفسی کی جس قدر بھی تعریف کی جائے وہ کم ہے۔ ریاست بھوپال کی بنیاد کشت وخون اور تخت و تاج کی حرص کی بجائے اپنی رعایا کے حسن سلوک اور احسان پر قائم ہوئی۔ اگر تاریخ پر نظر ڈالیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ جب ریاست بھوپال کے بانی دوست محمد خاں اس علاقے میں آئے تو یہاں عوام کی جان و مال اور عزت ڈاکوؤں اور لٹیروں کے ہاتھوں محفوظ نہ تھی۔ یہاں کے چھوٹے بڑے علاقوں پر قابض حکمراں ایک دوسرے کی پگڑیاں اچھالنے اور ان سے جنگیں کر کے ان کے

علاقے چھیننے میں مصروف تھے۔ مقصد صرف حصولِ زر تھا۔ ایسے میں دوست محمد خاں نے سرکش حکمرانوں کو شکست دی جس سے چھوٹے علاقوں کے حکمران محفوظ ہو گئے۔ آپ نے اسی زمانے میں اس علاقے کے ایک طاقت کے نشے میں مدہوش رئیس کو ایک بیوہ رانی کی ریاست پر قبضہ کرنے سے نہ صرف روکا بلکہ اس کے غرور کو خاک میں ملا دیا۔ یہ طاقت ور شخص کوئی غیر بھی نہیں تھا کمزور ریاست کے حکمران نظام شاہ کا بھائی تھا ایک طرف اس نے سازش کے تحت نظام شاہ کو زہر دے کر ہلاک کرا دیا تو دوسری جانب اپنی بھابی کو شادی کرنے پر مجبور کرنے لگا۔ مقصد صرف اس کی زمین پر قبضہ کرنا تھا۔ دوست محمد خاں نے رانی کملا پتی کا علاقہ محفوظ بنا دیا تھا وہ اگر چاہتے تو اس پر خود بھی قبضہ کر سکتے تھے کیوں کہ ان کے پاس طاقتور فوج تھی اور اس وقت وہ بے سروسامانی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ مگر انہوں نے رانی کے علاقے پر ہاتھ تک نہیں لگایا بلکہ اس کے علاقے کی حفاظت کرتے رہے۔ اس کے بیٹے نول شاہ کی ہمت بندھاتے رہے۔ البتہ جب وہ فوت ہونے لگا تو اس نے نہایت محبت کے ساتھ اپنے کچھ علاقے دوست محمد خاں کے حوالے کر دیئے تھے جن سے دوست محمد خاں نے اپنی ریاست کی ابتداء کی۔ آپ کے بعد آپ کے بیٹے یار محمد خاں نے بھی اپنی ریاست میں عدل و انصاف قائم رکھا۔ ایک ذہین ہندو بجے رام ریاست کے نظم ونسق کا مالک تھا۔ انہوں نے کبھی بھی اپنی رعایا کے ساتھ تعصب نہیں برتا۔ فوج اور دفتری کاموں کے لئے ہندوؤں کو ملازمتیں دینے میں فراخ دلی سے کام لیا۔ ہندو رعایا کے ساتھ شاہانہ مراعات اور خسروانہ انداز سے پیش آتے ہر معاملے میں فیاضی اور رواداری کا برتاؤ کرتے تھے اور ریاست کے ہر امور میں انہیں شریک کرتے تھے۔ ان کے اعزاز و اکرام میں اضافہ بھی کرتے رہتے تھے۔ انہیں اپنی فوج میں اعلیٰ عہدے دیتے، منصب اور جاگیریں عطا کرتے تھے، اپنے محل میں بھی انہیں مناسب ذمہ داریاں سونپتے تھے۔ بجے رام کا پہلے

ذکر آ چکا ہے اسے نواب یار محمد خاں کی بے پایاں نوازشات نے ان کا پرستار بنا دیا تھا۔ چنانچہ نواب صاحب کے انتقال کے بعد جب ان کے فرزند فیض محمد خاں کی تخت نشینی کے خلاف خاندان کے بعض افراد نے آواز اٹھائی تو دیوان بجے رام نے پانچ ہزار فوج کے ساتھ ان کی سرکوبی کی تیاری کر لی تھی۔ جب تک فیض محمد خاں ریاست کے رئیس رہے بجے رام ہی دیوانِ ریاست رہے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے گھانسی رام کو خلعت نیابت عطا کی گئی اور پھر ان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے کیسری سنگھ کو دیوانِ ریاست کے عہدے پر فائز کیا گیا۔ فیض محمد خاں کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے حیات محمد خاں نے بھی یہ طریقہ جاری رکھا۔ اس زمانے میں ہندو رعایا نواب صاحب اور ان کے خاندان سے اس قدر خوش تھی کہ ان کے لئے کوئی بھی مشکل جھیلنے کے لئے تیار تھی۔ جب مرہٹہ فوجوں کی بھوپال پر حملے کے بارے میں انہیں پہلے سے معلوم ہوا تو انہوں نے میدانِ جنگ کے لئے اپنی خدمات نہایت جوش و خروش کے ساتھ پیش کیں جب جنگ شروع ہوئی تو سب سے پہلے ہندو فوج نے میدانِ جنگ میں جانے کی درخواست پیش کی۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اس وقت بھوپال کی تمام فوجی قوت ہندو سرداروں کے ہاتھ میں تھی جس میں ڈانگر سنگھ اور گوجر سنگھ خاص طور پر قابل ذکر تھے۔ نواب غوث محمد خاں کے بعد نواب نظر محمد خاں کے عہد میں بھی تمام ہندو امراء اپنے عہدوں پر فائز رہے۔ اسی زمانے میں کئی ہندو سرداروں کو اعلیٰ عہدے دیئے گئے ان میں ہمیر سنگھ کا عہدہ دیوانِ ریاست کے عہدے کے برابر تھا۔

نوابوں کے بعد جب بھوپال میں بیگمات کا دور شروع ہوا تو اس سلسلے کی پہلی فرمانبردا نواب سکندر بیگم تھیں اس دور میں کئی فرانسیسی خاندانوں نے بھوپال میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ انہوں نے ریاست کی فوجوں میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ سکندر بیگم کی حکومت میں تین اہم شخصیات شامل تھیں جن میں ایک مسلمان، ایک ہندو اور ایک

عیسائی تھا۔ مسلمان کا نام کرم محمد خاں، عیسائی وزیر کا نام شہزاد مسیح تھا جب کہ ہندو وزیر کا انتقال ہو گیا تو ان کی جگہ خوش وقت سنگھ رائے کو راجگی کا خطاب دیا گیا اور عہدۂ وزارت پر فائز کیا گیا اور ان کی وزارت کی جاگیر چوبیس ہزار روپے مقرر کی گئی۔ محل شاہی کی اکثر خدمات ان کے ہی سپرد کی گئیں۔ انہیں تنخواہ کے علاوہ مختلف الاؤنس بھی دیئے جاتے تھے۔ اس وقت اگرچہ ریاست میں بکثرت مسلمان علماء موجود تھے مگر قدسیہ بیگم نے اپنی بیٹی سکندر بیگم کی تعلیم کے لئے راجہ خوش وقت سنگھ کو مقرر کیا۔

قدسیہ بیگم جیسی عبادت گزار تھیں ویسی ہی سخی بھی تھیں۔ رعایا پر ان کی فیاضیوں کا کوئی حساب نہ تھا مگر ان کی فیاضی صرف مسلمانوں تک محدود نہ تھی بلکہ ان سے ہندو غریب خاندان بھی مستفید ہوتے تھے۔ انہوں نے کسی خانگی تقریب جشن یا رسم کے موقع پر اپنی ہندو رعایا کو فراموش نہیں کیا۔ بھوپال کے غریب ہندو خاندانوں کو باقاعدگی سے وظیفے دیئے جاتے تھے۔

دور دور سے پنڈت اور بیراگی ان کے دربار میں آتے اور مالا مال ہو کر جاتے۔ ان کے زمانے میں کئی شمشان گھاٹ اور مندر تعمیر ہوئے۔ بھوپال کا عالی شان مندر وسط شہر اور جامع مسجد کے بالکل سامنے چوک میں واقع ہے۔ ان کے زمانے میں ہندو دیوان چھٹو لال کا ایک واقعہ بہت مشہور ہے کہ وہ ایک مرتبہ ایک لاکھ روپیہ جاگیر کی مد میں ایک علاقے سے وصول کر کے لائے اور اسے بجائے سرکار میں داخل کرنے کے جوگیوں اور بیراگیوں میں تقسیم کر دیا۔ جب بیگم صاحبہ تک یہ خبر پہنچی انہوں نے چھٹو لال سے کوئی باز پرس کرنے کے بجائے در گزر کر دیا۔ رمضان کے مہینے میں مسلمان ملازمین کو افطاری اور سحری ملتی تھی ہندو ملازمین کو اسی ماہ میں اسی مقدار میں خام اجناس دیا جاتا تھا۔ اسی ماہ میں مسلمان سالکین کو زکوٰۃ کا روپیہ دیا جاتا تھا جب کہ ہندو غربا کو سونے چاندی کے چھلے تقسیم کئے جاتے تھے۔ ان کی جاگیر میں 38 ہزار کے حصے دار مسلمان

تھے جب کہ 30 ہزار کی جاگیر ہندوؤں کے نام تھی۔ اس عہد میں راجہ خوش وقت رائے پر اگرچہ پیرانہ سالی غالب آ چکی تھی لیکن عہدہ وزارت پر تاعمر قائم رکھا گیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی سے ریاست کے تعلقات قائم کرنے کے لئے 1818ء میں جو معاہدہ کیا گیا اس کی رو سے ریاست کی جانب سے ایک پولیٹیکل سیکریٹری کا عہدہ قائم کیا گیا جس کے فرائض انتہائی اہم اور نازک تھے اس میں احساس ذمہ داری رازداری اور اعتماد کی ضرورت تھی۔ بیگم صاحبہ نے اس عہدے کے لئے کبھی مسلمان تو کبھی ہندو کو مقرر کیا۔ یعنی کہ اس اہم عہدے کے سلسلے میں صرف مسلمانوں کو مقرر نہیں کیا گیا بلکہ ہندوؤں کو بھی فائز کیا گیا جس سے نہ صرف ریاست کا ہندوؤں پر اعتبار ظاہر ہوتا ہے ساتھ ہی یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ہندو بھی ایک مسلم ریاست پر کس قدر اعتبار کرتے تھے کہ اس کے رازوں کو اپنا راز، اس کی بقاء کو اپنی بقاء، اس کے نقصان کو اپنا نقصان اور اس کے فائدے کو اپنا فائدہ تصور کرتے تھے۔ اس عہدے کے سلسلے میں ایک ہندو شخصیت کا نام بہت مشہور ہوا تھا جنہیں منشی بھوانی پرشاد کہتے ہیں۔

اس وقت سرکاری زبان فارسی تھی، دفاتر میں تمام کارروائی فارسی میں رقم کی جاتی تھی بیگم صاحبہ نے ہندوؤں کی آسانی کے لئے دفاتر میں اردو کو مروج کیا کیونکہ ہندو اردو میں خط و کتابت میں آسانی محسوس کرتے تھے مگر ریاست میں ہندی کا بھی رواج عام تھا۔ بیگم صاحبہ نے ریاست میں جہاں اردو کے اسکولوں کو فروغ دیا وہاں ہندی اسکول بھی کھولے گئے جہاں ہندی کی تعلیم کے لئے قابل پنڈتوں کو مقرر کیا جاتا تھا جو ہندو بچوں بچیوں کو ہندی لکھنا، پڑھنا سکھاتے تھے۔ جب انگریزوں کے قبضے کے بعد لکھنؤ اور دہلی کے کئی مسلمان شرفاء نے وہاں سے ریاست بھوپال کا رخ کیا تھا بیگم صاحبہ ہندو شرفاء خاندانوں کو خود وہاں جا کر اپنی ریاست لے کر آئی تھیں اور نہ صرف انہیں ریاست میں آباد کیا بلکہ انہیں ملازمتیں بھی فراہم کیں۔

نواب سکندر بیگم کے زمانے کا یہ واقعہ ہندو نوازی کی ایک خاص مثال پیش کرتا ہے کہ جب ہوا محل تیار ہو رہا تھا تو اس کے شمال کی جانب ایک ہندو کا چھوٹا سا کچا مکان واقع تھا جس کی وجہ سے ہوا محل کی ایک دیوار ٹیڑھی ہو رہی تھی۔ بیگم صاحبہ کو اس کی خبر کی گئی بیگم صاحبہ نے حکم کیا کہ اس شخص کا مکان اچھی قیمت پر خرید لیا جائے ساتھ ہی اسے انعام واکرام سے بھی نوازا جائے مگر وہ شخص اپنا مکان بیچنے کے لئے تیار نہ تھا۔ اس کی اس ضد کو ختم کرنے کے لئے اس کے عزیز واقارب نے بھی اسے بہت سمجھایا مگر وہ پھر بھی اپنی ضد پر قائم رہا۔ بیگم صاحبہ نے یہ صورت حال دیکھ کر اپنے اہلکاروں کو حکم دیا کہ اسے زیادہ نہ ستایا جائے اور ہوا محل کی اُس دیوار کو ٹیڑھا ہی بنا دیا جائے۔ ہوا محل کی شمالی دیوار ٹیڑھی بنی ہوئی ہے جو اس بات کی غماز ہے کہ مسلمان حکمرانوں نے کبھی اپنی غیر مسلم رعایا پر ظلم نہیں کیا بلکہ ان کے ناجائز مطالبات اور ہٹ دھرمی کو بھی خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔

نواب سکندر بیگم کے بعد ان کی بیٹی شاہجہاں بیگم والیٔ ریاست مقرر ہوئیں۔ آپ نے جیسا اپنی مسلمان رعیت کے ساتھ انصاف پسندانہ اور فیاضانہ رویہ اختیار کیا ویسا ہی اپنی ہندو آبادی کے ساتھ روا رکھا۔ آپ اپنی رعایا کے ہر فرد کو اپنے خاندان کا رکن سمجھتی تھیں۔ شاہ جہاں بیگم کے استاد دیوان ٹھاکر پرشاد تھے جو فن حساب کے ماہر تھے آپ کو شاہ جہاں بیگم نے اپنا نائب وزیر مال بھی مقرر کیا تھا انہیں تنخواہ کے علاوہ معقول جاگیر بھی عطا کی گئی تھی۔ شاہ جہاں بیگم کے ابتدائی دور میں دو وزیر تھے ایک ہندو اور ایک مسلمان یہ منشی محمد جمال الدین خان بہادر اور راجہ چندو لال تھے۔ راجہ چندو لال کو ایک بڑی جاگیر عنایت کی گئی تھی اس کے علاوہ شاہی محل کے برابر انہیں اپنے لئے عالیشان محل تعمیر کرنے کی بھی اجازت دی گئی تھی۔ اس دور میں ہندوؤں کی کائستھ برادری کو بہت عروج حاصل تھا۔ سرکاری دفاتر پر ان کا غیر معمولی اقتدار تھا۔ ریاست کا

خزانہ اور محکمہ مال ان ہی کی نگرانی میں تھے- وہ تمام حسابات کا اُستھانہ طریقے سے مرتب کرتے تھے جو دوسروں کے لئے مشکل کا باعث تھا جس کی نواب بیگم صاحبہ سے شکایت بھی کی گئی مگر آپ نے اس طبقے کی پرورش کے لئے اسی طریقے کو جاری رکھا۔ آپ نے جس طرح مسلمان غربا کے لئے وظائف مقرر کئے تھے اسی طرح ہندو غربا کے لئے بھی وظیفے مقرر کئے۔ دارالحکومت بھوپال میں روزانہ صبح دو من غلہ غریبوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ شاہی حکم تھا کہ سورج کے نکلنے سے پہلے غلہ غریبوں میں تقسیم کر دیا جائے تاکہ غربا پیٹ بھر کے ناشتہ کر سکیں۔ اس تقسیم میں کسی قسم کی مذہب و ملت کی تخصیص نہ تھی یہ بخشش ہندو اور مسلمان دونوں فرقوں کے لئے تھی۔ آپ کے دور میں ایک محکمہ ''سدا برت'' کے نام سے قائم کیا گیا تھا جو روزانہ غریبوں اور مسافروں کو خوراک اور زادِ راہ مہیا کرتا تھا۔

شاہ جہاں بیگم کے بعد سلطان جہاں بیگم کا دور شروع ہوا وہ بھی اپنے بزرگوں کے اصولوں پر کاربند رہیں۔ اپنی تمام رعایا کے ساتھ یکساں سلوک کرتی رہیں۔ آپ کے دور میں جدید تعلیم کا رجحان بہت بڑھ چکا تھا۔ آپ نے اپنی رعایا کو علم سے آراستہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ان کی رعایا کو کبھی ضروریاتِ زندگی میں کمی کا سامنا نہیں رہا اس لئے کہ بیگم صاحبہ اپنی رعایا کی خوراک اور روزمرہ ضروریات کی اشیاء کی دستیابی کو ہر صورت میں ممکن بنانے کے لئے متعلقہ محکموں پر کڑی نظر رکھتی تھیں اسی وجہ سے ریاست میں کبھی قحط نہیں پڑا اور نہ ہی کسی شے کی کبھی کوئی قلت ہوئی۔ آپ نے اپنی رعایا کو بجلی کی سہولت بھی فراہم کر دی تھی۔

آپ کے دور میں اُردو ہندی کے ساتھ انگریزی تعلیم کا بھی اعلیٰ انتظام تھا۔ آپ نے ہندو اور مسلمان بچوں کو تعلیم کی جانب راغب کرنے کے لئے مفت تعلیم کا انتظام کیا تھا۔

نواب سلطان جہاں کے بعد ان کے بیٹے نواب حمیداللہ کا دور بھی بڑا مثالی رہا

وہ ایک درویش صفت انسان تھے۔ سب کی بھلائی ان کا نعرہ تھا۔ اس دور میں انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کا رجحان ترقی پر تھا۔ آپ نے اپنی رعایا کو کبھی انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کی جدوجہد سے نہیں روکا۔ شنکر دیال شرما جو آپ کی ریاست کے باشندے تھے کانگریس پارٹی کے لئے کام کرتے رہے۔ دراصل آپ خود بھی ایک آزادی پسند انسان تھے اور برصغیر کو انگریزوں کے تسلط سے آزاد دیکھنا چاہتے تھے تاکہ ہندو مسلمان دونوں قومیں کھل کر آزاد فضا میں سانس لے سکیں۔ ہندوستان کی آزادی میں آپ کا اہم کردار تھا۔ آپ گاندھی اور نہرو کے ساتھ ساتھ مسلم لیگی رہنماؤں خصوصاً قائداعظم محمد علی جناحؒ سے خصوصی تعلقات رکھتے تھے۔ قیام پاکستان کے سلسلے میں بھی آپ نے کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ بھوپال کے لوگ آج بھی آپ کے مثالی دور کو یاد کرتے ہیں۔

بیگماتِ بھوپال کے معمولات

ہندوستان کی کئی ریاستیں اپنی تہذیب و تمدن کے لحاظ سے آج بھی زندہ ہیں۔اگرچہ اب ان کا قانونی وجود نہیں رہا ہے وہ ہندوستان کی یونین میں ضم ہوچکی ہیں مگر لوگ ان کی شاندار تہذیب کو نہیں بھولے اور شاید کبھی بھول بھی نہ سکیں اس لئے کہ ان کا اثر آج بھی ہمارے معاشرے میں نظر آتا ہے۔لکھنؤ اور دہلی کی تہذیب سے بھلا کون واقف نہیں ہے۔کئی صدیوں تک اس تہذیب نے برصغیر کی عوامی زندگی پر اثرات مرتب کئے ہیں محلوں سے لے کر عام لوگوں کی زندگیاں اس تہذیب و تمدن کا مسکن تھیں۔ریاست بھوپال بھی ایک نوابی ریاست تھی یہاں کے نواب اور بعد میں بیگمات نے اپنی ریاست میں ایسی تہذیب کو فروغ دیا ہے جو دہلی، لکھنؤ اور حیدر آباد سے کسی طرح کم نہ تھی۔بھوپال کی تہذیب اور ثقافت ریاست بھوپال کے سقوط کے بعد بھی زندہ ہے۔اس تہذیب کی جھلک آج بھی بھوپال کے لوگوں میں موجود ہے۔خواہ وہ وہاں رہتے ہوں یا وہاں سے دور کسی اور صوبے یا ملک میں چلے گئے ہوں۔

ریاست بھوپال کی بیگمات کا لباس نوابی شان وشوکت اور جاہ وجلال کا آئینہ دار تھا۔ان کا لباس اس قدر حسین اور دلکش تھا کہ آج بھی لوگ اس کو پہننے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔یہ بات صرف بھوپالیوں تک محدود نہیں ہے بلکہ دوسرے لوگ بھی ان کے ملبوسات کو پہن کر فرحت وسکون اور فخر محسوس کرتے ہیں ہندوستان اور پاکستان میں ان کے لباس کو آج بھی مقبولیت حاصل ہے کیوں کہ ان کے لباس کی دل کشی آج بھی جوں کی توں ہے۔بھوپال کی بیگمات کے لباس میں ترکی کرتہ، چوڑی دار پائجامہ اور اس پر

ساڑھے چار اور پانچ میٹر کا چنا ہوا دوپٹہ شامل تھا۔ اس لباس کے پہننے کا بھی خاص انداز تھا۔ دوپٹہ جو کافی لمبائی کا ہوتا تھا بڑے سلیقے سے اوڑھا جاتا تھا۔

بھوپال میں ترکی کُرتہ شاہی لباس میں بھی شامل تھا اور عام عورتوں میں بھی پسندیدہ تھا اسے بڑے سلیقے سے نفاست کے ساتھ تیار کیا جاتا تھا جسے عام طور پر خاص ماہر عورتیں تیار کرتی تھیں جنہیں مغلانیاں کہا جاتا تھا۔ یہ اپنے ہاتھوں سے انہیں تیار کرتی تھیں۔ اس وقت سلائی کی مشینیں ایجاد نہیں ہوئی تھیں بعد میں جب بھوپال میں سلائی کی مشینیں آ گئیں تو یہ ان سے تیار ہونے لگے مگر ان کی چنٹیں پھر بھی ہاتھوں سے بنائی جاتی تھیں کیوں کہ انہیں مشینوں سے نہیں بنایا جا سکتا تھا۔ دراصل ترکی کرتوں کی ساری خوبصورتی ان ہی چنٹوں پر منحصر تھی مغلانیاں یہ چنٹیں بڑی ہوشیاری سے ایک پر ایک جماتی تھیں۔ اگر یہ صفائی اور خاص ترکیب سے نہ ڈالی جاتیں تو ان کی خوبصورتی میں فرق آ جاتا تھا۔ اگر چنٹیں طریقے سے ڈالی جاتیں تو کرتہ نہایت خوبصورت نظر آتا۔ کُرتے کی آستینیں ہاتھ کے برابر رکھی جاتی تھیں آگے کی طرف یا تو کف لگائے جاتے یا سلوٹیں ڈال کر کلائی کے برابر رکھی جاتی تھیں۔ پائجامہ میں پنڈلی سے نیچے اور ٹخنوں کے اوپر بہت سی چوڑیاں ہوتی تھیں۔ اسی مناسبت سے اسے چوڑی دار پائجامہ کہا جاتا تھا چوڑیوں کے لئے پائجامے کی لمبائی کافی بڑی رکھی جاتی تھی یہ پنڈلیوں پر بالکل کسا ہوتا تھا یہ پائجامہ نہ صرف بیگمات میں بلکہ عام بھوپالی عورتوں میں بھی مقبول تھا لیکن بیگمات کے لئے تیار کئے جانے والے چوڑی دار پائجامے بہت دیدہ زیب اور مہنگے ہوتے تھے۔ جب کہ عام عورتوں کے چوڑی دار پائجاموں میں خوبصورتی ضرور ہوتی تھی مگر وہ سستے کپڑے کے ہوتے تھے۔

لباس کے استعمال میں رنگوں کا انتخاب بہت اہم ہوتا تھا۔ دوپٹہ اور کرتہ اکثر ہم رنگ ہوتے تھے پائجامہ اس رنگ پر کھلتے ہوئے رنگ کا ہوتا تھا۔ اگر پائجامہ پیلے رنگ کا ہوتا تو اس پر دوپٹہ و کرتہ آسمانی رنگ کا ہوتا پائجامہ اگر ہرے رنگ کا ہوتا تو اس

پر کپڑے گلِ انار یا گلابی رنگ کے ہوتے۔ دھانی رنگ کے کپڑوں کے ساتھ گلابی پائجامہ ہوتا۔ ساڑھے چار میٹر کے دوپٹے کے چاروں طرف لچکا و چمپہ ٹکا ہوا ہوتا تھا جو نہایت قرینے سے کاندھوں پر پڑا ہوا ہوتا جو پہننے والی کے حسن کو چار چاند لگا دیتا تھا۔ پائجامے عام طور پر پوت یا کم خواب کے ہوتے تھے انہیں چاندی کے تاروں سے بنایا جاتا تھا جس میں بڑی مقدار میں چاندی استعمال کی جاتی تھی اس طرح یہ بہت مہنگے ہوتے تھے جنہیں بیگمات ہی پہن سکتی تھیں۔ دوپٹے بڑی مہارت اور نفاست سے رنگے جاتے تھے انہیں رنگنے والیوں کو رنگریزنیاں کہتے تھے وہ دوپٹوں کو رنگنے میں بڑی مہارت رکھتی تھیں۔ وہ دوپٹوں کو رنگ کر ان میں کلف لگا کر ابرق بھی لگاتی تھیں جس سے ان میں چمک پیدا ہوجاتی تھی۔ دوپٹے کئی رنگوں میں رنگے جاتے تھے مگر ایک دوپٹے کو کئی رنگوں میں رنگنے کا بھی رواج تھا۔ اسے لہریہ دوپٹہ کہا جاتا تھا بیگمات کے دوپٹے رنگنے والی مخصوص رنگریزنیں ہوتی تھیں جو صرف بیگمات کے دوپٹے رنگتی تھیں انہیں محلوں میں رہنے کے لئے جگہ دی جاتی تھی۔

بیگمات جس طرح لباس کے معاملے میں بہت رکھ رکھاؤ کی مالک تھیں ویسے ہی وہ زیورات کے سلسلے میں بھی دلچسپی رکھتی تھیں۔ اس دور کے زیورات میں سے کئی چیزیں آج متروک ہوچکی ہیں مثلاً چمپا کلی، گلوبند، ہنسلی، ٹھسی، ست لڑے ہار وغیرہ۔ یہ تمام زیورات اس وقت بیگمات سے لے کر عام صاحبِ ثروت خواتین پہنا کرتی تھیں۔ کانوں میں جھمکے، جڑاؤ دار مچھلیاں، آویزے اور جڑاؤ دار بالیاں پہنی جاتی تھیں جبکہ ماتھے پر جڑاؤ دار ٹیکہ جھومر اور اک مرزا بے پرواہ نام کا زیور پہنتی تھیں اس کے علاوہ ایک جہانگیری نام کا زیور بھی کانوں میں پہنا جاتا تھا۔ ہاتھوں میں کئی طرح کی پہنچیاں، کنگن، بلدار کڑے اور چہ ہے دتیاں جو دانتوں کی شکل کی ہوتی تھیں۔ پیروں میں چھڑے توڑے لچھے اور پازیب پہنے جاتے تھے۔ انگلیوں میں مہدی چھلے اور انگوٹھے میں آرسی پہننے کا رواج عام تھا۔ بھوپال کی خواتین میں زیورات کو پہننے کا بہت شوق تھا۔

بھوپال کے سنار اپنی کاری گری میں ماہر تھے اور کافی مشہور تھے۔ بھوپال کے سناروں کے بارے میں یہ بات بہت مشہور تھی کہ وہ تھوڑے سے سونے سے بہت بڑا زیور تیار کر دیتے ہیں۔ بیگمات کے زیور میں فیروزے اور یاقوت کا نفیس جڑاؤ کا کام ہوتا تھا خاص طور پر ٹھسی میں بڑے قیمتی نگینے جڑے ہوتے تھے۔اس کے نیچے باریک پوتوں کی جھالر ہوتی تھی۔ اس وقت پیروں میں چاندی کے زیور پہنے جاتے تھے۔ پیروں کے چھڑے تقریباً چھ انگلی چوڑے ہوتے تھے ان میں کئی چینیں ہوتی تھیں جنہیں پان کی شکل میں بنے ہوئے پھلوں میں جوڑا جاتا تھا۔ پتلا والا حصہ اوپر رہتا تھا تا کہ پنڈلی پر اچھی طرح جم جائے ان کا وزن کم سے کم آدھا کلو ہوتا تھا۔ اس پر توڑے پہنے جاتے تھے اتنے وزنی زیورات کو پہن کر قدم اٹھانا بھی مشکل ہو جاتا تھا۔ یہ بھاری بھرکم زیورات جو ماتھے، کانوں اور ہاتھوں سے لے کر پیروں تک پہنے جاتے تھے صرف بیگمات کو ہی بھاتے تھے دراصل وہ ہی ان مہنگے زیورات کو خرید سکتی تھیں اور پہن بھی سکتی تھیں۔

ان زیورات کے علاوہ ترکی کرتوں کے گریبان میں سونے اور چاندی کے بٹن بھی لگائے جاتے تھے۔ سونے کے بٹنوں میں خوب صورت نگینے جڑے ہوتے تھے۔ قیمتی نگینے جڑے سونے کے بٹن عام طور پر بیگمات ہی استعمال کرتی تھیں۔ عام گھروں کی عورتیں چاندی کے رنگ برنگے شیشے جڑے ہوئے بٹن استعمال کرتی تھیں۔ بہرحال بٹن خواہ سونے کے ہوں یا چاندی کے ان کی چمک لباس کی خوبصورتی کو چار چاند لگا دیتی تھی۔

مردوں کے لباس عام طور پر کرتہ اور پائجامہ ہوتے تھے۔ پائجامے کی مہری مناسب ہوتی تھی جو زیادہ تنگ نہ زیادہ کشادہ ہوتی تھی۔ بھوپالی تراش خراش کے کرتوں کو بہت پسند کیا جاتا تھا یہ کرتہ کمر تک تنگ اور نیچے سے لمبے گھیر دار ہوتے تھے۔ خواتین کے علاوہ مردوں میں بھی چوڑی دار پائجامہ پہننے کا رواج تھا۔ کمر بند میں چاقو بھی لٹکایا جاتا تھا تا کہ بھوپالیوں کی سپہ گری کی روایت کا بھرم قائم رہے۔

☆☆☆

بھوپال کے قدیم اور نئے باشندے

بھوپال میں ویسے تو ماضی میں مختلف اقوام رہائش پذیر رہی ہیں مگر بھوپال ریاست کے حقیقی باشندے گونڈ اور بھیل ہیں یہ کب سے اس سرزمین پر آباد ہیں اس کا اب تک کوئی سراغ نہیں لگایا جا سکا۔ بعض محققین کے مطابق یہ صدیوں سے یہاں آباد ہیں اور ان کے سامنے آریوں نے ہندوستان پر یلغار کی اور وہ شمالی و وسطی ہندوستان پر قابض ہو گئے اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہاں کے قدیم باشندوں کو مار بھگایا۔ یہ ان کے خوف سے جنگلوں میں روپوش ہو گئے یا پھر جنوب کی جانب ہجرت کر گئے۔ ان ہی لوگوں کو تاریخ میں دراوڑی کہا گیا ہے۔ اس وقت یہ قبائل کی شکل میں ہندوستان کے مختلف علاقوں میں آباد ہیں اور مختلف علاقوں میں آباد ہونے کی وجہ سے رسم و رواج، زبان و عادات کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ مدھیہ پردیش میں گونڈوں کی کافی تعداد موجود ہے جو زیادہ تر مزدوری کرتے ہیں یہ خاص طور پر مکانوں کی تعمیر میں حصہ لیتے ہیں۔ بڑے پتھروں کو زمین سے نکالنا اور ان کو تراشنا ان کا خاص پیشہ ہے۔

تاریخی حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ ریاست بھوپال کے کچھ حصے پر راجہ چندر گپت کا قبضہ رہا ہے اس دور میں یہاں بدھ مت مذہب عروج پر تھا تاہم گونڈوں کے اس مذہب سے متاثر ہونے کے کوئی آثار نمایاں نہیں ہیں مسلمانوں نے جب برصغیر میں اقتدار سنبھالا ریاست بھوپال گو کہ اس وقت موجود نہیں تھی مگر اس کے علاقوں پر گونڈ حکمرانوں کا قبضہ تھا۔ فیروز شاہ تغلق نے یہاں کے بعض علاقے اپنی مملکت میں شامل کر

لئے تھے اس کے انتقال کے بعد 1398ء میں تیمور کے ہندوستان پر حملے کے بعد اس علاقے میں راج گونڈوں کے اقتدار کا زمانہ آیا۔ اُس وقت کے گونڈ سردار کھرجی نے اپنے ہم قوم لوگوں پر اپنے اقتدار کا سکہ بٹھا دیا تھا۔ اس طرح گونڈوں کی حکومت کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا تھا تاہم انگریز محقق مسٹر ولز کے مطابق اس وقت گونڈ اقوام نے کوئی زبردست کامیابی حاصل نہیں کی تھی کیوں کہ گونڈوں کی یہ حکومت راجپوت ہندو عہدیداروں اور فوجی افسروں کی اعانت سے قائم ہوئی تھی۔ اکبر نے اپنے عہد میں اس علاقے کو گونڈ حکمرانوں سے لے لیا تھا تاہم روایت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ صرف رائے سین اور تال کے پرگنے اکبر نے حاصل کئے تھے۔ مغلیہ دور کے آخری حصے میں اس علاقے میں کئی گونڈ حکومتیں قائم ہوگئی تھیں مگر بعد میں مرہٹوں نے ان علاقوں پر قبضہ کرلیا تھا البتہ مشرقی گونڈوانہ جس میں ریاست بھوپال کے علاقے بھی شامل تھے پر کچھ گونڈ راجاؤں کی حکومتیں قائم رہیں۔ جب دوست محمد خاں نے اس علاقے میں قدم رکھا یہاں کئی گونڈ حکومتیں قائم تھیں۔ گنور پر گونڈ راجہ نظام شاہ کی حکومت قائم تھی۔ اسے اس کے بھتیجے نے زہر دے کر ہلاک کرا دیا تھا۔ اس کی بیوی کملا پتی نے دوست محمد خاں کو اپنی ریاست کو محفوظ بنانے اور شوہر کا انتقام لینے کا کام ایک لاکھ روپے کے عوض سونپ دیا تھا جسے سردار صاحب نے پورا کر دیا تھا مگر کملا پتی وعدے کے مطابق انہیں رقم نہ دے سکی تھی چنانچہ اپنا ایک علاقہ انہیں دے دیا تھا جسے سردار صاحب نے اسلام نگر کا نام دے کر اپنا مستقر بنا لیا تھا۔ بعد میں انہوں نے بھوپال کو آباد کیا تھا۔ نواب حیات محمد خاں کے وزیر گونڈ تھے انہیں نواب صاحب نے پالا تھا اور مشرف بہ اسلام کیا تھا۔ ان کا نام فولاد خاں تھا۔ اس کے علاوہ ریاست بھوپال کی جانب سے متعدد گونڈ سرداروں کو وقتاً فوقتاً جاگیریں عطا کی جاتی رہیں۔

اس علاقے میں گونڈوں کے اقتدار کے کئی آثار اب بھی باقی ہیں۔ قلعہ گنور

جو مردان پور میں ہے ایک بلند ترین چوٹی پر بنایا گیا ہے۔ اسے پہاڑی پتھر سے تعمیر کیا گیا ہے۔ دوسرا قلعہ چوکی گڑھ تحصیل سلطان پور میں واقع ہے۔ یہ بھی ایک پہاڑ کی چوٹی پر بنایا گیا ہے۔ تیسرا قلعہ قصبہ باڑی میں ہے۔ یہ ایک ندی کے کنارے بنایا گیا ہے۔ یہ قلعہ بہت محفوظ ہے کیوں کہ اس کے اطراف میں کئی پہاڑیاں ہیں جن سے یہ گھرا ہوا ہے۔ تحصیل بیگم گنج میں بھی گونڈوں کے قلعوں کے آثار موجود ہیں۔

صوبہ سی پی برار میں 1931ء کی مردم شماری کے مطابق 23 لاکھ گونڈ آباد تھے۔ گونڈ عام طور پر سیاہ رنگت کے ہوتے ہیں ناک چپٹی ہونٹ موٹے مگر جسم مضبوط ہوتے ہیں۔ یہ مکانوں کے علاوہ جنگلوں میں کھلے علاقوں میں بھی رہائش رکھتے ہیں۔ گونڈوں کی بعض خواتین بہت خوبصورت ہوتی ہیں۔ رانی کملا پتی بھی ایک گونڈ خاتون تھی اس کی خوب صورتی پر اس وقت کے کئی راجہ جان چھڑکتے تھے۔ تاہم وہ ایک وفا شعار خاتون تھی جو اپنے شوہر نظام شاہ کی پوری عمر وفادار رہی اس کے مرنے کے بعد بھی اس کے نام پر باقی زندگی گزار دی۔

گونڈوں کو عام طور پر ہندو سمجھا جاتا ہے مگر وہ ہندو دھرم کو نہیں مانتے۔ یہ ایک بڑے دیوتا کو بہت مقدس مانتے ہیں اور اسے بوڑھے باوا کے نام سے پکارتے ہیں۔ وہ ایک اور دیوتا ''دروئی'' کی بھی پوجا کرتے ہیں۔ یہ ہندوؤں کے مندروں میں نہیں جاتے اور ہندو انہیں اچھوت سمجھ کر ان سے پرہیز کرتے ہیں۔ ان کو اپنے گھر میں داخل ہونا تو درکنار انہیں چھونے سے بھی پرہیز کرتے ہیں۔ اگر یہ ان کی کسی چیز کو چھو لیں تو وہ اسے استعمال نہیں کرتے۔ دراصل گونڈ گوشت کھاتے ہیں اور اس وجہ سے برہمن اور دوسرے اعلیٰ ذات کے ہندو انہیں نجس سمجھتے ہیں جبکہ مسلمانوں کے ساتھ بھی یہی سلوک کرتے ہیں۔

گونڈ اپنے دیوتاؤں کی پوجا روز نہیں کرتے بلکہ صرف دیوالی اماوس اور پونم

کے روز کرتے ہیں۔ یہ لوگ بہت سیدھے نیک محنتی اور ایمان دار ہوتے ہیں ملازمت کم کرتے ہیں مگر جب ملازم ہو جاتے ہیں تو کام دیانت داری سے کرتے ہیں۔ جرائم بہت کم کرتے ہیں۔لڑائی جھگڑانہیں کرتے۔اگر کوئی گونڈ کسی سے بلاوجہ جھگڑا کرتا ہے تو برادری اس پر جرمانہ عائد کر دیتی ہے۔ گویا کہ یہ لوگ امن پسند ہوتے ہیں۔جیواور جینے دو کے اصول پر کاربند رہتے ہیں۔ ہندواور خاص طور پر برہمن ان سے پرہیز کراتے ہیں انہیں اچھوت سمجھتے ہیں اوران کے ہاتھ کا چھوانہیں کھاتے مگر دوسری جانب ''گونڈ بھی برہمنوں کے ہاتھ کا چھوانہیں کھاتے اور اگر بھولے سے ان کے کھانے کو کوئی برہمن ہاتھ لگا دے تو یہ اسے کتوں کو کھلا دیتے ہیں۔ گونڈوں میں کوئی بھی عیسائی مذہب سے تعلق نہیں رکھتا۔ان میں سے بعض ہندو مذہب کی جانب مائل ہو جاتے ہیں۔گائے کی قربانی نہیں کرتے اور نہ ہی گائے کا گوشت کھاتے ہیں۔

ان کی زبان بھی خاص ہے جسے دوسرے لوگ نہ سمجھتے ہیں اور نہ ہی بول سکتے ہیں۔ان کی زبان آپس ہی میں بولی جاتی ہے۔ یہ اردو میں بھی بات کرتے ہیں۔البتہ اس میں بھی دیہاتی الفاظ شامل ہوتے ہیں۔ تعلیم کے لحاظ سے بہت پیچھے ہیں۔ان میں مشکل سے 10 سے 14 فی صد لوگ لکھے پڑھے ہوتے ہیں چونکہ یہ لوگ زیادہ تر جنگلوں یا دیہاتوں میں رہتے ہیں اس لئے تعلیم سے بے بہرہ رہتے ہیں۔مگر وہ گونڈ جو شہروں میں رہتے ہیں لکھے پڑھے ہوتے ہیں۔ یہ زیادہ تر صحت مند ہوتے ہیں۔ یہ دن میں تین وقت کھانا کھاتے ہیں یہ صبح دلیہ دوپہر کو روٹی کے ساتھ ساگ رات کو چاول کھانا پسند کرتے ہیں۔غربت کی وجہ سے اکثر یہ خود اوران کے بچے جنگل کے پھل جیسے بیر مکوئی املی شکر قندی وغیرہ پر گزارہ کرتے ہیں۔لباس کے اعتبار سے یہ بہت سادگی پسند واقع ہوئے ہیں۔ مرد ایک لنگوٹی بدن پر سلوکا اور سر پر صافہ باندھتے ہیں جوتا پہننا ان غریبوں کے نصیب میں کہاں؟ ننگے پیر ہی چلتے پھرتے ہیں۔ان کی عورتیں بھی کم عرض

کی دھوتی پہنتی ہیں جو صرف اوپری حصے کو ڈھانپنے کا کام کرتی ہے۔ بچے بھی لنگوٹی پہنتے ہیں۔عورتیں کانسی پیتل اور تانبے کے زیورات استعمال کرتی ہیں۔ان میں جو متمول ہیں وہ مرد دھوتی اور کرتہ پہنتے ہیں عورتیں ساڑھیاں پہنتی ہیں۔ وہ چاندی کے زیورات استعمال کرتی ہیں۔ بعض عورتیں روپیوں (سکوں) کے ہار بھی گلے میں ڈالے رہتی ہیں۔ ان کی رہائش بھی سادہ ہوتی ہے۔ یہ اکثر جھونپڑیوں میں رہتے ہیں۔ جن کی چھتیں ساگون کے پتوں سے ڈھکی ہوتی ہیں۔البتہ دیواروں کو مٹی سے بناتے ہیں۔ یہ گھنے جنگلوں میں بھی رہتے ہیں مگر ڈر اور خوف سے عاری ہوتے ہیں۔ چونکہ یہ جنگلوں میں بھی رہتے ہیں اس لئے جنگلی جانوروں سے حفاظت کے لئے خنجر اور تلوار اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ پرانے زمانے میں ان کے پاس کئی ہتھیار ہوتے تھے۔ جو اس طرح تھے (۱) سہ دھار بلم جس میں تین دھاریں ہوتی تھیں۔ (۲) چار دھار بلم (۳) پنج دھار بلم جس کی نوک پان کی شکل کی ہوتی تھی۔ (۴) چکر۔ یہ لوہے کا ایک گول سا چکر ہوتا تھا جس کی تیز دھار ہوتی تھی۔ (۵) قرولی (۶) کلی۔ اس کی نوک کیل دار ہوتی تھی۔ کہتے ہیں کہ یہ تمام اوزار ست دھارا تحصیل میں حلالی ندی کے قریب چٹانوں کی مختلف دراڑوں میں اب بھی رکھے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ ہر سال ان کی پوجا کرتے ہیں۔

ان کے ہاں شادی کی رسم بہت شان سے ادا کی جاتی ہے۔ شادی کی رسم سے پہلے ہی ڈھولک کی تھاپ پر دولہا اور دلہن کے گھروں میں گانے شروع ہو جاتے ہیں ان کے ہاں رسم ہے کہ دلہن شادی کے لئے دولہا کے گھر جاتی ہے۔ دلہن کے ساتھ اس کے ماں باپ اور دوسرے رشتے دار ہوتے ہیں جہیز کا سامان بھی ساتھ ہوتا ہے۔ دلہا کے گھر کے سامنے پہنچ کر خوب ناچ گانا ہوتا ہے۔ یہ لوگ دولہا کے ہاں دو روز ٹھہرتے ہیں۔ شادی میں پھیرے پڑتے ہیں۔ شادی کے وقت دلہن کو یہ بھی اقرار کرنا پڑتا ہے کہ وہ اپنے شوہر کے لئے روزی کمائے گی۔ شادی میں عزیز رشتے داروں کی

لازمی دعوت ہوتی ہے۔ یہ لوگ شادی میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں حتیٰ کہ غریب دولہا کی جانب سے سب مل کر کھانا کرتے ہیں۔ ان کے ہاں چچا خالہ اور ماموں زاد بہنوں سے شادی نہیں کرتے۔ گونڈ کسی غیر قوم میں شادی نہیں کرتے لیکن اگر کوئی کرے تو اسے مکھیا کو جرمانہ دینا پڑتا ہے۔ ان میں ہندوؤں کے مقابلے میں طلاق کا طریقہ آسان ہے۔ کوئی مرد اپنی بیوی کو کبھی بھی گھر سے نکال کر اس سے علیحدگی اختیار کر سکتا ہے۔ اگر کوئی عورت اپنے گھر سے علیحدگی اختیار کرنا چاہے تو وہ اپنی ساڑھی کا ایک حصہ کاٹ کر اپنے شوہر کے سر پر ڈال دیتی ہے جس کے معنی یہ سمجھے جاتے ہیں کہ بیوی نے اپنے میاں کو چھوڑ دیا ہے۔ گونڈوں میں بیوہ عورت کسی سے بھی دوسری شادی کر سکتی ہے۔ ان کے ہاں ہندوؤں کی طرح بیواؤں کی بے عزتی نہیں کی جاتی اور انہیں شادی سے محروم نہیں رکھا جاتا۔

ان میں مردوں کو بعض فرقے جلاتے ہیں جب کہ بعض دفن کرتے ہیں۔ کمسن بچوں کو لازمی دفن کیا جاتا ہے۔ جو لوگ جلائے جاتے ہیں ہندوؤں کی طرح ان کی راکھ سے دانت اور ناخن اکٹھے کر کے نربدا ندی میں بہا دیئے جاتے ہیں۔

ان کا دیوار فرقہ بکری کو منحوس خیال کرتا ہے نہ وہ اس کو چھوتے ہیں اور نہ اس کا گوشت کھاتے ہیں اگر بھولے سے بکری کو ہاتھ لگ جائے تو یہ فوراً غسل کرتے ہیں۔ اگر ان کے گھر میں بکری آجائے تو گھر کے سارے مٹی کے برتن توڑ دیتے ہیں اور گھر کو لیپتے ہیں مگر یہ لوگ سانبھر ہرن اور نیل گائے کا گوشت کھاتے ہیں۔ عام گونڈ شیر کو نہیں مارتے اور مردہ شیر کو بھی نہیں چھوتے اگر شیر کسی کو پکڑ لے تو اسے برادری سے خارج کر دیا جاتا ہے اور جب تک برادری کو روٹی پانی نہ دے اس وقت تک اسے برادری سے باہر رکھا جاتا ہے۔ اگر کسی گونڈ کو شیر مار ڈالے اور جو عزیز و اقارب اس کے کریا کرم میں حصہ لیں انہیں برادری سے خارج کر دیا جاتا ہے۔ جب وہ روٹی پانی کرتے ہیں تو

دوبارہ برادری میں شامل کر لیا جاتا ہے۔ یہ لوگ جادو ٹونے بھی کرتے ہیں۔ بلی، گیدڑ اور سانپ اگر دائیں جانب سے گزریں تو اچھا شگون مانا جاتا ہے اور اگر بائیں جانب سے گزریں تو اچھا شگون نہیں مانا جاتا۔

ان کے ہاں لڑکا لڑکی کی شادی کے لئے موزونیت دیکھنے کے لئے ایک لوٹے میں پانی بھر کر اس میں گیہوں کے دو دانے ڈالے جاتے ہیں اگر دونوں آپس میں مل جاتے ہیں تو شادی کو مبارک سمجھا جاتا ہے۔

یہ اپنے باہمی لڑائی جھگڑے عدالتوں میں لے کر نہیں جاتے بلکہ ان کے فیصلے ان کی برادری کرتی ہے۔ اس سلسلے میں ان کے مکھیا کا فیصلہ آخری ہوتا ہے۔

ہندو اور مسلمان :

ریاست بھوپال میں ہندو اکثریت میں تھے۔ 1931ء کی مردم شماری کے مطابق ریاست کی کل آبادی 730,000 نفوس پر مشتمل تھی۔ جس میں 70 فی صد ہندو 28 فیصد مسلمان اور 2 فیصد کے قریب جین، بودھ اور عیسائی تھے۔ اس طرح کل آبادی میں ہندوؤں کی تعداد 511,000 مسلمانوں کی تعداد 200,000 اور باقی اقوام کی کل تعداد 19 ہزار تھی۔ جب کہ 1949ء میں انضمام کے وقت ریاست کی کل آبادی 1750,000 تھی اس میں 12,00,000 ہندو 500,000 مسلمان اور 50,000 باقی اقوام کی تعداد تھی۔ واضح ہو کہ ریاست میں ابتداء سے ہی ہندو اکثریت میں تھے ہندوؤں کی تعداد زیادہ ہونے کی وجہ یہاں قدیم زمانے سے آباد گونڈ ہیں۔ گونڈوں کو بھی دراصل مردم شماری کے ریکارڈ میں ہندوؤں میں شامل کیا گیا ہے۔ حالانکہ وہ خود کو ہندوؤں سے علیحدہ قوم مانتے ہیں۔ بھوپال میں مسلمانوں کی آبادی دوست محمد خاں کے زیرِ نگیں قائم ہونے والی حکومت کے بعد شروع ہوئی۔ اس ریاست میں مسلمانوں میں سب سے زیادہ پٹھانوں کی آبادی تھی۔ یہ لوگ دوست محمد خاں کے

شہر اور کزئی اور ارد گرد کے علاقوں سے ہجرت کر کے یہاں آباد ہوئے تھے۔ یہ لوگ اپنی جنگجویانہ مہارت کے لئے مشہور تھے۔ بعد میں ان کی نسلوں نے تعلیمی میدان میں کامیابی حاصل کر کے سرکاری دفاتر میں لکھنے پڑھنے کی نوکریاں حاصل کیں اور نامور ادیب شاعر اور سائنس داں بننے کا اعزاز حاصل کیا۔

بھوپال میں تعلیم یافتہ لوگوں کی شرح 85 فیصد تھی۔ جس میں مرد حضرات 90 فیصد اور خواتین کی شرح خواندگی 80 فیصد تھی۔ یہاں صرف مسلمان ہی کرتہ پائجامہ نہیں پہنتے تھے بلکہ ہندوؤں کا بھی یہی لباس تھا مسلم اور ہندو خواتین کا بھی ایک جیسا لباس تھا وہ شلوار فراق اور دوپٹے سے تن ڈھانپتی تھیں۔ لباس کے اعتبار سے مسلمانوں اور ہندوؤں میں کوئی فرق نہیں تھا۔ دونوں قوموں میں ہم آہنگی تھی۔ ایک دوسرے کے دکھ درد غمی اور خوشی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ پوری ریاست میں اُردو سرکاری زبان تھی۔ عام بول چال کے لئے اردو کو ہی استعمال کیا جاتا تھا۔ تاہم حکومت نے ہندی کو بھی اس کا جائز مقام دیا تھا۔

پرانا بھوپال

بھوپال شہر کی ابتداء سردار دوست محمد خاں کے ہاتھوں ہوئی۔ ان سے پہلے یہ ایک دیہات سے زیادہ نہ تھا۔ یہ جگہ ان کی بیوی فتح بی بی کو اتنی پسند آئی کہ اپنے شوہر سے اسے آباد کرنے کی فرمائش کر ڈالی۔ فتح بی بی سے سردار صاحب کو والہانہ عشق تھا کیوں کہ وہ صرف حسن میں یکتا نہیں تھیں بلکہ ایک باوفا شوہر پرست خاتون تھیں جنہوں نے سردار صاحب کی محبت میں اپنا ہندو دھرم ترک کر کے اسلام قبول کر لیا تھا۔ بھوپال کی بنیاد 1722ء کے بعد پڑی۔ یہ بتدریج ترقی کرتا گیا اور پھر سردار صاحب کی اولاد نے اسے اپنا پایہ تخت قرار دیا۔ ریاست کا دارالحکومت بننے کے بعد بھوپال نے دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کی۔ شہر میں سرکاری عمارتوں کے علاوہ نجی عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ شہر کے چاروں طرف فصیل بھی تیار ہوئی جس کے کئی دروازے تھے۔ ان دروازوں کے نام ہفتے کے دنوں پر تھے جیسے اتوارہ دروازہ، پیر دروازہ، منگل وارہ دروازہ، بدھ وارہ دروازہ اور جمعراتی دروازہ پہلے مرد حضرات نے ریاست پر حکومت کی ان کے بعد پھر خواتین نے اقتدار سنبھالا اور آخر میں نواب سلطان جہاں بیگم کے بیٹے حمید اللہ خاں کے زمانے میں ریاست کا اختتام ہو گیا اور یہ بھارت کا ایک حصہ قرار دے دی گئی۔ ڈاکٹر سلیم حامد رضوی صاحب نے قدیم اور جدید بھوپال کے احوال پر ایک سیر حاصل مضمون رسالہ نوائے سفینہ بھوپال میں تحریر کیا تھا بعد میں یہ سہ ماہی رسالہ فکر و آگہی دہلی میں 1996ء میں شائع ہوا۔ یہ مضمون انتہائی معلوماتی اور دلچسپ ہے۔ اس میں پرانے بھوپال کی خوب تصویر کشی کی گئی ہے۔ ذیل میں ہم اسے نذر قارئین کر رہے ہیں۔

''بھوپال تیزی کے ساتھ بدلتا جا رہا ہے اور اب تو یہ حالت ہوگئی ہے کہ جو لوگ یہاں پیدا ہوئے ہیں وہ بھی اپنے آپ کو اپنے بھوپال میں بڑی حد تک اجنبی محسوس کرنے لگے ہیں۔ نہ وہ اب پرانا شہر ہے نہ تہذیب نہ رسم و رواج اور نہ وہ ماحول۔ میں نے جس بھوپال کو اپنے بچپن میں دیکھا تھا وہ ایک چھوٹا سا شہر تھا۔ قلب شہر میں واقع جامعہ مسجد سے کسی بھی سمت پیدل چلے جاتے تو پندرہ منٹ میں آبادی سے باہر کھلے میدانوں اور کھیتوں میں پہنچ جاتے تھے۔ شہر کی آخری حدود میں ایک طرف پرانا قلعہ تھا دوسری طرف بڑا باغ تھا۔ اسی طرح عجائب خانے کی عمارت جس میں اب سینٹرل لائبریری ہے آبادی کا آخری حصہ تھا۔ اس کے بعد کھوارے یعنی سبزی کے کھیت تھے جو ریلوے اسٹیشن تک چلے گئے تھے۔ حمیدیہ روڈ کے دونوں طرف کھیت اور قبرستان تھے۔ ایک آبادی جہانگیر آباد کی تھی اور دوسری شاہجہاں آباد کی تھی۔ ان کے درمیان پختہ سڑکیں، تالاب اور سرکاری عمارتیں ضرور تھیں لیکن مکانات نہیں تھے۔ شہر خاص کے چاروں طرف ایک فصیل تھی جس میں مختلف سمتوں میں بڑے بڑے دروازے اور برج تھے۔ یہ دروازے ان دنوں کے نام سے موسوم تھے جن دنوں میں یہ کھولے جاتے تھے جیسے اتوارہ دروازہ اور پیر دروازہ وغیرہ۔ ایک امامی دروازہ بھی تھا جہاں سے شہر بھر کے تعزیئے کربلا لے جائے جاتے تھے۔ ایک گنوری دروازہ بھی تھا جو زمانہ قدیم سے قلعہ گنور کی جانب جانے والی سڑک کی طرف کھلتا تھا۔ بعد میں جب سلطان جہاں نے اقتدار سنبھالا تو اس وقت تک فصیل شہر کے باہر کافی آبادی بڑھ چکی تھی چنانچہ ان دروازوں کو رفتہ رفتہ توڑ کر نئی سڑکیں تعمیر کی گئیں۔

شاہ جہاں آباد بھی فصیلوں اور دروازوں سے گھرا ہوا تھا یہاں آبادی کے بڑھنے کے بعد انہیں توڑ دیا گیا تھا۔ اس وقت شہر کے دروازوں میں صرف جمعراتی دروازہ باقی ہے۔ اُس وقت شرفائے شہر زیادہ تر یا تو شہر پناہ کے اندر رہتے تھے یا جہانگیر

آباد اور شاہ جہاں آباد میں آباد تھے۔ یہاں شاہ جہانی دور میں کئی محل اور عالی شان عمارتیں تعمیر کی گئی تھیں۔ احمد آباد وہ جگہ تھی جہاں صرف نوابین اور ان کے متعلقین رہا کرتے تھے۔ لال پریڈ یا اس کے آس پاس کوئی عمارت نہیں تھی۔ بس یہ تھا پرانا شہر جس کی آبادی صرف 68 ہزار تھی۔ جب اسٹیشن کی طرف چاند بڑ میں ٹیکسٹائل مل قائم ہوا تو یہاں مزدوروں کی آبادی بڑھ گئی پھر 1941ء میں شہر کی آبادی 76 ہزار ہوگئی۔ اس وقت تک کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ کبھی شملہ پہاڑی، بان گنگا، بھدبھدے کی پہاڑی، ارے رے کا پہاڑ، رائسن روڈ اور حبیب گنج تک آبادی کا سلسلہ پہنچ جائے گا اور حمیدیہ روڈ کے دونوں طرف ایک شاندار بازار بن جائے گا۔ عجائب خانے سے اسٹیشن تک نئی عمارتیں اور بازار قائم ہو جائیں گے۔ شملہ کی پہاڑی عمارتوں سے ڈھک جائے گی۔ اس وقت تک شہر کے مکانات قدیم طرز کے تھے عام طور پر مکانات کی دیواریں پتھر اور گارے کی ہوتی تھیں جن پر بھوسے اور مٹی کو ملا کر پلاسٹر کیا جاتا تھا۔ شرفا اور خوش حال لوگوں کے مکانات اینٹ کے ہوتے تھے جن پر چونے کا پلاسٹر کیا جاتا تھا۔ زیادہ تر مکانات اینٹوں سے بنائے جاتے تھے۔ غریب اور متوسط طبقے کے لوگ مٹی اور پتھر سے دیواریں کھڑی کرتے تھے۔ دیواروں کی موٹائی سوا دو سے ڈھائی فٹ تک ہوتی تھی۔

دیواروں کے اندر لکڑیاں دی جاتی تھیں جو میالوں کو روکنے میں مدد دیتی تھیں۔ مکان زیادہ تر کھپریل کے ہوا کرتے تھے۔ مٹی کے بنے ہونے کی وجہ سے بارش کے موسم میں اکثر مکانات گرا کرتے تھے۔ امراء کے مکانات پتھر اور چونے کے ہوا کرتے تھے جن کی بنیاد ڈالنے کے لئے چونا پیسنے کی چکی لگا دی جاتی تھی۔ زیادہ تر مکان ایک منزلہ ہی ہوتے تھے۔ شہر میں کھنڈر نما مکانات کافی تھے جن کی بدنمائی کو چھپانے کے لئے حکومت ان کے چاروں طرف دیوار بنا دیتی تھی۔ غریب لوگ کرائے پر رہتے تھے۔ اُس وقت مکان کی تعمیر کے لئے ریاستی حکومت قرض دیا کرتی تھی مگر یہ رقم بہت کم

ہوتی تھی جس سے چھوٹا سا سادہ مکان ہی بن سکتا تھا۔ سیمنٹ اس وقت گو کہ بازاروں میں دستیاب تھی مگر اسے صرف امیر لوگ اپنے مکانوں کی تعمیر کے لئے استعمال کرتے تھے۔ سرکاری عمارات سیمنٹ سے ہی تیار کی جاتی تھیں۔

جہاں تک صنعت کا تعلق ہے شہر میں بس اتنی صنعت تھی جتنی کہ کسی بستی میں ہونا ضروری ہے۔ بھوپال کے اطراف جنگلوں کی بہتات کی وجہ سے عمارتی و فرنیچر بنانے کی لکڑی وافر مقدار میں دستیاب تھی چنانچہ اس وقت شہر میں فرنیچر کے چند کارخانے قائم تھے۔ فرنیچر بنتا ضرور بھوپال میں تھا مگر اس کی کھپت باہر کے شہروں میں تھی۔ یہاں صرف تخت چوکیاں اور مسہریاں لکڑی کی بنی ہوئی استعمال ہوتی تھیں۔ پھر ایک برف کا کارخانہ اسٹیشن کے پاس قائم ہوگیا تھا۔ اس سے قبل برف اٹارسی اور جھانسی سے آیا کرتی تھی۔ یا پھر دیسی طریقے سے تھوڑی بہت تیار کر لی جاتی تھی۔ پرانے لوگ برف کے استعمال کو بہت برا سمجھتے تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ برف کا استعمال عام ہوگیا اور ایک برف کا کارخانہ نربدا کے نام سے قائم ہوگیا جو اب تک قائم ہے۔

جہاں تک شہر کی سڑکوں اور گلیوں کا تعلق ہے تو دونوں تنگ تھیں۔ سڑکیں چھوٹی اور ان میں جا بجا خطرناک موڑ تھے۔ سڑکیں گٹی اور سرخ مرم سے بنائی جاتی تھیں۔ جو دیکھنے میں حسین لگتی تھیں مگر سفید کپڑوں کے لئے بہت مہلک تھیں۔ ذرا چلنے سے پائنچے سرخ ہو جاتے تھے۔ بارش میں سڑکوں میں سرخ کیچڑ ہو جاتی تھی۔ سڑکوں پر روشنی کے لئے کانچ کی لالٹینیں لگی ہوتی تھیں۔ اب گلی کوچوں تک میں بجلی کے لیمپ لگ گئے ہیں۔ پہلے گلیاں کچی اور ناہموار تھیں ان پر جگہ جگہ گندگی کے ڈھیر نظر آتے تھے پھر پتھر کی نالیاں بنا دی گئیں اور گلیاں بھی تارکول سے بنا دی گئیں۔

شہر میں مختصر آبادی کے لحاظ سے کم ہی بازار تھے۔ اس وقت ابراہیم پورہ کے چوراہے سے بازار شروع ہو کر جامع مسجد کے گرد اگرد اور لوہا بازار سے جمعراتی دروازہ

کے باہر تک، اور پھر ڈاک خانہ تک بازار تھے۔ بعض محلوں میں بھی چھوٹے بازار اور بزریاں تھیں جن میں صرف روز مرہ ضروریات کی اشیاء مل جایا کرتی تھیں۔ ابراہیم پورہ بازار میں برف حلوائیوں کتھہ چھالیہ اور پان والوں کی دوکانیں تھیں۔ بھوپال کا سب سے بڑا اور شاندار بازار چوک تھا جہاں جامع مسجد کے جنوبی رخ پر ترکاری اور پھلوں کی دوکانیں سڑک پر لگتی تھیں۔ شمال مغرب کے رخ پر کپڑے کا سب سے بڑا بازار تھا۔ مشرق کی طرف صرافہ تھا۔ چوک میں فینسی گڈس کی بہت سی دوکانیں تھیں۔ یہاں گھڑی ساز جوتا فروش اور درزیوں کی بھی دوکانیں تھیں۔ شمالی سمت میں لوہا بازار تھا لوہا بازار میں بوہریوں کی دوکانیں تھیں جن میں لوہے کا سامان بکتا تھا۔ ارزانی کا یہ عالم تھا کہ کھانے پینے کا سامان دس سے پندرہ روپے میں اتنا آجاتا تھا کہ ایک مزدور سامان اٹھانے کے لئے کرنا پڑتا تھا۔ اس وقت ایک روپیے میں گندم 15 سیر، گھی 2 سیر، دالیں 6 سیر، شکر 4 سیر، چھالیہ 3 پاؤ آجاتی تھی۔ کپڑا اور دوسری اشیاء بھی سستی تھیں۔ اس دور میں دس روپے تنخواہ پانے والا ملازم آسائش کے ساتھ زندگی گزار لیتا تھا۔ بھوپال میں اس وقت صرف ایک امپیریل بنک تھا جہاں صرف دولت مند ہی اکاؤنٹ کھولتے تھے۔ متوسط طبقے کے لوگوں کو تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ بینک ہوتا کیا ہے اور اس کا گیا مقصد ہے۔ بعد میں بھوپال بینک قائم ہوا 1952ء تک بھی بھوپال اپنی ارزانی کی بدولت جنت ارضی کہلاتا تھا۔ پہلے دوکانوں میں ٹیلی فون نہیں تھے لوگ دوکانوں سے باہر سڑک پر کھڑے ہو کر سودا خریدا کرتے تھے تمام پھل گنتی سے ملا کرتے تھے مگر اب تول کر بکتے ہیں۔

پرانے بھوپال کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ روز مرہ ضروریات کی اشیاء پھیری والے گھر گھر لئے پھرتے تھے۔ ترکاری بیچنے کا کام عام طور پر عورتیں کیا کرتی تھیں جو گھروں کے اندر جا کر خواتین کو ان کی مرضی یا ضرورت کی سبزی مہیا کرتی تھیں

ان میں پھل والیاں بھی ہوتی تھیں جیسے اچار کروندے کلورے ککڑی بھٹے تینندو اور کھجوریں وغیرہ۔ ان کے مرد ملائی برف اور قلفی بیچا کرتے تھے۔ بازاروں میں چائے والے لمبی لمبی کیتلیاں لئے ہوئے چائے بیچتے تھے۔ پاپڑ بھجیے بھی بکا کرتے تھے۔ پرانے جوتے خریدنے والے اس طرح آوازیں لگاتے تھے ''بیا پرانے جوتے ہوئیں'' یہ چمار ہوتے تھے جو اس طرح جوتے خرید کر ان کی مرمت کے بعد شام کو بازاروں میں بیچتے تھے۔ کھانے پینے کی چیزوں میں پکا گوشت، کباب اور پائے کا سالن پھیری والے بیچتے پھرتے تھے۔ اس کے علاوہ قصائی کچے دل گردے کلیجی بٹیں محلے محلے یہ گا کر بیچتے تھے 'بٹیں لے لو بیا یا دل لے لو بیا دل'' گوشت کی دوکانیں بہت تھیں البتہ بکری کا گوشت کم بکتا تھا۔ کپڑے بیچنے والی عورتیں کپڑوں کے گٹھے لے کر گھروں گھر پھرتی تھیں۔ یہ ادھار پر بھی کپڑا بیچتی تھیں مگر ریٹ بازار سے دگنے ہوتے تھے۔ خواتین خانہ جو بازاروں میں نہیں جاتی تھیں۔ ان سے کپڑے خرید لیا کرتی تھیں۔ اسی طرح چوڑی والیاں گھروں میں آیا کرتی تھیں۔ اُس وقت بازاروں میں چوڑی پہننے کوئی خاتون نہیں جاتی تھی۔ فقیروں کا زور تھا فقیر لوگوں سے یوں مخاطب ہوتے تھے ''دے گا دلائے گا جو دے گا اس کا بھلا جو نہ دے اس کا بھی بھلا'' رمضان کے مہینے میں راتوں کو سحری کے لئے اٹھانا بھی ان ہی فقیروں کی ذمہ داری تھی۔ ان کی اس طرح صدا ہوتی تھی ''روزہ دارو جاگو سرگئی کا وقت ہوگیا'' بازاروں میں بہت فقیر پھرتے تھے۔ ان میں ایک گونگا فقیر تھا جو بنا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ اور بھی فقیر بہروپ بنا کر گھومتے پھرتے تھے اور دھمکا دھمکا کر بھیک مانگتے تھے۔ بعض نئے نئے سوانگ بھرتے تھے۔ مثلاً ایک صاحب گھوڑے پر سوار ہو کر حاکمانہ انداز میں للکار للکار کر بھیک مانگتے تھے۔

اس وقت موٹریں بہت کم تھیں۔ بڑے لوگوں کے پاس سواری کے لئے اپنی بگھی اور ٹم ٹم تھیں کچھ لوگوں کے پاس تانگے بھی تھے عام سواری کے لئے کرائے پر تانگے دستیاب

تھے سائیکلیں بھی عام ہوتی جارہی تھیں۔ شہر میں بیل گاڑیاں بہت تھیں۔ میونسپلٹی کی اپنی کچرا گاڑیاں تھیں جن میں تندرست وتوانا بیل جوتے جاتے تھے۔ ان گاڑیوں سے گرمیوں میں سڑکوں پر چھڑکاؤ بھی کیا جاتا تھا۔ تانگوں کے علاوہ عورتوں کی سواری کے لئے ڈولیاں بھی ہوا کرتی تھیں ہر محلے میں ان کے اڈے ہوتے تھے۔ ان میں دو سواریاں بیٹھ جایا کرتی تھیں زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ سواری ناپید ہوگئی۔"

☆☆☆

JALALI BOOKS KUTUB KHANA

بھوپال کے قلعے اور محلّات

بھوپال کو اگر محلوں کا شہر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا تاہم اس کے ارد گرد کئی قدیم قلعے واقع ہیں جن میں رائیسین کا قلعہ سب سے قدیم ہے۔ یہ قلعہ بھوپال سے 26 میل دور اور سلامت پور ریلوے اسٹیشن سے صرف 12 میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ قلعہ ایک پہاڑی پر واقع ہے جو سطح سمندر سے 1980 فٹ بلند ہے۔ اس قلعہ کی قدامت کا تاریخ ببانگ دہل اعلان کرتی ہے کہ یہ قبل مسیح سے تعلق رکھتا ہے۔ ایک طرف اس قلعے کے بارے میں تحریری ریکارڈ پندرہویں صدی عیسوی سے شروع ہوتا ہے مگر چونکہ اس قلعے کی قدیم تاریخ پر تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے چنانچہ اس علاقے میں جن قدیم خاندانوں نے حکومت کی ان کی قدامت سے قلعے کی قدامت کے بارے میں ایک واضح عندیہ ملتا ہے۔ اس علاقے میں جن قدیم حکمران خاندانوں نے حکومت کی ان میں موریا، سنگا، آندھے، چھاترپ، گپت ہن، پرمارا اور چالوکیہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ''ہن قوم'' کی شکست کے بعد 528ء سے 1050ء کے درمیانی عرصے کی تاریخ مبہم ہے۔ یہ وہ دور تھا جب ہندوستان مختلف چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم تھا کوئی مرکزی حکومت نہ تھی چنانچہ کوئی مرکزی مضبوط دفاعی نظام بھی نہ تھا۔ ایک طرف غیروں کے تسلط کے لئے حالات سازگار تھے تو دوسری جانب ہندوستان کی اس وقت کی ریاستیں خود باہم دست و گریباں تھیں ایک خاندان کی حکومت کو دوسرا خاندان ختم کرتا رہا ایک ریاست دوسری ریاست پر قبضہ کرتی رہی۔ یہی وجہ تھی کہ سلطان محمود غزنوی کو ہندوستان پر حملہ کرنے کا موقع میسر آیا اور وہ کامیاب بھی ہوئے۔ ہندوستان پر ان کے

سترہ حملے بہت معنیٰ رکھتے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس وقت ہندوستان میں طوائف الملو کی تھی ساری ریاستیں کمزور تھیں حتیٰ کہ وہ اپنی عبادت گاہوں کی حفاظت کے بھی اہل نہ تھے جب ہی محمود غزنوی نے سومناتھ پر کئی حملے کئے اور وہاں موجود زر و جواہر غزنی لے گئے اس کے بعد ان کے بیٹے مسعود غزنوی نے بھی ہندوستان پر حملے کئے۔ سلطان مسعود غزنوی کے وقت مالوہ یعنی بھوپال کے علاقے میں پر مارا خاندان کا چشم و چراغ راجہ بھوج حکومت کر رہا تھا وہ ایک ذہین بادشاہ تھا اس نے اپنی ریاست کو خوش حالی دینے کے ساتھ دفاعی طور پر مضبوط رکھا تھا چنانچہ یہ واحد راجہ تھا جس نے اپنی فوجوں سے سلطان مسعود کا مقابلہ کیا تھا۔

قلعہ رائے سن کی تاریخ :

راجہ بھوج کے بعد سے اس علاقے کے حالات جستہ جستہ تاریخ میں ملتے ہیں اور قلعہ رائے سین کے بارے میں بھی معلومات ملتی ہیں۔ قلعہ کے نام سے یہ بات ضرور پتہ چلتی ہے کہ اسے کسی راجہ رائے نے تعمیر کرایا ہوگا۔ مقامی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ قدیم زمانے میں ایک راجہ رائے سنگھ نے اس قلعہ کی بنیاد ڈالی تھی۔ ظن غالب ہے کہ کثرت استعمال سے اس قلعے کا نام ''رائے سین'' پڑ گیا۔ اس روایت کو اس لئے بھی درست تسلیم کیا جاسکتا ہے کیوں کہ شہنشاہ بابر نے اپنی خودنوشت ''تزکِ بابری'' میں اس قلعے کو رائے سنگھ کے نام سے موسوم کیا ہے۔ روائتوں کے مطابق اس قلعے کی تعمیر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے دو یا تین صدی قبل عمل میں آئی ہوگی البتہ اس قلعے کی تعمیر رائے گڑھ مدھیہ پردیش بھارت کی قدیم غاروں میں جو تصاویر بنائی گئی ہیں اس دور کے بعد عمل میں آئی ہوگی کیوں کہ اس قلعے کے شمالی دروازے پر ایک پتھر لگا ہوا ہے جس پر شکار کا منظر کندہ ہے۔ یہ نقش رائے گڑھ کی غاروں میں بنائی گئیں تصاویر سے ملتا

جلتا ہے۔ روایات سے پتہ چلتا ہے کہ دوسری اور تیسری قبل مسیح میں یہاں بدھ مت مذہب عروج پر تھا۔ اس کا ایک ثبوت قلعے میں واقع ''استوپ'' ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قلعے کی تعمیر کرانے والے حکمراں بھی بدھ مذہب کے ماننے والے تھے یہاں کے بعض استوپ ایسے ہیں جن پر کتبے لگے ہوئے ہیں۔ تاہم بہت قدیم ہونے کی وجہ سے ان پر کندہ تحریریں مٹ گئی ہیں۔ پھر بھی محققین کے مطابق ان ''استوپ'' کی تعمیر چوتھی یا پانچویں صدی عیسوی میں ہوئی ہوگی۔ اس علاقے پر گپت خاندان کی حکمرانی کے شواہد بھی موجود ہیں مشہور بادشاہ چندر گپت کٹر بدھ مذہب کا پیرو کار تھا لیکن بعد کے زمانے میں اس علاقے میں بدھ مت پر ہندو مت غالب آ گیا تھا۔ اس قلعے پر مسلمانوں کا قبضہ 1469ء میں ہوا اس وقت ہندوستان پر خلجی خاندان کی حکومت تھی۔ محمود خلجی کے بیٹے غیاث الدین نے اسے فتح کیا اور اس کے اندر ایک مسجد اور ایک مندر تعمیر کرایا تھا۔ قلعے کے اندر جو عمارتیں بنی ہوئی ہیں گو کہ وہ بہت پرانی ہیں مگر ان کی حالت قابل اطمینان ہے۔ ان عمارات میں چار محل، چار مندر، دو مساجد اور کچھ تالاب ہیں۔ یہاں چند مزارات بھی ہیں۔

مسجد (جو خانم الملک کی مسجد کہلاتی ہے) بارہ دری، عطر دان اور ایمیا کا مندر بہت اچھی حالت میں ہیں۔ قلعے کے مغربی دروازے بھی اچھی حالت میں ہیں۔ ایک دروازے پر کتبہ موجود ہے مگر اس پر کیا لکھا ہے پڑھا نہیں جاتا۔ شاید دست برد زمانہ کی وجہ سے اس کی عبارت مٹ گئی ہے۔ قلعے کے اندر دیگر عمارات بھی ہیں جن میں خاص اہمیت کا حامل ایک ستون ہے۔ یہاں ایک میگزین ایک حمام اور ایک شفا خانہ ہے اس کے علاوہ تین چھوٹے مندر اور ایک نقار خانہ بھی ہے۔ قلعے کے تین دروازے ہیں دو جنوبی اور ایک شمالی۔ ان کے اوپر کتبے ہیں جن سے قلعے کی تاریخ پر روشنی پڑتی ہے۔ زیادہ تر عمارتوں پر گنبد بنے ہوئے ہیں، یہاں خوب صورت محرابیں ہیں جو

ہندوستان کے دوسرے قلعوں میں پائی جانے والی محرابوں سے زیادہ خوب صورت اور دلکش ہیں۔ دیواروں پر چونے کا موٹا پلاسٹر کیا ہوا ہے۔ پلاسٹر کے اوپر سفید چمک دار وارنش جیسے رنگ سے گُل کاری کی گئی ہے۔ یہ اگرچہ کچھ جگہ سے مٹ گئی ہے مگر بارہ دری کے بعض گوشوں میں اب بھی نمایاں ہے۔ قلعے کے چاروں طرف فصیل بنی ہوئی ہے۔ اس میں برج اور مورچے بنائے گئے ہیں۔ مزید پائیداری کے لئے پشتے بنائے گئے ہیں۔ قلعے کی حفاظت کے لئے چاروں طرف گہری کھائی کھودی گئی ہے۔ جب سلاطین مالوہ نے اس قلعے پر قبضہ کیا تو انہوں نے اسے اسلام آباد کا نام دیا۔ چنانچہ تاریخ فرشتہ میں درج ہے کہ محمد شاہ سلطان نے اسے شہزادہ احمد غوری کو جاگیر میں دیا۔ یہاں پر موجود امرتا مندر کے بارے میں تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ جب ترکمان الملک سلطان اسلام آباد (قلعہ رائے سین) کا حاکم تھا اس کے حرم کی ایک ہندو خاتون ''امرت بائی'' نے تعمیر کرایا تھا۔ وہ اس مندر میں گنیش بھگوان کی پوجا کرتی تھی۔ اسی عہد میں یہاں خانم الملک مسجد تعمیر ہوئی اس قلعے کو 1534ء میں ہمایوں نے فتح کیا تاریخ شیر شاہی میں درج ہے کہ 1542ء میں شیر شاہ نے مالوہ کا رخ کیا اس وقت قادر شاہ وہاں کا حکمران تھا شیر شاہ نے اسے تخت سے اتار کر اپنی حکومت قائم کی تھی اور ایک پرتاپ نامی شخص کو یہ قلعہ بطور جاگیر عطا کر دیا تھا۔ 1543ء میں شیر شاہ کو خبر ملی کہ اس نے قلعے میں دو ہزار عورتوں کو زبردستی اپنی بیوی بنا کر رکھا ہوا ہے۔ ان میں کچھ عورتیں مسلمان بھی ہیں۔ مسلمان عورتوں میں سادات بلگرام کی وہ خواتین بھی تھیں جنہیں باجبر حاصل کیا گیا تھا۔ شیر شاہ نے رائے سن قلعہ پر حملہ کر دیا اور ان مظلوم عورتوں کو آزاد کرالیا۔ اکبر اور جہانگیر کے عہد میں یہ سلطنت مغلیہ کا حصہ رہا۔ شاہ جہاں نے اس قلعے میں اپنے نامور جنرل نصیر المقلب عرف خانِ دوراں خاں کے حوالے کر دیا۔ اورنگ زیب نے اس کی وسیع پیمانے پر مرمت کرائی۔ 1760ء میں نواب بھوپال فیض محمد خاں صاحب

نے رائے سین پر قبضہ کیا 1791ء میں اسے ایک مرہٹہ سردار بالا راؤ کے حوالے کر دیا گیا مگر کچھ ہی دن بعد وزیر محمد خاں نے اسے واپس لے لیا تب سے یہ نوابین بھوپال کے قبضے میں رہا۔

قلعہ فتح گڑھ :

دوست محمد خاں نے رانی کملا پتی کے علاقے کو اس کے دشمنوں سے محفوظ بنا دیا تھا جس کے بدلے میں رانی نے بھوپال کا علاقہ دوست محمد خاں کو عطا کر دیا تھا۔ محققین کے مطابق بھوپال کا علاقہ دوست محمد خاں کو 23-1722ء میں ملا تھا۔ اس وقت یہاں ایک بڑا تالاب تھا یہ جگہ ایک گاؤں کی مانند تھی جس کی آبادی تقریباً ایک ہزار نفوس پر مشتمل تھی اسی دور میں دوست محمد خاں نے منگل گڑھ کے حکمران خاندان کی ایک ہندو لڑکی کو مسلمان بنا کر شادی کر لی تھی۔ اس کا نام فتح بی بی رکھا گیا تھا۔ جب دوست محمد خاں کو بھوپال مل گیا تب بھی وہ اسلام نگر میں مقیم رہے۔ اور وہ اپنی بیوی کے ہمراہ اکثر راتوں کو شکار کے لئے بھوپال تال آیا کرتے۔ اس جگہ کا حسن قابل دید تھا کہتے ہیں کہ کسی حسین رات میں فتح بی بی نے فرمائش کر دی کہ اس خوب صورت جگہ کو آباد کرنا چاہیے۔ سردار صاحب اپنی وفا شعار اور حسین بیوی کی بات کو نہ ٹال سکے اور ایک جمعہ کے مبارک دن رائے سین کے قاضی محمد معظم کے دست مبارک سے ایک قلعے کا سنگ بنیاد رکھ دیا گیا۔ اس قلعے کی تعمیر تیزی سے شروع ہوئی جس میں سردار صاحب کے ساتھ ان کی بیوی نے بھی ہاتھ بٹایا۔ قلعے کی تعمیر پچھلی فصیل سے شروع ہوئی جہاں ایک برج میں ایک چھوٹی سی مسجد بنی ہوئی ہے۔ اس کو ڈھائی سیڑھی کی مسجد کہا جاتا ہے۔ یہی بھوپال کی سب سے پہلی مسجد ہے۔ قلعہ کے دو حصے ہیں اندرونی حصے کو بالائے قلعہ کہا جاتا ہے۔ یہاں کچھ رہائشی عمارتیں، اسلحہ خانہ اور ایک بڑی مسجد بھی واقع ہے۔ جس کے

سامنے ہی سردار دوست محمد اور ان کی بیوی فتح بی بی کی قبریں ہیں۔ قلعہ کے سب سے بالائی حصے پر ایک دمدمہ بنا ہوا ہے جہاں سے مدتوں روزانہ رمضان میں افطار وسحر عیدین اور شاہی خاندان کی خوشیوں کے مواقع پر توپیں داغی جاتی تھیں۔ یہاں ایک دھوپ گھڑی بھی نصب تھی۔ یہاں قرآن شریف کا ایک نادر نسخہ بھی رکھا گیا تھا جس کی لمبائی پانچ فٹ اور چوڑائی ڈھائی فٹ تھی یہ قرآنی نسخہ اور دھوپ گھڑی اب وہاں موجود نہیں ہیں۔ قلعہ کے چاروں اطراف کئی میل لمبی فصیلیں تعمیر کی گئی ہیں ان میں چھ دروازے ہیں جنہیں اس وقت رات کو بند کر دیا جاتا تھا۔ قلعہ اور اس کی فصیلوں کی تعمیر کے بعد جب یہ جگہ بالکل محفوظ ہوگئی تو سردار صاحب نے اپنے وطن اور کرزئی سے اپنے عزیز رشتہ داروں کو یہاں بلانا اور آباد کرنا شروع کر دیا۔ شہر پناہ کے دروازوں کے نام یہاں آباد ہونے والی اقوام کے پیشوں کے لحاظ سے موسوم ہوئے۔

قلعہ گنور :

یہ ایک قدیم قلعہ تھا جس پر گنور کے راجہ کا قبضہ تھا ان کی بیوی کملا پتی نے گو کہ یہ علاقہ سردار دوست محمد خاں کو دے دیا تھا مگر وہ اس قلعے پر بدستور قابض رہی اور اس پرانے قلعے میں اپنے لئے ایک نیا محل تعمیر کرایا تھا جہاں وہ اکثر آیا کرتی تھی چونکہ قلعے سے ملحق بڑا تالاب ہے چنانچہ رانی کملا پتی اپنی سہیلیوں کے ساتھ اس میں غسل کیا کرتی تھی۔ اس پرانے قلعے کے دو دروازے تھے ایک ریت گھاٹ اور دوسرا شملہ پہاڑی کی جانب کھلتا تھا ایک چھوٹا دروازہ سیڑھیوں کے ساتھ بڑے تالاب کی جانب تھا۔ اب یہ قلعہ کھنڈر بن چکا ہے۔

اب ہم بھوپال کے محلات کا ذکر کر رہے ہیں جو نوابین بھوپال نے تعمیر کرائے تھے ان محلات میں بعض اتنے خوبصورت اور قابل دید تھے جن سے ریاست کی شان و

شوکت اور جاہ وجلال جھلکتا ہے۔ ان ہی میں ایک ہوا محل ہے۔ ذیل میں ہم پہلے اس کی تفصیل بیان کر رہے ہیں۔

ہوا محل :

نواب نظر محمد خاں کی وفات کے بعد ان کی وصیت کے مطابق ان کی بیٹی سکندر بیگم جو ولی عہد ریاست تھیں کا نکاح اپنے چچازاد بھائی نواب جہانگیر محمد خاں سے 1835ء میں ہو گیا۔ شادی کے بعد سکندر بیگم اپنے شوہر کے ساتھ ہوا محل میں سکونت پذیر ہو گئیں مگر نواب نظر محمد خاں کے بھائی امیر محمد خاں نے سازشوں کا سلسلہ شروع کر دیا تا کہ ریاست کی فرمانروائی ان کے خاندان میں منتقل ہو جائے چنانچہ جہانگیر محمد خاں کو سکندر بیگم کے خلاف اس قدر بھڑکایا گیا کہ وہ ایک رات سکندر بیگم پر سوتے میں تلوار سے حملہ آور ہو گئے مگر خوش قسمتی سے وہ بچ گئیں۔ البتہ انہیں زخم آئے۔ جہانگیر خاں کے بدلے ہوئے تیور کے پیش نظر سکندر بیگم اپنی ماں نواب قدسیہ کے ساتھ اسلام نگر منتقل ہو گئیں۔ مگر جب جہانگیر خاں کا اچانک بھری جوانی میں انتقال ہو گیا تو دونوں ماں بیٹی اسلام نگر سے واپس بھوپال آ گئیں اور رہائش کے مسئلے کو حل کرنے کے لئے ہوا محل کی تعمیر شروع کروائی۔ چونکہ یہ ایک قانونی حکمراں کی رہائش اور دفتر کے طور پر تعمیر کیا جا رہا تھا چنانچہ اس کا نقشہ اس طرح بنایا گیا کہ یہ دونوں مقاصد بخوبی ادا ہو سکیں پھر اس کی تعمیر اس لحاظ سے بھی کی گئی کہ یہ ایک خاتون نواب کی پردہ داری کے لئے مناسب رہے۔ چنانچہ اس عمارت کو اس طرح تعمیر کیا گیا کہ اس کے مین گیٹ کے بعد ہی ایک تنگ ڈیوڑھی بنائی گئی جس میں ایک پالکی تو اندر جا سکتی تھی مگر ہاتھی اندر نہیں گھس سکتا تھا۔ ڈیوڑھی بالکل گیٹ کے سامنے نہیں ہے بلکہ بازو میں ہے۔ اس کے باہر سرے پر ایک چھوٹا سا دروازہ لگایا گیا ہے جس سے مین گیٹ کے کھلے رہنے کی صورت میں بھی

بے پردگی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ حتیٰ کہ ڈیوڑھی کے دروازے پر کھڑی ہوئی کوئی خادمہ باہر سے نظر نہیں آ سکتی۔ ہوا محل کا مین گیٹ مشرق کی جانب کھلتا ہے۔ اس گیٹ کے سامنے تقریباً چالیس فٹ پختہ میدان ہے، شمال کی جانب کچھ مکانات ہیں لیکن جنوب کی سمت میں محل کی دیگر عمارات واقع ہیں۔ چار دیواری کے اندر کے ۷۵پچھتر فیصد علاقے میں محل کی عمارتیں ہیں جب کہ ایک چوتھائی حصے میں عام لوگوں کے مکانات ہیں۔ اس کی تاریخی وجہ ہے اور وہ یہ کہ اس خطے میں پہلے سے موجود عوامی مکانات کو گرایا نہیں گیا بلکہ وہ باقی رہے اور ان میں رہنے والوں کی رہائش قائم رہی۔ اس طرح یہ رعایا کے ساتھ انصاف کی لاجواب مثال ہے۔ آج کے اس جمہوری دور کے لئے بھی یہ عوامی بالادستی کی ایک نادر مثال ہے۔ نواب سکندر بیگم کی اس سے ان کی رعایا پروری اور انسانی مساوات کی جھلک نظر آتی ہے۔ اسی ہوا محل کی تعمیر میں ایک ہندو کا مکان آڑے آ گیا تھا اسے لاکھ منایا گیا کہ وہ مکان کو سرکار کے حوالے کر دے اور معقول معاوضہ لے لے مگر اس نے ایک نہ مانی اور بالآخر ہوا محل کی تعمیر اس مکان کی زمین کو چھوڑ کر کی گئی جس سے ہوا محل کا ڈیزائن ایک غیر موزوں ساخت کا رہا۔ ہوا محل کوئی عظیم شاہی عمارت نہیں ہے یہ ایک سادہ عمارت ہے جو دو منزلوں پر مشتمل ہے۔ نام کے لحاظ سے یہ کوئی بہت ہوادار عمارت بھی نہیں ہے البتہ شمالی سڑک کی طرف جو بڑا کمرہ ہے اس کی دیوار میں جھروکے بنے ہوئے ہیں۔ ان سے بلاشبہ ہوا اندر داخل ہوتی ہے۔ ڈیوڑھی کے بعد ایک چھوٹا صحن ہے جس کے چاروں طرف وسیع کمرے ہیں۔ ان کے بعد مغرب کی جانب ایک اور صحن ہے جس کے چاروں طرف کمرے بنے ہوئے ہیں گو کہ یہ ایک شاندار محل ہے مگر اس میں شاہی رہائش کی کوئی نشانی نہیں ملتی۔ بیسویں صدی کے شروع میں یہاں ایک سرکاری مطبع خانہ موجود تھا جو نواب سلطان جہاں بیگم کی حکمرانی کے دور میں ایک نامور خوش نویس اور پتھر کے ماہر کندہ کار منشی سمیع الدین کی نگرانی میں جاری

تھا۔ یہاں 1929ء میں مدرسہ سلیمانیہ منتقل ہوا جو 1950ء تک یہاں قائم رہا۔ بھارت میں انضمام کے بعد ریاست کی جس طرح دوسری شاہی عمارتیں دیکھ بھال نہ ہونے سے تباہ ہو گئیں یہی حال ہوا محل کا بھی ہوا۔

عالی منزل:

یہ محل نما عمارت نواب شاہ جہاں بیگم نے تعمیر کرائی تھی۔ یہ عمارت گول گھر کے جنوب میں واقع ہے۔ اس عمارت کے احاطے کا دروازہ جو امیر گنج روڈ کے سامنے ہے اتنا بلند ہے کہ اس کا نام ہی عالی منزل کی مناسبت سے باب عالی یعنی بلند دروازہ رکھا گیا ہے۔ یہ نام دروازے کی لوح پر بھی اردو میں کندہ ہے۔ یہ عمارت 250 فٹ لمبی اور 80 فٹ چوڑی ہے عمارت کے اندر پانچ دالانوں پر مشتمل وسیع ہال ہے۔ اس کی چھت چوبی میالوں کی ہے۔ چھت پر جانے کے لئے سنگین زینہ ہے جس کی بیس سیڑھیاں ہیں۔ یہ نہایت خوب صورت اور دلکش عمارت ہے جس کے ہال کی دیواروں پر قد آدم آئینے لگے ہوئے تھے۔ درمیان میں شیروں کی کھالیں اور منقش شمع دان آویزاں تھے چھت میں رنگ برنگے قیمتی بلوریں جھاڑ فانوس لٹکے ہوئے تھے۔ ہال اعلیٰ قسم کے فرنیچر سے آراستہ تھا۔ فرش پر خوب صورت قیمتی قالین بچھائے گئے تھے اس کے میدان میں فرانسیسی طرز کی خوش نما دکانیں تھیں۔ بائیں جانب وسیع باغ تھا جس میں پھل دار درخت تھے۔ گلاب کے پھولوں کی قطار در قطار کیاریاں تھیں۔ یہ سب ریاست کے بھارت میں ضم ہونے کے بعد ختم ہو گئے اب یہ محل اجڑ کر ویران ہو گیا ہے۔

صدر منزل:

یہ عمارت اپنی خوب صورتی اور دل کشی میں نرالی شان رکھتی ہے یہ اہم عمارت اقبال میدان اور فائر بریگیڈ آفس کے درمیان واقع ہے۔ اس پرشکوہ عمارت

کے کئی دروازے ہیں جن پر پہرے دار تعینات رہتے تھے ان دروازوں کے نام باب قدسی، باب سکندر، باب شاہ جہانی اور باب سلطانی وغیرہ ہیں۔ اس عمارت میں سلطان جہاں بیگم احمد آباد منتقل ہونے تک قیام پذیر رہی تھیں۔ اسے ان کے شوہر احتشام الملک نواب احمد علی خان سلطان دولہا نے اپنی جاگیر کی آمدنی سے تعمیر کرایا تھا۔ یہ دو منزلہ عمارت ہے جس کے نچلے حصے میں ایک وسیع ہال ہے جس کے دونوں سروں پر اوپر جانے کے لئے سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔ نیچے ہی دو وسیع وعریض دالان ہیں جن میں سینکڑوں لوگوں کے بیٹھنے کی جگہ ہے۔ ان دالانوں کے علاوہ جنوبی سمت میں ایک اور دالان ہے اس دالان کی حد بندی دو فٹ اونچی خوب صورت جالیوں سے کی گئی ہے۔ اس میں خطیب کے خطاب کرنے کی جگہ بھی بنائی گئی ہے۔ صحن کے بیچوں بیچ ایک خوب صورت حوض ہے جس کے چاروں کناروں پر روشنی کے چار ستون ہیں۔ حوض کے پاس پھولوں کی کیاریاں بھی ہیں۔ صحن سے مشرق اور مغرب میں کمروں اور دالانوں کی قطاریں ہیں۔ کمروں کے دروازوں پر محرابیں بنائی گئی ہیں جن میں رنگین شیشے لگے ہوئے ہیں۔ اس عمارت کی بالائی منزل پر بھی کئی بڑے دالان کمرے اور چاندنی ہیں۔ ان دالانوں اور کمروں کی کھڑکیوں سے بڑے تالاب کا خوش نما منظر دیکھا جا سکتا ہے۔ اس عمارت کی نہایت تاریخی اہمیت ہے۔ سلطان جہاں کی تقریب صدر نشینی اسی عمارت میں 4 جولائی 1901ء میں انجام پائی تھی۔ سلطان جہاں کے بڑے بیٹے محمد عبید اللہ خاں پورے رمضان تراویح پڑھایا کرتے تھے۔ اسی عمارت کے سامنے میدان میں ایک بڑا شامیانہ نصب کیا جاتا تھا جہاں روزہ داروں کے آرام، افطار اور کھانے کا انتظام کیا جاتا تھا۔ سلطان جہاں بیگم کے دو بیٹوں کی شادی کی تقریب کے سلسلے میں یہاں دعوتوں کا اہتمام کیا گیا تھا۔ دعوتوں کے دوران بینڈ بجایا جاتا اور مہمانوں کا عطر و پان سے استقبال کیا جاتا تھا۔ اس موقع پر صدر منزل کو خوب سجایا گیا تھا رنگ برنگی لائٹیں لگائی گئی تھیں

جس سے پورا علاقہ بقعہ نور بن گیا تھا۔ اس عمارت میں مہمانوں کو عشائیہ دیا گیا تھا۔ شاہی خاندان کی تقریباً تمام ہی تقریبات اسی عمارت میں منعقد کی جاتی تھیں۔ ان تقریبات میں اراکین سلطنت اور معزز شہریوں کو مدعو کیا جاتا تھا سلطان جہاں جب اس عمارت سے قصر سلطانی احمد آباد منتقل ہوگئیں تو اس خوب صورت عمارت کو دربار کے لئے مختص کر دیا گیا تھا یہ دربار نواب حمیداللہ خاں تک یہاں لگتا رہا تھا۔ اسی دور میں یہاں کئی شاندار کل ہند مشاعرے بھی منعقد ہوئے تھے۔ یہ عمارت بھی نوابی دور ختم ہونے کے بعد بے رونق ہوگئی اور اب یہاں بھوپال میونسپل کارپوریشن کا صدر دفتر واقع ہے۔

☆☆☆

بھوپال کی مساجد

بھوپال کو اگر مسجدوں کا شہر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ نوابین بھوپال نے اپنی پوری ریاست میں مساجد کا جال بچھا دیا تھا۔ مساجد کی تعمیر میں ان کی زبردست دلچسپی اس امر کو بخوبی ظاہر کرتی ہے کہ وہ راسخ العقیدہ مسلمان تھے اور اپنی ریاست میں دینی غلبے کے داعی تھے۔ جب بھی کوئی نئی سرکاری عمارت یا محل تیار ہوتا اس کے ساتھ مسجد ضرور تعمیر کی جاتی۔ بھوپال کے عوام نے بھی نوابوں کی اس روش کو اپنا لیا تھا۔ چنانچہ جب بھی کوئی رئیس یا بڑا آدمی اپنی کوٹھی یا بنگلہ تعمیر کراتا اس کے ساتھ ایک مسجد ضرور تعمیر کراتا تھا۔ جب نواب دوست محمد خاں نے قلعہ فتح گڑھ تعمیر کرایا اس میں بھی مسجد تعمیر کرائی تھی ۔ یہ پہلی شاہی مسجد کہلاتی تھی اس سے متصل ایک بڑی باؤلی تھی چنانچہ اب یہ مسجد باؤلی والی مسجد کے نام سے مشہور ہے اسی قلعے میں ایک اور بھی مسجد واقع تھی جو اس وقت لال املی والی مسجد کہلاتی ہے۔ بھوپال میں تعمیر ہونے والی تیسری مسجد نبی باغ ہے جو شہر اور اسلام نگر کے درمیانی راستے میں واقع ہے۔ یہاں بھی ایک بہت بڑی اور گہری باؤلی ہے جس سے بجلی کے پمپ کے ذریعے پانی نکال کر قرب و جوار کے کھیتوں کو سیراب کیا جاتا ہے۔ دوست محمد خاں کی تعمیر کردہ پہلی مسجد اب گاندھی میڈیکل کالج کے احاطے میں واقع ہے جب کہ دوسری مسجد کملا پارک میں ہے۔

بیگمات کے دور میں بھوپال میں مساجد کی تعمیر کا ایک وسیع سلسلہ شروع ہوا جو آخری نواب بیگم سلطان جہاں تک جاری رہا۔ نواب قدسیہ بیگم نے 1832ء میں شہر کے مرکز میں ایک جامع مسجد کی تعمیر شروع کی یہ عظیم مسجد 26 برس تک تعمیر کے مرحلے

سے گزر کر 1857ء میں مکمل ہوئی۔ اس وقت اس کی تعمیر پر چھ لاکھ پچاس ہزار پانچ سو روپے خرچ ہوئے تھے اس مسجد کے چاروں طرف دکانیں ہیں۔ پرانے زمانے میں قائم ہونے والی یہ دکانیں اب بھی قائم ہیں۔ یہ شہر کا سب سے بارونق علاقہ ہے۔ نواب سکندر بیگم نے ایک وسیع اور خوبصورت مسجد تعمیر کرائی جو موتی مسجد کے نام سے موسوم ہے۔ یہ مسجد اس وقت اقبال میدان کے سامنے ہے۔

نواب شاہ جہاں بیگم کے عمارتوں کی تعمیر میں گہری دلچسپی لینے کی وجہ سے معمار بھوپال کے لقب سے مشہور ہوئی تھیں۔ آپ نے دہلی کی شاہی مسجد کی طرز پر دنیا کی تیسری بڑی مسجد کی بنیاد ڈالی اس کی تعمیر کا کام 1887ء میں شروع ہوا تھا۔ اس کی تعمیر کا کام شاہ جہاں بیگم کی 1901ء میں وفات تک جاری تھا۔ آپ کی وفات کے بعد اس کی تعمیر لیت ولعل کا شکار ہوگئی تھی۔ کئی برس کے بعد ایک مولانا محمد عمران خان کی کاوشوں سے 1979ء میں اس کی تعمیر کا کام مکمل ہوا تھا۔ یہ بھوپال کی سب سے عظیم مسجد تاج المساجد ہے۔ اس مسجد کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کی چھت برصغیر کی تمام بڑی مساجد سے بڑی ہے۔ لاہور کی شاہی مسجد، جامع مسجد دہلی، مکہ مسجد حیدر آباد دکن اور ٹیپو سلطان مسجد کے صحن ضرور بڑے ہیں مگر ان مساجد کی چھتیں تاج المساجد سے چھوٹی ہیں۔ اس کے میناروں کی اونچائی 206 فٹ ہے مین دروازے کی بلندی 74 فٹ اور صحن مسجد 325x325 فٹ ہے۔

بھوپال میں تعمیر ہونے والی دیگر مساجد میں ماں جی کی مسجد بھی کافی مشہور ہے۔ یہ مسجد ماں جی ممولا نے تعمیر کرائی تھی۔ موتی مسجد نواب سکندر بیگم نے تعمیر کرائی تھی مگر اس کی تعمیر ان کی بیٹی شاہ جہاں بیگم نے ان کی وفات کے بعد مکمل کرائی تھی۔ شاہ جہاں بیگم کا ابتداء میں قیام شوکت محل میں تھا وہاں جو مسجد تعمیر ہوئی اس کا نام شمس المساجد عرف ہیرا مسجد ہے۔ شاہ جہاں بیگم نے صدر منزل کے ساتھ جو مسجد تعمیر کرائی

اس کا نام آصفیہ مسجد ہے۔ شاہ جہاں بیگم نے جب تاج محل تعمیر کرایا تو اس کے ساتھ جو مسجد تعمیر ہوئی اسے زینت المساجد کا نام دیا گیا تھا۔ بے نظیر محل کے ساتھ جو مسجد تعمیر ہوئی اسے ریاض المساجد کا نام دیا گیا تھا۔ گلشن عالم کے ساتھ بھی ایک مسجد تعمیر ہوئی تھی جو اب چڑی خانے کی مسجد کہلاتی ہے۔ اس مسجد کے ساتھ ایک گول عمارت ہے یہ گول گھر کہلاتی ہے۔ اُس وقت اس میں کئی اقسام کی چڑیاں پالی گئی تھیں چنانچہ اس لحاظ سے چڑی والی مسجد کہا جانے لگا تھا۔ بادل محل کی تعمیر کے ساتھ جو مسجد تعمیر ہوئی تھی اسے خزانے والی مسجد کہا جاتا ہے۔ بادل محل میں اس زمانے میں ریاست کا خزانہ رہتا تھا۔ چنانچہ اس مناسبت سے اسے خزانے والی مسجد کا نام دیا گیا تھا۔ نواب صدیق حسن خان نے اپنے بیٹے نورالحسن خان کے نام پر نور محل بنوایا تو اس کے ساتھ ایک مسجد بھی تعمیر کرائی جو مسجد نور کہلائی۔ راجہ عبدالعلی خان نے پیر دروازے کے قریب اپنا محل بنوایا تو اس کے ساتھ ایک مسجد تعمیر کرائی جو راجہ صاحب کی مسجد کے نام سے مشہور ہوئی۔ ہوا محل کی تعمیر کے ساتھ بھی ایک مسجد تعمیر ہوئی تھی جو جامن والی مسجد کہلاتی ہے۔ سلطان جہاں بیگم نے بیرون شہر احمد آباد بسایا تو وہاں دو مساجد تعمیر کرائیں ان میں ایک مسجد صوفیہ اور دوسری مسجد عبرت کہلاتی ہے۔ سلیمانیہ مدرسہ کے ساتھ جو مسجد تعمیر ہوئی وہ سلیمانیہ مسجد کہلاتی ہے۔

مندرجہ بالا ذکر سے ثابت ہوتا ہے کہ بھوپال واقعی مساجد کا شہر ہے اور اس کے ساتھ یہ بات بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ نوابین بھوپال خواہ وہ مرد ہوں یا خواتین تمام دین پر چلنے والے صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے۔ جب ہی انہوں نے اپنے ہر محل کے ساتھ خانہ خدا بھی تعمیر کروایا تھا تا کہ وہاں فرزندانِ اسلام خدا کی بارگاہ میں حاضر ہو کر اپنی بندگی کا ثبوت پیش کریں اور ساتھ ہی ریاست کی ترقی واستحکام کے لئے دعا کریں۔

☆☆☆

1857ء کی جنگِ آزادی اور بھوپال

10 مئی 1857ء کو میرٹھ سے بھڑکنے والے جنگ آزادی کے شعلوں نے چند ہی دنوں میں پورے برصغیر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ برصغیر کے ہر خطے کے حریت پسند مسلمان اور ہندو قابض انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ انگریز اپنے خلاف اس بغاوت کو پوری قوت سے روکنے کی کوشش کر رہے تھے مگر انہیں کوئی کامیابی نہیں مل پا رہی تھی۔ انگریزوں کی زیر سایہ ریاستیں بھی اس جنگ آزادی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ وہاں کے حریت پسندوں نے بھی وہاں موجود انگریز فوج کے خلاف بغاوت شروع کر دی تھی۔ انہوں نے خاص طور پر چھاؤنیوں میں مقیم انگریزوں کو قتل کر ڈالا اور انگریزوں کی آبادیوں کو آگ لگا دی تھی۔ چونکہ یہ ریاستیں پہلے ہی انگریزوں سے وفاداری کا حلف اٹھا چکی تھیں چنانچہ ان کے لئے انگریزوں کی حمایت میں حریت پسندوں سے نمٹنا ازبس ضروری ہوگیا تھا مگر یہ ایک مشکل ترین چیلنج تھا۔ ریاست بھوپال میں بھی حریت پسندوں نے حالات خراب کر دیئے تھے ہر جگہ انگریزوں کے خلاف مار کاٹ شروع ہوگئی تھی سرکاری خزانے کو لوٹنے کی کوششیں کی جانے لگیں۔ 6 اگست 1857ء کو سیہور میں باقاعدہ بغاوت شروع ہوگئی۔ انگریزوں کے بنگلوں کو آگ لگا دی گئی۔ بیرسیہ میں جو انگریز تھے انہیں قتل کر دیا گیا اور سرکاری خزانے کو لوٹ لیا گیا۔ جیل خانہ اور میگزین کی عمارتوں کو توڑ ڈالا گیا اس کے فوراً بعد حریت پسندوں نے اپنی ایک متوازی حکومت بنام ''سپاہی بہادر'' تشکیل دے دی۔ انہوں نے ہر جگہ اس نئی حکومت کے جھنڈے لہرا دیئے ساتھ ہی مسلمانوں اور ہندوؤں

سے اپیل کی گئی کہ وہ اس نئی حکومت کے ہاتھ مضبوط کریں۔ انہوں نے اپنی حکومت کے تحت مختلف انتظامی ادارے بھی قائم کرنا شروع کر دیئے۔ ریاست بھوپال کی یہ بغاوت کئی اعتبار سے وسطی ہند اور مالوہ کی بغاوتوں سے قدرے مختلف تھی کیوں کہ بھوپال کے باغیوں نے بغاوت کو ایک بامقصد اور مثبت بنانے کی کوشش کی تھی۔ یہ ایک انقلابی اقدام تھا جس کے ذریعے برصغیر سے انگریزوں کو نکال کر حکومت کا حق دار عوام کو بنانا تھا۔ ریاست بھوپال میں انگریزوں کے خلاف سب سے پہلے علم بغاوت بلند کرنے والے فوج کے چار وطن پرست بہادر افسران تھے۔ اس فوج کی کمان براہ راست انگریز فوجی افسران کے ہاتھ میں تھی۔ حکومت کے خلاف قائم ہونے والی حکومت کے روح رواں ایک باغی رسال دار ولی شاہ تھے۔ اس بغاوت میں ولی شاہ کے ساتھ شریک تین افراد کا نام عارف شاہ، مہاویر اور رمجو لال تھا۔ اس وقت ریاست کا انتظام نواب سکندر بیگم کے ہاتھ میں تھا گو کہ قانونی حکمران ان کی بیٹی شاہجہاں بیگم تھیں مگر ان کے کم سن ہونے کی وجہ سے ریاست کا نظم و نسق چلانا سکندر بیگم کے ذمے تھا۔ سکندر بیگم کے والد نواب نظر محمد خاں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے درمیان ایک معاہدے کے تحت ریاست بھوپال کی فوج کے ایک حصے کو تربیت دینا انگریزوں کے ذمے تھا۔

اس فوج کے تمام اخراجات کو ریاست بھوپال کو برداشت کرنا پڑتا تھا۔ ریاست بھوپال کے فوجیوں کو بھرتی کے وقت ایک حلف نامہ بھر کر دینا پڑتا تھا کہ وہ ہمیشہ انگریز حکومت کے وفادار رہیں گے۔ ان فوجیوں کو تین سے چار روپے ماہانہ تنخواہ دی جاتی تھی جب کہ اس وقت قریبی ریاستوں گوالیار اور ہلکر کے فوجیوں کو سات سے آٹھ روپے ماہانہ تنخواہیں دی جا رہی تھیں۔ بھوپال کی فوج کو ریاست سے کئی قسم کی شکایات تھیں۔ جس کی وجہ سے ان میں غدر کے پہلے سے ہی بے چینی پائی جاتی تھی لیکن ریاست نے ان کی شکایات کے ازالے کے لئے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ ریاست میں

1854ء تک فوج کے ملازموں کو زرعی زمین پٹہ پر لینے کا حق تھا لیکن سکندر بیگم نے اس حق کو ختم کر دیا تھا اس وجہ سے فوجیوں میں مزید بے چینی بڑھ گئی تھی۔ جس طرح شمالی ہند میں بغاوتی چپاتیوں کی ترسیل کا کام ہو رہا تھا اسی طرح یہ چپاتیاں 13 جون 1857ء کو ریاست بھوپال کے شہر سیہور کے کچھ مواضعات میں پہنچیں اس وقت یہ چپاتیاں ایک شہر سے دوسرے شہر بھیجی جا رہی تھیں جو اس بات کی علامت سمجھی جاتی تھیں کہ ان علاقوں کے لوگ بغاوت سے متفق ہیں۔ جب حکومت بھوپال کو ان چپاتیوں کی سیہور میں آمد کا علم ہوا تو ان کی تقسیم کو روکا گیا۔ ابھی میرٹھ میں بغاوت کی ابتداء بھی نہیں ہوئی تھی کہ یکم مئی 1857ء کو بھوپال میں ایک باغیانہ پوسٹر کی پانچ سو کاپیاں بھوپال کی فوج میں تقسیم کی گئیں۔ اس پوسٹر میں لکھا تھا کہ انگریز حکومت ہندوستانیوں کے مذہبی معاملات میں مداخلت کر رہی ہے اس لئے اس حکومت کو ختم ہونا چاہئے۔ اس پوسٹر کو پڑھ کر بھوپال کے فوجیوں میں باغیانہ جذبات بھڑک اٹھے۔ اس کے بعد 10 مئی کو میرٹھ میں باقاعدہ بغاوت شروع ہوگئی تو بھوپال کے کئی فوجیوں نے رخصت لے کر دہلی کا رخ کیا تاکہ وہ بہادر شاہ کی مدد کر سکیں۔ بھوپال کی فوج کے ایک غیور شخص ماما قہار خاں کا جذبۂ حریت دیکھنے کے لائق تھا انہوں نے تنخواہ اور نوکری دونوں کو چھوڑ کر دہلی جانے کا فیصلہ کر لیا۔ پھر ان کی طرح کئی فوجیوں نے ایسا ہی کیا اور وہ بھی دہلی چلے گئے۔ باغیانہ پوسٹر کی جب خبر سکندر بیگم کو ہوئی انھوں نے اس کے خلاف ایک جوابی پوسٹر 4 جون 1857ء کو مطبع سکندری سے چھپوا کر فوج میں تقسیم کروایا۔ اس پوسٹر میں لکھا گیا کہ باغیانہ پوسٹر کے ذریعے بھوپال کی فوج اور عوام کو انگریز سرکار کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کی گئی ہے۔ جس سے خبردار رہنا ضروری ہے یہ عوام اور فوج کو انگریزوں سے بدظن کرنے کی کوشش ہے جسے ہم سب کو رد کر دینا چاہئے اور کسی غلط فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہئے۔ عوام اور افواج کا فرض ہے کہ وہ حکومت اور انگریزوں کے

وفادار بنے رہیں۔ اس کے ساتھ ہی سکندر بیگم نے باغیانہ پوسٹر کو بھوپال لانے اور تقسیم کرنے والوں کے خلاف تحقیقات کا حکم دیا۔ تحقیقات کے بعد معلوم ہوا کہ بھوپال کی فوج کے ایک دفعہ دار مولوی عبدالقیوم کو کوئی نامعلوم شخص اس پوسٹر کی کاپیاں دے کر گیا تھا۔ انہوں نے یہ کاپیاں شیو لال صوبہ دار کو دے دی تھیں۔ شیو لال نے انہیں فوج میں تقسیم کیا تھا۔ ان دونوں فوجیوں کے خلاف سخت کارروائی کی گئی لیکن حالات کی نزاکت کے تحت اس کارروائی کو مصلحتاً راز میں رکھا گیا۔ تاہم اس پوسٹر نے اپنا پورا پورا اثر دکھا دیا تھا اور انگریزوں کے خلاف بغاوت پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

رفتہ رفتہ بھوپال کی فوج میں انگریزوں کے خلاف جذبات ابھرنے لگے اسی دوران پڑوس کی گوالیار اور مالوہ ریاستوں میں انگریزوں کے خلاف باقاعدہ بغاوت شروع ہو چکی تھی۔ اس کا اثر ریاست بھوپال کی سیہور چھاؤنی پر بھی پڑا وہاں کے فوجی بھی انگریزوں کے خلاف بغاوت پر آمادہ نظر آنے لگے۔ چنانچہ حالات کی شدت دیکھ کر وہاں مقیم بھوپال کا انگریز پولیٹیکل ایجنٹ میجر ہنری ولیم گھبرا گیا اور اس نے سکندر بیگم سے درخواست کی کہ اسے اور اس کے ساتھیوں کو بحفاظت ہوشنگ آباد پہنچا دیا جائے۔ سکندر بیگم نے اپنے وفادار سپاہیوں کی حفاظت میں انہیں ہوشنگ آباد پہنچا دیا۔ چنانچہ 10 جولائی 1857ء تک سیہور چھاؤنی انگریزوں سے خالی ہوگئی تھی۔ سکندر بیگم کے انگریز پولیٹیکل ایجنٹ، اس کے ساتھیوں اور اہل و عیال کو بحفاظت ہوشنگ آباد پہنچانے پر بھوپال کی فوج میں سکندر بیگم کے خلاف جذبات ابھرنے لگے۔ یہ معاملہ اتنا بڑھا کہ باغی فوجیوں نے سکندر بیگم سے مطالبہ کر دیا کہ فوج کے جو سپاہی پولیٹیکل ایجنٹ اور ان کے لوگوں کو ہوشنگ آباد چھوڑنے گئے تھے انہیں فوج کی نوکری سے برخاست کر دیا جائے۔ بھوپال کے فوج کے اس وقت کے کمانڈر ان چیف بخشی مروت محمد خاں نے باغی فوجیوں کا یہ مطالبہ حقارت سے ٹھکرا دیا جس کی وجہ سے 11 جولائی 1857ء کو سیہور

میں کچھ سپاہیوں نے شکایت کی کہ بازار میں جو گھی اور شکر فروخت ہو رہی ہے اس میں ملاوٹ کی جا رہی ہے۔ اشیائے خورد ونوش میں ملاوٹ کی یہ شکایت اپنی نوعیت کی پہلی شکایت تھی جس پر تمام فوجیوں میں غصے کی لہر دوڑ گئی۔ کچھ مشتعل فوجیوں نے سیہور کی بعض دوکانوں پر حملہ کر کے انہیں توڑ پھوڑ ڈالا اور اس ملاوٹ کا ذمہ دار حکومت کو قرار دیا گیا حکومت کے خلاف چہ مہ گوئیاں ہونے لگیں اور پوری فوج میں زبردست غم و غصے کی لہر دوڑ گئی جس سے گھبرا کر وہاں کا کوتوال لالہ رام دین بھاگ کھڑا ہوا اس کے بعد امداد علی کو وہاں کا کوتوال مقرر کیا گیا مگر وہ بھی اپنے اوپر فوج کے حملے کے خطرے سے گھبرا کر روپوش ہوگیا۔ ان واقعات سے فوج کو حکومت کی کمزوری نظر آنے لگی اور ان کے حوصلے بلند ہوتے گئے۔

گو کہ فوج میں ضرور حکومت مخالف جذبات پیدا ہوگئے تھے مگر عوام میں حکومت مخالف رجحان نہیں تھا۔ شہر میں 11 اور 12 جولائی 1857ء کو دو ایسے اہم واقعات رونما ہوئے جنہوں نے حکومت کے لئے مزید مشکلات کھڑی کر دیں۔ 11 جولائی 1857ء کو شہر کی مسجد منکا شاہ میں بھوپال کے علماء کا ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں افغان پٹھان اور کچھ دوسرے لوگوں نے شرکت کی اس جلسے میں سکندر بیگم کو ان کی انگریز نوازی پر سخت تنقید کا نشانہ بنایا گیا ساتھ ہی انگریزوں کے خلاف جہاد کرنے کا اعلان کیا گیا۔ 12 جولائی کو پھر ایسا ہی جلسہ مسجد مدارالمہام صاحب میں منعقد ہوا جس میں انگریزوں کو قتل کرنے اور بہادر شاہ ظفر کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ان دونوں جلسوں کے انعقاد میں بھوپال کے شہری عادل محمد خاں نے کلیدی کردار ادا کیا تھا اسی دوران بھوپال کی فوج میں بھی کارتوسوں میں سور کی چربی استعمال ہونے کی شکایت عام ہوگئی۔ کچھ لوگوں نے یہ افواہ پھیلا دی کہ سکندر بیگم پوشیدہ طور پر کرسچین ہوگئی ہیں جب ہی وہ انگریزوں کا دفاع کر رہی ہیں۔ سکندر بیگم نے کارتوسوں میں چربی استعمال ہونے کی

شکایت پر فوج کے سپہ سالار بخشی صاحب کی موجودگی میں سیہور کے اسلحہ خانے میں جانچ کرائی۔ اس جانچ میں چھ صندوق میں رکھے گئے کارتوس مشتبہ پائے گئے جنہیں توڑ کر ان کے بارود کو توپوں کے گولوں کے بارود کے کام میں لایا گیا۔ اس کے باوجود بھی حریت پسندوں کے شکوک وشبہات دور نہیں ہوئے۔ رفتہ رفتہ ریاست کی فوج کے جوان باغیوں کے ساتھ شامل ہوتے جا رہے تھے۔ سکندر بیگم نے یہ خبر پا کر فوج کے سربراہ بخشی مروت محمد خاں کو فوج کے اس رجحان کو روکنے کے لئے اقدام کرنے کو کہا۔ انہوں نے سیہور میں ایک آرمی کمیٹی بنا دی جس میں فوج کے اعلیٰ افسران شامل تھے۔ تمام سپاہی روزانہ اس کمیٹی کے سامنے حاضر ہوتے تھے اور حکم عدولی کرنے والے فوجیوں کو جبری استعفے دینے پر مجبور کیا جانے لگا۔ حکم عدولی کے سلسلے میں اندور سے بلا اجازت ڈیوٹی چھوڑ کر سیہور آنے والے دو فوجیوں کو حکم عدولی او بغاوت پھیلانے کے جرم میں برخاست کر دیا گیا مگر یہ دونوں فوج میں بہت اثر ورسوخ رکھتے تھے۔ ان دونوں فوجیوں کو ریاست کی حدود سے باہر چلے جانے کا حکم دیا گیا تھا۔ اس واقعے نے بھی بھوپال کی فوج میں مزید اشتعال پیدا کر دیا تھا۔

اس اثناء میں بھوپال کے دو شہری فاضل محمد خاں اور عادل محمد خاں جو ضلع رائے سین کے جاگیر تھے نے انگریزوں کے خلاف ایک فوج بنا لی تھی۔ انہوں نے ریاست کے اطراف میں واقع ریاستوں کے باغیوں سے بھی ربط ضبط قائم کر لیا تھا۔ بھوپال فوج کے افغان سپاہی ان دونوں بھائیوں سے خاص ہمدردی رکھتے تھے۔ 10 جولائی 1857ء کو ریاست کی فوج کے سپہ سالار بخشی کو اچانک اطلاع ملی کہ فوج کی دو توپوں کو چرا لیا گیا ہے۔ انکوائری پر پتہ چلا کہ ان دونوں توپوں کو فاضل محمد خاں کے اشارے پر چوری کیا گیا ہے۔ مزید انکشاف ہوا کہ فاضل محمد خاں نے خفیہ طور پر ایک فوج تیار کر لی ہے وہ ریاستی فوج کے تمام اعلیٰ فوجی افسران کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

وہ وفادار فوجیوں کو قتل کر کے شہر میں لوٹ مار کے بعد دہلی جانے کا پروگرام بنا چکا ہے۔

فاضل محمد خاں اور عادل محمد خاں نہ صرف بھوپال کے فوجیوں کو بغاوت پر آمادہ کر رہے تھے بلکہ انہوں نے پڑوس کی ریاستوں کے والیان اور جاگیرداروں کو بھی بغاوت کے منصوبے میں شامل کر لیا تھا۔ جس کا واحد مقصد انگریزوں کو ہندوستان سے نکال باہر کرنا تھا۔ ان دونوں بھائیوں نے اس منصوبے میں بھوپال کے باغی وارث محمد خاں، اٹارسی کے نواب ابوسعید خاں، آگرہ کے راجہ چھتر سال، بان پور کے راجہ مردن سنگھ، راگھوگڈھ کے راجہ ٹھاکر دولت سنگھ، نرسنگڈھ کے راج کمار چھتر سلا اور محمد گڑھ کے نواب حافظ علی خاں کو شامل کر لیا تھا۔ اس زمانے میں فاضل محمد خاں ہوشنگ آباد پر حملے کا منصوبہ بنا رہے تھے اس لئے بھوپال اور برطانوی حکومت کی جانب سے دریائے نربدا کے دونوں کناروں پر انگریزی اور دیسی فوج کو گھاٹوں کی حفاظت کے لئے لگا دیا گیا تھا۔ فاضل محمد خاں نے بھوپال کے کئی فوجیوں کو خفیہ طور پر ریاست کی نوکری چھڑوا کر اپنی فوج کے لئے ان کی خدمات حاصل کر لی تھیں۔ اس وقت وہ اپنی فوج کو نو اور دس روپے تنخواہ دے رہے تھے۔ فاضل محمد خاں کی زیادہ تنخواہ کی پیشکش کی وجہ سے بھوپال کے فوجی جوق در جوق اس کی فوج میں بھرتی ہونے لگے۔ سکندر بیگم نے فاضل محمد خاں کے کارندوں کو گرفتار کرنے کے احکامات جاری کر دیئے مگر ان میں سے کوئی بھی گرفتار نہ ہو سکا۔

سیہور میں قائم ہونے والی سپاہی سرکار نے اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ انہوں نے اپنی عدالت قائم کر کے انتظامی امور کے لئے ایک کمیٹی بنا دی تھی۔ سکندر بیگم کی حکومت لاچار یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ باغیوں نے حکومت کے بجائے کسانوں اور تاجروں سے ٹیکس بھی خود وصول کرنا شروع کر دیا تھا۔ فوج کے کمانڈر بخشی کو سکندر بیگم کی طرف سے حکم دیا گیا کہ باغی سپاہیوں کو کسی طرح لالچ یا دھمکی دے کر ریاستی فوج میں واپس لایا جائے مگر بخشی لاکھ کوشش کے باوجود کامیاب نہ ہو سکے۔ سکندر بیگم نے فاضل محمد

خاں کی فوج میں شامل ہونے والے فوجیوں کو تنبیہ کی کہ اگر وہ ریاستی فوج میں واپس نہیں آئے تو ان کے خلاف سخت کارروائی کی جائے گی۔ ان کی املاک کو ضبط اور اہل خانہ کو گرفتار کر لیا جائے گا۔ کچھ فوجیوں کے ساتھ ایسا بھی برتاؤ کیا گیا مگر کوئی بڑی کامیابی نہ مل سکی۔

سیہور کے باغی فوجیوں کے سردار ولی شاہ اور مہاویر مقرر ہو گئے وہ سکندر جہاں کے سخت دشمن تھے۔ وہ سکندر جہاں کو انگریزوں کا ایجنٹ کہہ کر پکارتے تھے گو کہ سیہور میں باغیوں نے انگریزوں کو بہت نقصان پہنچایا تھا مگر انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ جب تک وہ بیرسیہ کی طرح سیہور میں حکومت قائم نہیں کریں گے اس وقت تک ان کو اپنے منصوبوں میں کامیابی نہیں ملے گی۔ چنانچہ انہوں نے انگریزوں کے خالی بنگلوں کو توڑ پھوڑ کر ان میں آگ لگا دی۔ 22 اگست 1857ء کو باغیوں نے ریاست کی اہم عمارتوں پر حملہ کیا ان میں پہلی عمارت پولیٹیکل ایجنٹ کا بنگلہ تھا۔ دوسری عمارت جس پر حملہ کیا گیا وہ انگریز فوجیوں کی رہائش گاہ تھی گو کہ یہاں کڑا پہرہ تھا مگر باغیوں نے سرکاری فوج کا مقابلہ کر کے ان پر قابو پا لیا اور عمارت کو توڑ پھوڑ ڈالا۔ اسی دن باغیوں نے سیہور کی جیل پر بھی حملہ کیا اور بڑی تعداد میں قیدیوں کو رہا کرا لیا۔ باغیوں کی ان کارروائیوں کو روکنے کے لئے سکندر بیگم نے اپنے وفادار فوجی سیہور روانہ کر دیئے جس سے باغیوں کی سرگرمیوں میں کمی آ گئی۔

3 ستمبر 1857ء کو بہادر شاہ ظفر کا ایک پیغام سکندر بیگم کو موصول ہوا۔ یہ پیغام ٹھاکر مردن سنگھ جاگیردار بان پور نے اپنے ایک قاصد کے ذریعے بیگم صاحبہ کو بھیجا تھا۔ بیگم صاحبہ نے یہ خط ہوشنگ آباد میں مقیم پولیٹیکل ایجنٹ کو بھیج دیا۔ اس خط کے مندرجات کچھ اس طرح تھے کہ بیگم صاحبہ انگریزوں کی طرف داری کو چھوڑ کر حریت پسندوں کی مدد کریں تا کہ ہندوستان کو غیر ملکی قابضین سے خالی کرایا جا سکے۔ اس خط پر بہادر شاہ ظفر کے دستخط اور شاہی مہر لگی ہوئی تھی۔ اس خط کے بعد جھانسی کی رانی لکشمی

بائی نے بھی ایک خط سکندر بیگم کو بھیجا جس میں اپیل کی گئی تھی کہ انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کے لئے وطن پرست سپاہیوں کی مدد کی جائے۔ اس کے جواب میں سکندر بیگم نے جھانسی کی رانی کو لکھا کہ وہ جو کچھ کر رہی ہیں وہ کریں اگر وہ ان کی نظر میں ٹھیک ہے۔ اس کے جواب میں رانی صاحبہ نے ایک خط سکندر بیگم کو ارسال کیا اور ان سے پھر اپیل کی کہ وہ انگریزوں کی حمایت کو ترک کر دیں مگر سکندر بیگم نے ان کی اپیل کو پھر رد کر دیا۔ اس کے بعد رانی صاحبہ نے طیش میں آ کر سکندر بیگم کو لکھا کہ میں جلد ہی اپنی موجودہ مہم سے فارغ ہونے کے بعد بھوپال آؤں گی اور اپنی تلوار کی نوک پر آپ کو انگریزوں کی مدد کرنے سے روک دوں گی۔

سکندر بیگم نے رانی صاحبہ کے اس دھمکی آمیز خط کے جواب میں لکھا "ریاست بھوپال کو فخر ہے کہ وہ ہمیشہ سے سلطنت برطانیہ کی وفاداری میں سرگرم اور ممتاز رہی ہے اور آئندہ بھی انگریزوں کی وفادار رہے گی۔ اگر آپ بھوپال آنا چاہتی ہیں تو جب جی چاہے آئیں میرا آتشیں توپ خانہ آپ کا مقابلہ کرنے کے لئے ہر وقت تیار ہے۔"

8 ستمبر 1857ء کو ریاست کی فوج کے سپہ سالار بخشی نے سیہور کے باغیوں کی فہرست تیار کرائی جس میں 137 باغیوں کے نام تھے ان میں ولی شاہ مہاویر، عارف شاہ اور رجو لال کے نام بھی شامل تھے۔ بخشی نے ان تمام لوگوں کو گرفتار کرنے کی تجویز سکندر بیگم کے سامنے رکھی لیکن ساتھ ہی یہ تجویز بھی دی کہ اسے اتنا خفیہ رکھا جائے کہ پولیٹیکل ایجنٹ کو بھی نہ بتایا جائے۔ مگر سکندر بیگم نے اپنے ایک خط کے ساتھ اس فہرست کو بھی پولیٹیکل ایجنٹ کو بھیج دیا۔ 6 اکتوبر 1857ء کو سکندر بیگم نے باغیوں کی گرفتاری کے لئے انعامات کا اعلان کیا۔ اس اعلان کی کاپیاں ہر ضلع میں بھیجی گئیں۔ باغیوں کی گرفتاری پر پچاس ہزار روپے کا انعام دینے کا اعلان کیا گیا تھا ساتھ ہی مرہٹوں کے آخری پیشوا نانا صاحب کو بھی گرفتار کرنے والے کے لئے پچاس ہزار

روپے دینے کا اعلان کیا گیا تھا۔ بعد میں یہ رقم بڑھا کر ایک لاکھ کر دی گئی تھی اس سے پتہ چلتا ہے کہ نانا صاحب جو ان دنوں کانپور کے علاقے میں انگریزوں کے خلاف سرگرم تھے کتنے بڑے انگریز دشمن تھے۔ اس سے پہلے برصغیر میں کسی کو گرفتار کرنے کے لئے اتنا بڑا انعام نہیں رکھا گیا تھا۔

اس وقت تک بھوپال کے باغیوں نے ریاست میں اپنے چار مراکز قائم کر لئے تھے ان میں پہلا مرکز بیرسیہ تھا جس کے قائد شجاعت خاں، کامدار خاں اور سرفراز خان تھے دوسرا مرکز سیہور میں تھا جس کے لیڈر ولی شاہ، مہاویر اور عارف شاہ تھے تیسرا مرکز گڑھی آنبہ پانی تھا جس کے سربراہ فاضل محمد خاں اور عادل محمد خاں تھے۔ چوتھا مرکز چھپانیر تھا جس کے قائد دولت سنگھ تھے ریاست بھوپال کے باغیوں نے سیہور میں اپنی جو متوازی حکومت سپاہی بہادر کے نام سے قائم کی تھی اس کو باقی تینوں مراکز سے اخلاقی و سیاسی مدد حاصل تھی لیکن اس مرکز کو باقی مراکز سے ابھی تک کوئی فوجی یا مالی مدد نہیں مل سکی تھی۔ فاضل محمد خاں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو دیکھ کر سکندر بیگم نے انہیں شکست دینے کے لئے ایک جامع منصوبہ تیار کیا اس کے تحت فاضل محمد خاں کے علاقے گڑھی انبہ پانی کو تین سمتوں سے گھیرنا، ان تینوں بھائیوں کو گرفتار کر کے قتل کرنا اور ان کی جائیداد کو ضبط کرنا شامل تھا۔ سکندر بیگم نے اپنے مشیروں کے مشورے سے گڑھی کے چاروں طرف زبردست فوجی جال بچھا دیا تھا۔ طے شدہ منصوبے کے تحت 7 اکتوبر 1857ء کو گڑھی پر حملہ کر دیا گیا اور کافی لڑائی کے بعد دو اہم مورچوں پر قبضہ کر لیا گیا تاہم ابھی بھی گڑھی پر قبضہ کرنا باقی تھا۔ چنانچہ 21 اکتوبر 1857ء کو گڑھی پر گولہ باری شروع کی گئی۔ تقریباً 16 دن تک یہ محاصرہ جاری رہا۔ بالآخر 27 نومبر کو سرکاری فوجوں کو فتح حاصل ہوگئی۔ گڑھی کی فتح کی خبر جب سکندر بیگم کو ملی انہوں نے فوراً دو رکعت نماز شکر ادا کی اور بھوپال شہر کے فتح گڑھ قلعے سے توپ کے پانچ سو گولے داغوائے۔ گڑھی پر تو

سرکاری فوجوں کا قبضہ ہوگیا تھا مگر فاضل محمد خاں اور عادل محمد خاں فرار ہو چکے تھے۔ اسی دوران ایک اور حریت پسند شجاعت علی خاں اور ان کے فرزند کو بغاوت کے الزام میں گرفتار کر کے گولیوں سے بھون دیا گیا اور انہیں اسلامی طریقے سے دفن کرنے کے بجائے گڑھا کھود کر ایک ساتھ دفن کر دیا گیا۔ اس طرح ایک اور حریت پسند وارث محمد خاں کو بھی شہر بدر کر دیا گیا ساتھ ہی ان کے اہل خانہ پر طرح طرح کے ظلم توڑے گئے۔ گو کہ وارث محمد خاں کا تعلق بھوپال کے نوابی خاندان سے تھا مگر ان کے ساتھ غیروں سے بھی بدتر برتاؤ کیا گیا۔ اسی اثناء میں بھوپال کے شہریوں نے جہانگیر محمد خاں کے بیٹے دستگیر محمد خاں کو سکندر بیگم کی جگہ نواب بنانے کی کوشش کی کیوں کہ نواب جہانگیر محمد خاں نے مرتے وقت یہ وصیت کی تھی کہ ان کے مرنے کے بعد ان کے بیٹے کو نواب بنایا جائے۔ یہ معاملہ پولیٹیکل ایجنٹ تک گیا تھا جہاں سکندر بیگم کی بات مان لی گئی اور وہ بدستور ریاست کی سربراہ رہیں اور ان کے بعد ان کی بیٹی شاہ جہاں بیگم کا نواب بننا طے ہوگیا۔

سکندر بیگم نے بغاوت کے بڑھتے طوفان کو دیکھ کر کچھ نئے حفاظتی انتظامات کی منظوری دے دی جس کے تحت سوم وارہ و امامی دروازوں کے پہرے داروں کو تبدیل کر دیا گیا نئے پہرے دار معز محمد خاں اور فوج دار محمد خاں تھے یہ دونوں بھائی سکندر بیگم کے ماموں تھے۔ اپنے داماد نواب امراؤ دولہا باقی محمد خاں کو بغاوت کو کچلنے کے لئے وسیع اختیارات دے دیئے گئے اس کے علاوہ بھوپالی فوج کو چوکس کر دیا گیا۔ سابقہ جاسوسی کے نظام کو مزید بہتر کر دیا گیا۔ تمام مشتبہ کردار کے شہریوں کو شہر بدر کر دیا گیا۔ گیٹ پاس یعنی ریاست سے باہر جانے کے اجازت نامے کے اجراء کے طریقے کو مزید سخت کر دیا گیا۔ کچھ وفادار فوجیوں کی ایک اسپیشل فورس تیار کی گئی اور اسے بھوپال سیہور روڈ کے بیچ میں کھجوری کے مقام پر کافی اسلحہ دے کر متعین کر دیا گیا۔ انہیں ہدایت دی گئی کہ جو بھی باغی سیہور سے بھوپال کی طرف آئے اسے فوراً ہلاک کر دیا جائے۔ اس

کے ساتھ بھوپال کے تمام مشتبہ شہریوں سے اسلحہ چھین لیا گیا۔

سکندر بیگم نے بغاوت کو ختم کرانے کے لئے اپنے داماد کو استعمال کرنے کا ایک منصوبہ بنایا۔ نواب امراؤ دولہا جن کا بھوپال کی فوج میں بہت اثر ورسوخ تھا فوج کو یہ پیش کش کی گئی کہ حکومت فوج کے تمام مطالبات کو ماننے کو تیار ہے اگر وہ پھر سے ایک معاہدے کے ذریعے اپنی وفاداری کا یقین دلا دیں۔ جب اس اقرار نامے کو فوج کے سپاہیوں کے پاس بھیجا گیا تو باغیوں نے اس پر دستخط کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ انکار کے وقت سپاہیوں نے اپنے ردعمل کا ان الفاظ میں اظہار کیا تھا۔

''نواب امراؤ دولہا صاحب کی کوئی سرکاری یا دستوری حیثیت نہیں ہے اس لئے ان کو باغیوں اور حکومت کے درمیان ثالثی کرانے کا کوئی حق نہیں ہے۔ باغیوں نے یہاں تک کہا کہ نواب صاحب کی یہ بزدلی اور نامردی ہے کہ وہ سکندر بیگم کے مطیع بنے ہوئے ہیں۔ ان کے قول و فعل کا اعتبار نہیں۔ یہ محض دھوکا ہے کہ آج ان کو ہمارے درمیان میں ڈالا جا رہا ہے۔''

بعض باغیوں نے یہاں تک کہا کہ نواب صاحب ہم کو اس پرفریب اقرار نامے کے ذریعے جکڑ کر ہماری جدوجہد آزادی کو ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ حالانکہ نواب صاحب کا بھوپال کی فوج پر بھاری اثر تھا اور کئی وجوہ سے فوج کا ایک قابل لحاظ حصہ ان کے اوپر بھروسہ کرتا تھا لیکن اس وقت بھوپال کی فوج میں باغیانہ جذبات اس حد تک بڑھ گئے تھے کہ فوج کے اندر ان کی ہردل عزیزی تقریباً ختم ہوگئی تھی اور سپاہی بلاجھجک اعلان کر رہے تھے کہ

''دوماہ اور زرلین کی رقم کی ادائیگی کے بعد ہم دستگیر محمد خاں کو تخت نشین کریں گے۔ نواب امراؤ دولہا اور سکندر بیگم کو قید کر کے جہاد پر کمر باندھیں گے اور ناگ پور تک کا علاقہ انگریزوں سے آزاد کرائیں گے مگر ہمارا پہلا جہاد یہی ہوگا کہ ہم نواب

امراؤ دولہا اور سکندر بیگم کو معزول کر کے دستگیر محمد خاں کو رئیس بنائیں''۔

1857ء کے دسمبر کے مہینے میں ایک دن اچانک باغیوں نے سکندر بیگم کے موتی محل کا محاصرہ کر لیا۔ اس اچانک حملے سے محافظ سپاہی بھی بے بس ہو گئے تھے باغیوں نے مطالبہ کیا کہ سکندر بیگم کو ان کے حوالے کیا جائے یہ محاصرہ اس قدر فوجی حکمت عملی اور سرعت سے ہوا تھا کہ صرف دو فرلانگ دور بھوپال آرمی کے ہیڈ کوارٹر تک کو خبر نہ ہو سکی اور وہ محاصرہ کو روکنے کے لئے کچھ نہ کر سکا۔ موتی محل کے باہر مشتعل فوجی بیگم صاحبہ کے خلاف خطرناک نعرے لگا رہے تھے جس سے ارد گرد کے رہائشی بھی کانپ رہے تھے۔ اس خطرناک صورت حال سے بھی سکندر بیگم ذرا نہ گھبرائیں۔ انہوں نے نواب امراؤ دولہا کو فوراً طلب کیا اور ان سے اس محاصرے کو ختم کرانے کی درخواست کی۔ گو کہ اس وقت ماحول بے حد خطرناک تھا مگر نواب صاحب تن تنہا مشتعل ہجوم کے اندر گئے اور بڑے تحمل کے ساتھ باغیوں سے ان کے مطالبات معلوم کئے جس کے جواب میں زیادہ تر باغیوں نے کہا کہ ہم کو ہمارا روپیہ دے دو تو ہم محاصرہ ختم کر دیں گے جس پر نواب صاحب نے انہیں یقین دلایا کہ کل صبح لال پریڈ گراؤنڈ میں ان کے زرلین اور دو ماہے کی رقم ادا کر دی جائے گی۔ دوسرے دن صبح تمام فوجی لال پریڈ گراؤنڈ میں جمع ہو گئے جنہیں خود نواب صاحب نے زرلین اور دو ماہے کی رقم ادا کی جو فوجی اس وقت وہاں نہیں آ سکے تھے انہیں بعد میں یہ رقم ادا کر دی گئی۔ اس کے بعد موتی محل کا محاصرہ ختم کر دیا گیا کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد بھوپال میں بغاوت ختم ہو گئی تھی مگر مبصرین کا کہنا ہے کہ یہ بات سرکاری دستاویزوں میں کہی گئی ہے مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔ بغاوت پھر بھی باقی رہی اور سکندر بیگم کو اسے ختم کرنے کے لئے کافی محنت کرنا پڑی تھی۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ دہلی پر انگریزوں کے قبضے کے بعد جہاں پورے ہندوستان کے آزادی کے متوالوں کے حوصلے پست ہو گئے تھے اور مجاہدین نے کئی جگہ ہتھیار ڈال

دیئے تھے اسی طرح ریاست بھوپال کے باغی بھی سست پڑ گئے اور ان کی سرگرمیوں میں بھی کمی آ گئی۔ اس صورت حال کا سکندر بیگم کو کافی فائدہ ہوا اور انہوں نے نئے سرے سے ریاستی فوج کو منظم کرنا شروع کر دیا۔

بیرسیہ اور سیہور کے باغیوں کی جدوجہد کے کمزور پڑ جانے کے بعد بیگم صاحب کے سر پر فاضل محمد خاں اور عادل محمد خاں کے آخری فوجی مرکز راحت گڑھ پر فوج کشی کرنے کی تیاری کا بوجھ سوار تھا ادھر فاضل محمد خاں نے راحت گڑھ کے قلعے کو مضبوط بنانا شروع کر دیا تھا اس وقت بھی اس کے پاس اتنی فوجی طاقت موجود تھی کہ سکندر بیگم کے لئے انہیں زیر کرنا آسان نہ تھا۔ اس لئے بیگم صاحبہ نے راحت گڑھ کو فتح کرنے کے لئے انگریزوں کی مدد حاصل کرنے کے لئے کوششیں شروع کر دیں۔ چنانچہ جنوری 1858ء کے وسط میں جنرل ایچ روز کی کمان میں ایک مضبوط فوج بمبئی سے اندور ہوتی ہوئی بھوپال پہنچ گئی۔ یہاں بھوپال میں اس فوج کا شاندار استقبال کیا گیا۔ انگریز فوج کی آمد سے سکندر بیگم کے حوصلے اور زیادہ بلند ہو گئے اور انہوں نے اس فوج کے ذریعے اپنے دشمنوں کو نیست و نابود کرنے کے لئے منصوبہ بنانا شروع کر دیا۔ بیگم صاحبہ نے سب سے پہلے سیہور کے باغیوں کو ٹھکانے لگانے کے لئے جنرل روز سے درخواست کی۔ چنانچہ جو باغی سیہور جیل میں قید تھے ان پر مقدمہ چلائے بغیر ہی جیل سے باہر نکال کر ایک گراؤنڈ میں ٹکڑیوں کی صورت میں کھڑا کر کے گولیوں سے بھون دیا گیا۔ اس طرح کم و بیش 356 حریت پسند فوجیوں کو جان سے مار دیا گیا۔ ان حریت پسندوں کی یہ بات قابل تعریف ہے کہ انہوں نے اپنی جان بچانے کے لئے سکندر بیگم اور انگریزوں سے معافی نہیں مانگی تھی۔

جس دن ان 356 حریت پسندوں کے قتل عام کا دردناک واقعہ پیش آیا اس سے دس دن قبل سیہور میں سپاہی بہادر کے دو نامور حریت پسندوں کو ایک سنسان جگہ

لے جا کر پھانسی پر لٹکا دیا گیا تھا ان کے نام شجاعت خاں اور سرفراز خاں تھے۔

سیہور میں حریت پسندوں کا قتل عام کرنے کے بعد جب جنرل روز بھوپال پہنچا تو اس کا شاندار استقبال کیا گیا خود سکندر بیگم نے اُس کا استقبال کیا۔ چند دن وہ بھوپال میں ٹھہرا رہا جہاں اس کی خوب خاطر مدارت کی گئی اس کے ساتھ ہی سکندر بیگم نے اس سے راحت گڑھ پر حملہ کرنے کی درخواست کی تا کہ فاضل محمد خاں اور عادل محمد خاں کو سبق سکھایا جائے۔ راحت گڑھ قلعہ پر حملہ کرنے کے لئے بیگم صاحبہ نے بھوپال آرمی اور توپ خانہ کو راحت گڑھ بھیجنے کی پیشکش کی جسے جنرل روز نے قبول کرلیا۔ 24 جنوری 1858ء کو جنرل روز نے راحت گڑھ قلعے کے سامنے اپنا مورچہ قائم کیا۔ اس وقت قلعے کے اندر فاضل محمد خاں اور عادل محمد خاں وغیرہ موجود تھے۔ جنرل روز نے قلعہ کو فتح کرنے کے لئے دو طرفہ مورچے قائم کئے تھے۔ مشرقی سمت میں بھوپال کی فوج تھی جب کہ دوسری طرف گورا فوج تھی بھوپال کا توپ خانہ دونوں مورچوں پر آگے آگے تھا گورا فوج نے قلعے کی دیواروں کے نیچے کئی جگہوں پر بارودی سرنگیں بچھا دی تھیں۔ تا کہ قلعے کی دیواروں کو توڑا جا سکے۔ 25 جنوری سے قلعے پر باقاعدہ گولہ باری شروع کر دی گئی۔ قلعے کے اندر سے فاضل محمد خاں نے اس کا بھرپور جواب دیا۔ جنرل روز نے آہستہ آہستہ گولہ باری تیز کر دی او ربارودی سرنگوں کے ذریعے قلعے کی دیواروں کو کئی جگہ سے توڑ دیا۔ 27 جنوری تک تمام گولہ بارود ختم ہو چکا تھا چنانچہ قلعے پر قبضہ کرنے کا کام ادھورا ہی رہ گیا تھا۔ جنرل روز کی فرمائش پر جلد ہی گولہ بارود کی تازہ کھیپ بھوپال سے راحت گڑھ پہنچ گئی۔ جنرل روز نے دوبارہ قلعے پر اندھا دھند گولہ باری شروع کرا دی۔ اس دوران فاضل محمد خاں کے ایک ساتھی راجہ مردن سنگھ نے جنرل روز کی فوج پر حملہ کر دیا۔ جس سے جنرل روز بہت حیران ہوا مگر جلد ہی سنبھل کر مردن سنگھ کے حملے کو ناکام بنا دیا۔ اس کے بعد قلعے کی ٹوٹی ہوئی دیواروں سے گزر کر فوجی

قلعے میں داخل ہونے کی کوشش کرنے لگے۔ مگر فاضل محمد خاں کی فوج نے بڑی بہادری سے گورا فوج کو قلعے میں داخل ہونے سے روک دیا۔ اس کوشش میں کئی گورے مارے گئے۔ ساتھ ہی فاضل محمد خاں کے کئی سپاہیوں کے پرخچے اڑ گئے۔ اس طرح گورا فوج کو ایک دن تک قلعے میں داخل ہونے سے روک دیا گیا۔ آخر 28 جنوری کو جنرل روز کی فوج نے قلعے میں داخل ہونے میں کامیابی حاصل کر لی۔ اس طرح اس دن قلعہ گورا فوج کے کنٹرول میں آ گیا۔ لیکن گوروں کے اصل ہدف فاضل محمد خاں، عادل محمد خاں اور کامدار خاں قلعہ سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ فاضل محمد خاں قریب کے جنگل میں جا کر چھپ گئے لیکن ان کو خان زمان خان قلعہ دار رائے سن کے کچھ سپاہیوں نے پہچان لیا انہوں نے فاضل محمد خاں کو گرفتار کر لیا اور جنرل روز کے سامنے پیش کر دیا۔ کامدار خاں کو بھی گرفتار کر لیا گیا تھا۔ 31 جنوری کو جنرل روز نے انہیں راحت گڑھ کے قلعہ کے دروازے پر پھانسی دے دی اور ان کی لاشوں کو قلعہ کے ایک کمرے میں رکھوا کر دروازے کو تالا لگا دیا گیا۔ فاضل محمد خاں کی شہادت کے بعد تحریک آزادی دم توڑ گئی اور سکندر بیگم کا سب سے بڑا دشمن ان کے راستے سے ہمیشہ کے لئے ہٹ گیا۔

جہاں تک فاضل محمد خاں کا تعلق ہے وہ تحریک آزادی کے بے مثل مجاہد تھے۔ انہوں نے وطن کو انگریزوں سے آزاد کرانے کے لئے اپنا مال و متاع اور اپنی جان بھی داؤ پر لگا دی تھی۔ ان کے جذبۂ حب الوطنی سے انگریز بھی گھبرائے ہوئے تھے اور بیگم صاحبہ ان کی سب سے بڑی دشمن بن گئی تھیں کیوں کہ ان کی وجہ سے انہوں نے انگریزوں کے ساتھ جو وفاداری کا معاہدہ کیا تھا اس پر حرف آ رہا تھا گو کہ فاضل محمد خاں کو پھانسی دے دی گئی مگر انہوں نے جو آزادی کی شمع روشن کی تھی اسے انگریز اور سکندر بیگم نہ بجھا سکیں اور بالآخر 90 برس بعد برصغیر انگریزوں کے چنگل سے آزاد ہو گیا۔ سکندر بیگم نے اپنی سوانح حیات پر مبنی کتاب ''حیاتِ سکندری'' میں فاضل محمد خاں کو

خاندانی ڈاکو قرار دیا ہے مگر یہ صرف انتقامی کارروائی تھی۔ فاضل محمد خاں خود ایک اعلیٰ خاندان کے فرد تھے اور ان کی فوج میں بھی اچھے کردار کے سپاہی رکھے جاتے تھے۔ انہوں نے محض آزادی کے حصول کے لئے اپنی جاگیریں اور اہل خانہ کو قربان کر دیا تھا۔ جنگ آزادی کے مجاہدین میں ویسے تو بہت سے مجاہدین ہیں مگر فاضل محمد خاں ان کے بھائی عادل محمد خاں اور ان کے ساتھیوں کو اعلیٰ مقام دینا ضروری ہے کیوں کہ یہ لوگ وطن کی آزادی کے لئے بے حد مخلص تھے انہوں نے خود کو برباد کر لیا مگر وطن کے قابضین کو چین سے نہ بیٹھنے دیا۔

راحت گڑھ کی لڑائی میں سب سے افسوس ناک پہلو یہ تھا کہ فاضل محمد خاں کے درجنوں فوجی ہلاک ہوگئے تھے ان کی لاشوں کو دفنانے یا جلانے کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا۔ وہ میدان میں ہی پڑیں سڑنے لگیں اور تعفن پھیلنے لگا تھا مگر ان کا کوئی تدارک نہیں کیا گیا۔ ایک طرف زمین پر لاشوں کے انبار تھے تو دوسری جانب درختوں کی شاخوں سے بھی لاشیں لٹک رہی تھیں اس وقت کوئی ایسا درخت نہیں تھا جس پر حریت پسند سپاہیوں کو پھانسی نہیں دی گئی تھی۔ جنرل روز اس سانحے پر افسردہ ہونے کے بجائے بہت خوش تھا کہ اس نے آزادی کے دیوانوں کو مار کر ہندوستان پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضے کو مضبوط اور پائیدار بنا دیا ہے۔ جنرل روز نے ایک کام ضرور اچھا کیا تھا کہ اس نے راحت گڑھ سے جاتے جاتے فاضل محمد خاں اور کام دار محمد خاں کی لاشوں کو بند کمرے سے نکال کر دفن کرنے کے احکامات دے دیئے تھے۔ جنرل روز راحت گڑھ سے کامیابی کے ڈنکے بجاتا ہوا ساگر پہنچ گیا۔ وہاں مہاویر اس کے سامنے پیش کیا گیا۔ مہاویر جنگ آزادی کا اہم رکن تھا اسے اسی جرم میں پھانسی دے دی گئی۔ اس طرح سپاہی بہادر کے تمام وطن پرستوں کو خاک وخون میں نہلا دیا گیا۔ جنرل روز ساگر سے روانہ ہو کر جھانسی باندہ اور بان پور کے حریت پسندوں سے نبرد آزما ہوا۔ کافی خطرناک لڑائی

ہوئی مگر تمام ریاستوں پر انگریزوں کو فتح حاصل ہوتی گئی۔ جھانسی کی رانی کی بہادری کے سب ہی قائل ہیں۔ اس نے انگریزوں سے سخت مقابلہ کیا مگر جنرل روز کی فوج نے انہیں بھی شکست دی۔ اس فتح میں دیسی غداروں نے بھی گوروں کی خوب مدد کی تھی مگر زر اور زمین کی لالچ میں جو انہیں مل تو گیا مگر عمر بھر وطن فروش کہلائے۔ بغاوت ختم ہونے کے بعد سکندر بیگم نے برطانوی حکومت سے درخواست کی کہ ان کو ریاست کا قانونی حکمراں تسلیم کیا جائے اس وقت ان کی اکلوتی بیٹی شاہجہاں بیگم ریاست کی باقاعدہ دستوری حکمراں تھیں مگر کم عمر ہونے کی وجہ سے ان کی ماں سکندر بیگم ریاست کا نظم ونسق چلا رہی تھیں۔ سکندر بیگم کا یہ مطالبہ پورا کرنے میں مشکل یہ تھی کہ خود برطانوی حکومت پہلے ہی فریقین کے دعوؤں کی جانچ پڑتال کرنے کے بعد شاہجہاں بیگم کو ریاست کا قانونی حکمراں تسلیم کر چکی تھی لیکن اس دستوری پیچیدگی کو شاہجہاں بیگم نے اپنی ماں کی محبت میں آسان کر دیا تھا۔ وہ اپنی ماں کے حق میں رضا کارانہ طور پر دستبردار ہوگئی تھیں اس پر حکومت ہند نے سکندر بیگم کو یکم مئی 1860ء کو بھوپال کی گدی پر مسند نشین کرنا منظور کر لیا تھا۔ 8 جنوری 1861ء کو گورنر جنرل روز لارڈ کیلنگ نے جبل پور میں دربار منعقد کیا اس میں سکندر بیگم کو ان کی غدر میں عظیم خدمات کا نہ صرف اعتراف کیا بلکہ انہیں مندرجہ ذیل الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا۔

''یور ہائنس ایک ایسی ریاست کی حکمراں ہیں جس کو تاریخ میں یہ امتیاز حاصل رہا ہے کہ اس نے کبھی دولت برطانیہ کے مقابلے میں اسلحہ نہیں اٹھایا۔ کچھ ہی دنوں کی بات ہے کہ یہ ریاست ہمارے دشمنوں کے نرغے میں تھی جس سے آپ کو خطرہ تھا آپ نے عورت ذات ہو کر ایسی بہادری لیاقت اور کامیابی سے معاملات کی رہنمائی کی جو واقعی کسی مدبر یا سپاہی کے شایانِ شان تھی۔ اپنے اطراف کی بغاوتیں فرو کرنے اور انگریزوں کی سلامتی کی تدابیر کرنے میں جن میں کہ ایجنٹ گورنر جنرل بھی شامل تھے

آپ نے حتی الوسع برطانیہ کی فوجی جماعتوں کو جو آپ کے علاقے میں پہنچیں امداد دینے میں کمی نہیں کی۔ یہ خدمات بغیر کسی صلے کے نہیں رہنا چاہئے۔ اب میں آپ کو قلعے بیرسیہ کی سند ملکیت سپرد کرتا ہوں یہ ضلع ماضی میں ریاست دھار کے زیر اثر تھا لیکن بغاوت کی وجہ سے دھار کے حقوق اس پر سے ساقط ہو چکے ہیں یہ ضلع دربار بھوپال کو اس وفاداری کی یاد میں عطا کیا جاتا ہے جس کا اظہار آزمائش کے وقت آپ کی دانش مندی اور دلیرانہ رہنمائی میں ہوا۔ یہ میرے لئے باعث مسرت ہے کہ میں ذاتی طور پر یور ہائی نس کو ملکہ معظمہ کے افسران اور شرکاء جبل پور اور ساگر نیز آپ کے درباریوں کی موجودگی میں یہ سند دے رہا ہوں۔''

ریاست بھوپال میں ضلع بیرسیہ کے شامل ہونے کی سند دینے کے بعد یکم نومبر 1861ء کو الہ آباد میں انگریزی حکومت کا دربار منعقد ہوا جس میں سکندر بیگم کو ان کی وفادارانہ خدمات کے صلے میں حکومت ہند کی جانب سے ''اسٹار آف انڈیا'' کا خطاب عطا کیا گیا۔ سکندر بیگم سلطنت برطانیہ میں پہلی خاتون تھیں جن کو یہ معزز خطاب عطا کیا گیا تھا اس کے بعد 17 فروری 1863ء کو آگرہ میں گورنر جنرل لارڈ کارنیوالس کے منعقد کردہ دربار میں بیگم صاحبہ کو ان کی وفاداری پر شاندار خراجِ تحسین پیش کیا گیا۔ سکندر بیگم حقیقتاً انگریزوں کی وفادار تھیں وہ مرتے دم تک انگریزوں کے عطا کردہ خطابات پر فخر کرتی رہیں اور مرنے کے بعد ان کی نسلیں ان خطابات کے بدلے انگریزوں سے مراعات حاصل کرتی رہیں۔ سکندر بیگم کو آج ضرور غدار کہا جائے گا کیوں کہ انہوں نے وطن کی آزادی کے خلاف انگریزوں کا ساتھ دیا تھا مگر یہ حقیقت ہے کہ وہ ایک مضبوط قوت ارادی کی مالک خاتون تھیں۔ انہوں نے اپنی جان کی بھی پرواہ نہیں کی اور انگریزوں کا حق نمک ادا کرتی رہیں۔ سکندر بیگم 30 اکتوبر 1868ء کو بروز جمعہ انتقال کر گئیں۔ اس وقت ان کی عمر 53 برس تھی۔ آپ کے انتقال پر برطانوی حکومت

نے کافی غم منایا اور ملکہ وکٹوریہ نے آپ کے لواحقین کو تعزیت کا پیغام بھیجا تھا۔ سکندر بیگم گو کہ ایک مسلمان خاتون تھیں مگر انگریزوں کا کہنا ہے کہ مرتے وقت بھی وہ انگریز حکومت کو نہ بھولیں اور ان کی زبان پر آخری الفاظ یہ تھے۔

''ہر میجسٹی ملکہ معظّمہ، شاہی خاندان اور حکومت برطانیہ ہمیشہ شاد رہے۔''

سکندر بیگم کے انتقال کے بعد ان کی اکلوتی صاحبزادی شاہجہاں بیگم 16 نومبر 1868ء کو ریاست بھوپال کی دوبارہ آئینی سربراہ قرار دے دی گئیں۔

ریاست بھوپال میں جتنی اور جہاں بھی بغاوت ہوئی تھی اس میں ''سپاہی بہادر'' حکومت ہی ملوث تھی۔ یہ حکومت ضرور کامیابی سے ہمکنار ہوسکتی تھی اگر سکندر بیگم جیسی انگریز نواز ہستیاں موجود نہ ہوتیں۔ پھر بھی وسائل کی کمی اور حالات کے جبر کے باوجود انگریزوں کو خوب دل بھر کے نقصان پہنچایا، ان کے سینکڑوں فوجی مار ڈالے، دفاتر کو تباہ کر دیا اور خزانوں کو لوٹ لیا گیا۔ تاہم اس کی ناکامی کے بھی کچھ اسباب تھے جنہیں ذیل میں بیان کیا جا رہا ہے۔

1۔ سپاہی بہادر کو قائم کرنے والے اور چلانے والے سب ہی سپاہیانہ صلاحیتیں رکھتے تھے۔ وہ یقیناً بہادر تھے اور اپنے مقصد میں بھی مخلص تھے مگر سیاسی سوجھ بوجھ سے عاری تھے۔

2۔ یہ گروہی شکل میں کام کرتے تھے ان میں باہمی ربط و ضبط کی کمی تھی۔ ساتھ ہی قائدانہ صلاحیتوں کے حامل لوگوں کی کمی تھی۔

3۔ انہوں نے شہروں میں ضرور کام کیا وہاں کے لوگوں کو اپنے گرد جمع کر لیا مگر دیہات کے عوام کو اپنے ساتھ نہ ملا سکے۔

4۔ ان کے پاس وسائل کی کمی تھی۔ اسلحہ بھی بہت کم تھا اور اسے خریدنے کے لئے رقم کی بھی کمی تھی۔

5۔ یہ چھاپہ مار جنگ سے نا بلد تھے اگر چھاپہ مار جنگ کرتے تو یقیناً انگریزوں کو نہ صرف بھاری نقصان پہنچا سکتے تھے بلکہ انہیں ہلا کر بھی رکھ دیتے۔

6۔ مالوے میں تحریک آزادی عروج پر تھی اور مجاہد بہت کامیاب تھے مگر ریاست بھوپال کے حریت پسندوں نے ان سے کوئی رابطہ نہیں کیا۔

7۔ ان میں کچھ غدار بھی موجود تھے جو ان کی ناکامی کا سبب بنے۔

8۔ شمالی ہند میں سکھوں کی مدد سے انگریزوں کی کامیابیوں نے جہاں دوسرے علاقوں کے حریت پسندوں کے حوصلے پست کئے وہاں ریاست بھوپال کے حریت پسندوں پر بھی اس کا برا اثر پڑا۔

☆☆☆

JALALI BOOKS

باب 4

بھوپال اور اُردو

اختر سعید خان سہ ماہی میگزین فکر و آگہی میں اپنے ایک مطبوعہ مضمون بعنوان ''بھوپال کا لسانی جائزہ'' میں ریاست بھوپال کے علاقے میں اردو زبان کی ابتداء کے بارے میں لکھتے ہیں ''ریاست بھوپال میں نوابی اقتدار سے قبل نہیں کہا جاسکتا کہ یہاں کے انتظامی امور میں کس زبان کا سکہ چلتا تھا البتہ قدیم کتابوں سے اس کی نشاندہی ہوتی ہے کہ نو سو سال قبل رانی سال ملی جو راجہ بھوج کے پوتے کی بیوی تھی نے یہاں ایک بڑا مندر سبھا منڈل کے نام سے تعمیر کرایا تھا جس میں برہمنوں کو عبادت و ریاضت کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ نیز ان کے سپرد یہ خدمت تھی کہ وہ طلبا کو مختلف علوم، دھرم شاستر، منطق، جوتش، تصوف، عروض اور طب وغیرہ بزبان سنسکرت پڑھایا کریں۔ عرصہ دراز تک یہ سلسلہ جاری رہا پھر سبھا منڈل ویران ہوگیا۔ قیاس ہے کہ اس زمانے میں یہاں کی زبان سنسکرت رہی ہوگی جہاں تک عام بول چال کا تعلق ہے لسانیات کے طالب علم جانتے ہیں کہ سنسکرت کے پرستاروں کی بندشوں نے سنسکرت کو کبھی عوامی زبان نہیں بننے دیا۔ اس طرح پرکرتیک مخصوص زبان بن کر عوام سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ عوام کی زبان آگے بڑھ رہی تھی اس عام بول چال کی زبان کو اس عہد کے گرامر نویسیوں نے اب بھرنش (یعنی بگڑی ہوئی زبان) کہنا شروع کر دیا تھا مگر رفتہ رفتہ یہی بگڑی زبان ملک کی زبان بن گئی۔ 1855ء میں اب پھرنش بھی مخصوص زبان بن کر عوام کی ڈگر سے دور جا پڑی اور اپنی جاں نشین کے لئے مختلف بولیوں کو چھوڑ گئی۔ وسطی ہند میں جن بولیوں کو

اب بھرنشین (یعنی متھرا کے نواح کی بگڑی بولی) کی وراثت نصیب ہوئی ان میں سے چار بولیاں قابل ذکر ہیں۔ (1) بندیلی یا بندیل کھنڈی، (2) ہریانی یا بانگڑی، (3) برج بھاشا، (4) اور کھڑی بولی۔ بھوپال کے گاؤں اور قصبات میں یہ بولی اپنی اصلی حالت میں پائی جاتی ہے۔ بندیلی کی یہ خاصیت ہے کہ وہ دوسری بولیوں سے گھل مل کر ایک درمیانی بولی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ چنانچہ اس کی شکل قصبات میں اردو سے گھل مل کر ایسی ہوگئی ہے کہ محض تلفظ کا فرق اسے اردو سے دور لے جاتا ہے۔ اگر ان ہی الفاظ کو اردو رسم الخط میں لکھا جائے تو کوئی فرق نظر نہیں آئے گا۔ بھوپال کی اردو میں بندیلی تلفظ عام طور پر ملتا ہے۔ بندیلی کے علاوہ جو بولیاں بھوپال کے دیہاتوں میں رائج ہیں ان میں راجستھانی بھی ہے۔ راجستھانی چار اہم بولیوں میں بٹی ہوئی ہے (1) مارواڑی، (2) مالوی، (3) جے پوری، (4) میواتی۔ ان میں مارواڑی اور مالوی کے بولنے والے بھوپال میں پائے جاتے ہیں۔ مالوی کا مرکز ریاست اندور ہے اور بھوپال کا علاقہ اندور سے ملا ہوا ہے۔ مالوی کی شکل بندیل کھنڈی سے ملتی جلتی ہے اور اس کے بولنے والوں کی تعداد بھوپال کے جنوب مغرب میں پائی جاتی ہے۔ ان بگڑی بولیوں کے بعد چھوٹی چھوٹی بولیوں کا نمبر آتا ہے جو قبیلوں میں رائج ہیں جیسے گونڈوانی، بیراگیوں کی بولی، بنجاروں اور لوہا پیٹوں کی بولیاں وغیرہ وغیرہ۔ ان بولیوں کا کوئی مقام یا علاقہ مخصوص نہیں ہے بلکہ جہاں جہاں بھی یہ قبیلے آباد ہیں وہاں یہ بولیاں رائج تھیں۔ جو آج بھی موجود ہیں۔ کھڑی بولی بھوپال کی تقریباً 80 فیصد آبادی کی بول چال کی زبان ہے۔ جہاں تک اردو کا تعلق ہے وہ اپنی ہیئت ترکیبی کے لحاظ سے بندیلی یا مالوی سے بہت مختلف ہے البتہ کھڑی بولی کی یہ ترقی یافتہ شکل ہے۔ بھوپال کی تمام دیہی آبادی کھڑی زبان ہی بولتی ہے۔ البتہ شہر میں اس کی ترقی یافتہ شکل یعنی اردو یا ہندی بولی جاتی ہے۔ ہندی کے لفظ سے گمراہ ہونے کی ضرورت نہیں دراصل بھارت کے تمام

ہی بڑے شہروں میں اردو ہی بولی جاتی ہے مگر اسے سیاسی وجوہات کی بنا پر ہندی کہا جاتا ہے اور اسے لکھنے کے لئے عربی کے بجائے دیوناگری رسم الخط استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ بات بھارتی فلموں کے مکالموں سے صاف واضح ہو جاتی ہے۔ پوری فلم کی زبان اردو ہی تو ہوتی ہے مگر اسے ہندی کہا جاتا ہے۔ یہی ہندی جسے اردو بھی کہا جاتا ہے۔ بھارت میں عوامی زبان کے طور پر رائج ہے البتہ سرکاری ہندی زبان وہ ہے جس میں سے عربی اور فارسی کے الفاظ کو نکال کر ان کی جگہ سنسکرت کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں مگر سرکاری زبان بھارت میں آزادی کے 50 سال بعد بھی عوامی زبان نہیں بن سکی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سنسکرت کے جابجا الفاظ کی وجہ سے مشکل زبان بن گئی ہے جسے بولنا عام لوگوں کے بس کی بات نہیں۔ اسے یا تو ہندو مذہبی لوگ بولتے ہیں یا پھر مذہبی سیاسی پارٹیوں کے افراد اسے زبردستی بولنے کی کوشش کرتے ہیں۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ بھوپال کا خطہ کئی حملہ آوروں کی آماج گاہ بنا رہا یہاں راجپوتوں، پٹھانوں اور مغلوں نے حکومت کی مگر کوئی بھی دیرپا حکومت قائم نہ رہ سکی اور کسی کی زبان کا سکہ یہاں نہ چل سکا۔ تقریباً تین سو سال قبل یہ شہر ایک چھوٹا گاؤں تھا۔ سردار محمد نے 1723ء میں اسے ایک شہر کی شکل دی یہاں جو لوگ سب سے پہلے آ کر آباد ہوئے وہ دوست محمد خاں کے قبیلے کے لوگ تھے یہ یہاں دوست محمد خاں کی حکومت کو مضبوط اور مستحکم کرنے کے لئے آئے تھے۔ ان لوگوں کی عام بول چال کی زبان پشتو تھی لیکن دربار کی زبان فارسی تھی۔ سردار صاحب کے زمانے میں یہاں ایک نئے کلچر کی بنیاد پڑی اور آگے نواب سکندر بیگم کے دور تک ایک نئی ملی جلی زبان کی بنیاد پڑی۔ یوپی صوبے سے بھوپال میں آ کر بسنے والے اپنے ساتھ ایک جادو کی بانسری لے کر آئے جسے عرفِ عام میں ہندوستانی کہا جاتا ہے۔ اس بانسری کی مدھر تان جس نے بھی سنی وہ اس کی طرف کھنچ کر آ گیا۔ بعد کے آنے والوں میں زیادہ تر یوپی کے لوگ تھے جو ایک

مدھر بانسری یعنی ایک مشترک زبان اور کلچر سے آراستہ ہو کر آئے تھے۔ یہ لوگ شہر اور قصبات میں آباد ہوئے ان ہی کے ہاتھوں نجی مکتبوں اور درس گاہوں کی بنیاد پڑی۔ آپس کے میل ملاپ اور لین دین سے شہر وقصبات کے باشندوں کی بولی نیا روپ دھارنے لگی اور رفتہ رفتہ شہر اور قصبات کی زبان نوے فیصد ہندوستانی یعنی اردو ہو گئی۔ سردار صاحب کے عہد سے نواب سکندر بیگم کے عہد کی ابتداء تک بھوپال میں نئے تہذیب وتمدن کا آغاز ہوا اس دور کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ درباری زبان فارسی موقوف کر کے اردو کو جگہ دی گئی اور یہی سرکاری زبان کہلائی۔ ایک صدی تک ایوان حکومت پر اردو کا پرچم لہراتا رہا۔ اسے انتظامیہ اور دیگر تمام شعبوں میں رائج کیا گیا۔ اردو ایک ایسی میٹھی زبان ہے کہ اسے بولنے والا عجب لذت محسوس کرتا ہے اس مٹھاس کی وجہ سے یہ نہ صرف بھوپال بلکہ پورے ہندوستان کے طول وعرض میں بولی جانے لگی اگر انگریز ہندوستان سے نہ جاتے تو یہ آج بھی پورے ہندوستان کی زبان ہوتی۔

بہر حال ریاست کے ہندوستان میں انضمام کے بعد اردو کو غیروں کی زبان قرار دے دیا گیا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اسے پاکستان نے اپنی قومی زبان کے طور پر اپنا لیا ہے۔ چنانچہ بھارتی حکومت نے پاکستان سے نفرت کی وجہ سے اردو سے بھی نفرت کی ہے جبکہ اردو کی پیدائش شمالی ہندوستان میں ہوئی اور یہ وہیں پلی بڑھی۔ یہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی من پسند اور قابل فخر زبان ہے۔ اس کی ہر دلعزیزی کا یہ حال رہا ہے کہ مسلمانوں کے برابر ہی ہندوؤں نے اس میں شاعری کی اور ادب تخلیق کیا۔ اس وقت تو بھارت میں ضرور اردو پر ظلم ڈھائے جا رہے ہیں مگر آنے والا وقت اردو کا ہے۔ بھارتی نئی نسل اردو سے بہت متاثر ہے وہ اکثر اس کے شعر پڑھ کر فرحت اور فخر محسوس کرتے ہیں۔ بھارت میں بول چال کی زبان تو اس وقت بھی اردو ہی ہے جسے ہندی کہا جاتا ہے مگر مستقبل میں اس کے رسم الخط کے بھی مقبول ہونے کی امید کی جاسکتی ہے۔

بھوپال کے نامور شعراء

ریاست بھوپال کو یہ فوقیت حاصل ہے کہ وہاں اردو کو شمالی ہند اور دکن سے زیادہ اہمیت دی گئی۔ اس کا بین ثبوت یہ ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں سب سے پہلے 1859ء میں اردو کو ریاست بھوپال میں سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اُردو بھوپال کے عوام میں مقبولیت حاصل کر چکی تھی اور خود یہاں کی نواب خواتین بھی اس زبان سے نہ صرف بہت مانوس ہو چکی تھیں بلکہ انہوں نے اردو میں شعر و نثر پر طبع آزمائی کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اردو میں عوامی اور اپنی دلچسپی کے پیش نظر اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دے دیا۔ پھر یہ صرف سرکاری اعلان نہیں تھا بلکہ اردو کو باقاعدہ طور پر پوری ریاست کے سرکاری اداروں میں خط و کتابت کے لئے بھی استعمال کیا جانے لگا۔ دراصل اس سے بھی پہلے دوست محمد خاں کے عروج کے ساتھ ہی بھوپال میں اردو رنگ جمانے لگی تھی۔

ڈاکٹر سلیم حامد رضوی اپنی کتاب ''اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ'' میں بھوپال میں اردو کی قدامت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''1722ء میں جب ولی دکنی کا دیوان دلی آیا تب وہاں اردو شاعری کی طرف توجہ دی گئی۔ اس طرح دلی میں اردو شاعری کا آغاز دراصل 1722ء کے بعد ہی ہوا۔ جبکہ بھوپال ریاست کے علاقوں میں ہم کو اردو شاعری کے نمونے گیارہویں صدی کے ابتدائی حصے میں ہی مل جاتے ہیں۔ جو اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ یہ تقریباً نصف صدی کے ارتقاء کا نتیجہ ہے۔''

بھوپال میں اردو کی ترقی دراصل وہاں کی چاروں خواتین نوابوں کی مرہون

ہے جو خود اردو داں تھیں اور انہوں نے اردو کے باکمال عالموں، ادیبوں اور شاعروں کو بھوپال میں جمع کر لیا تھا۔ اس سرزمین پر نواب صدیق حسن خاں، فدا علی فارغ، مولوی ذوالفقار علی، صابر حسین صہبا، جمیل احمد سہسوانی، سراج میر خاں سحر، معشوق علی خاں جوہر، محمد میاں شہید، کہنج منوہر لال، منشی امراؤ علی عیش، قاضی محمد مکرم، مفتی فضل باری، سر راس مسعود جیسے مہ و خورشید ابھرے اور ان کی شاعری کی پورے برصغیر میں دھوم تھی۔ اس سرزمین کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ علامہ اقبال نے گاہ بگاہ یہاں قدم رنجا فرمایا اور یہاں کئی اہم نظمیں لکھیں۔ بھوپال کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ غالب نے اپنا دیوان بطور خاص یہاں بھیجا تھا تاکہ اس ریاست کی ادب نواز خاتون حکمران اسے محفوظ رکھ سکیں اور یہی ہوا کہ یہ نسخہ جوں کا توں محفوظ رہا۔ اس سرزمین سے مشہور زمانہ رسالہ ''نگار'' کا اجراء ہوا۔ یہاں پر ہی ڈاکٹر عابد حسین کی ولادت ہوئی۔ یہاں کے لوگوں نے ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، راس مسعود، مولوی عبدالرزاق، سید سلیمان ندوی، بابائے اُردو مولوی عبدالحق اور نیاز فتح پوری جیسے عظیم انشاء پردازوں سے اکتسابِ فیض کیا۔

ڈاکٹر سلیم حامد رضوی اپنی تصنیف ''اردو کی ترقی میں بھوپال کا حصہ'' میں ایک جگہ لکھتے ہیں ''عالمگیر کے زمانے میں ہی یہاں کے رہنے والوں کے روابط دکن سے بڑھ گئے تھے اس لئے قدرتی عمل تھا کہ وہ ادب و شاعری میں بھی دلی کے مقابلے میں بہت پہلے متعارف ہو گئے۔ یہی واقفیت ان علاقوں میں پہلے شاعری کے آغاز کا سبب بنی۔ دکن کی طرح یہاں کے لوگوں نے شاعری کو مذہبی تبلیغ اور اصلاحِ اخلاق کے لئے استعمال کیا جہاں تک لسانی اثرات کا تعلق ہے وہ یہاں بہت کم نظر آتے ہیں جبکہ دلی میں بقول ڈاکٹر مسعود حسن خان فائز کے کلام سے اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ دہلی کی زبان اور انداز بیان پر دکن کا سکہ بیٹھ چکا تھا مگر بھوپال کی زبان اور بیان میں دلی کے اثرات بالکل نہیں پائے جاتے جو اس بات کا بین ثبوت ہے کہ یہاں کی ادبی زبان

ارتقاء کا نتیجہ ہے نہ کہ تقلید کا۔''

ارشد تھانوی اپنے معرکتہ الآراء مضمون ''بھوپال کی فضائے شعری'' میں رقم طراز ہیں کہ جب 1905ء میں وہ بھوپال کی سرزمین پر قدم رنجا ہوئے تو اس وقت بھوپال میں شعر و ادب کا ذوق عام تھا محلے محلے علمی مجالس اور مشاعرے منعقد ہوتے رہتے تھے، لکھے پڑھے نوجوانوں میں ادبی ذوق کی یہ فرمانروائی اور مذاکرات علمی کی بہتات یہاں کے فرمانرواؤں کی معارف پروری کا نتیجہ تھی اور وسط ہند میں شہر بھوپال کو غیر معمولی علمی مرکزیت حاصل تھی اور اب بھی یہ امتیاز ہندوستانی والیان ریاست میں صرف فرمانروائے بھوپال کو حاصل ہے کہ وہ ایک قومی یونیورسٹی کے باقاعدہ گریجویٹ ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ علوم مشرقی میں بھی اعلیٰ دست گاہ رکھنے کے علاوہ زبردست ادبی شغف رکھتے ہیں جس کی تائید میں صرف دیوان غالب کے نسخہ حمیدیہ کو پیش کرنا ہی کافی ہوگا جو تمام مطبوعہ غیر مطبوعہ کلام غالب کا اہم ترین تاریخی مجموعہ ہے مگر جس زمانے کا ذکر کیا جا رہا ہے اس وقت نواب سلطان جہاں بیگم مسند آرائے ریاست تھیں اور آپ کی علمی مصروفیت کا یہ حال تھا کہ علاوہ کثیر التعداد کتب کی مصنفہ و مولفہ ہونے کے ایک ضخیم ذخیرہ تالیف و تصنیف خود اپنی زیر نگرانی مکمل کروایا تھا۔ مولانا شبلی نعمانی کی کتاب ''سیرت النبیؐ'' ہرگز پایہ تکمیل کو نہ پہنچ پاتی اگر سرکار فردوس مکان کی ذاتی دلچسپی اور پوری مالی اعانت اس میں شامل نہ ہوتی۔ مولانا شبلی نے ایک خوبصورت نظم میں اس کا اعتراف فرمایا تھا۔

مصارف کی طرف سے مطمئن ہوں میں بہر صورت
کہ دستِ فیض سلطان جہاں بیگم زر افشاں ہے
رہی تدوین و تالیف روایت ہائے تاریخی
تو اس کے واسطے حاضر مرا دل ہے مری جاں ہے

غرض دو ہاتھ ہیں اس کام کی تکمیل میں شامل
کہ جس سے اک گدائے بینوا ہے ایک سلطاں ہے

ارشد تھانوی اپنے طویل مضمون میں ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ فصیح الملک نواب مرزا داغ دہلوی کی شاعری کا پورے برصغیر میں ڈنکا بج رہا تھا جب ان کا انتقال ہوا تو ان کے شاگردوں میں جانشینی کا مسئلہ باعث نزاع بن گیا۔ کئی برس تک ہندوستانی اخبارات و رسائل کے اوراق اس کے لئے وقف تھے۔ جہاں نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی، حضرت نوح ناروی، جناب احسن مارہروی وغیرہ کے نام معرض بحث میں تھے وہیں بھوپال کے ایک منشی امراؤ علی صاحب عیش بھی اس کے دعوے دار تھے۔ ''آگرہ اخبار'' ان کے کلام کی اشاعت اور ان کے استدلال کی تفصیل کے لئے ترجمان کا کام کرتا تھا۔ بھوپال کے نواب خاندان کے کئی افراد شعری ادب سے صرف دلچسپی ہی نہیں بلکہ شعر بھی کہتے تھے۔ ان اصحاب میں نواب یار محمد خاں جو نواب فوجدار محمد خاں کے فرزند تھے مرزا غالب کے شاگرد تھے۔ یہاں عالمگیر محمد خاں جو نمود تخلص کرتے تھے نواب شاہجہاں بیگم کے برادر زادہ تھے۔ وہ راسخ رامپوری کے شاگرد تھے۔ ان کی کتاب ''شبستان عالمگیری'' میں بھوپال کی تاریخ اور اس دور کے شاعروں کا احوال ہے۔ نواب صدیق حسن خاں بھی شاہی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ عربی فارسی کے زبردست عالم تھے۔ آپ تقریباً ڈیڑھ سو ضخیم کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی قدر دانی اور ہنر پروری و ادب نوازی کی بدولت مشرقی علوم کے بڑے بڑے ماہر بھوپال میں جمع ہو گئے تھے۔ آپ اردو کے علاوہ فارسی کے بھی منجھے ہوئے شاعر تھے۔ اب ہم بھوپال کے مختلف قد آور شاعروں کا تعارف کرا رہے ہیں اور ابتداء نواب صدیق حسن خاں سے کرتے ہیں۔

نواب صدیق حسن خاں:

آپ اکیس برس کی عمر میں بھوپال تشریف لائے۔ یہ نواب سکندر جہاں کا زمانہ تھا۔ 1859ء میں بھوپال میں ملازمت کا آغاز کیا اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ 20 فروری 1890ء کو بھوپال میں ہی رحلت پائی اور نواب قدسیہ بیگم کے باغ میں مدفون ہوئے۔ آپ شیریں بیان، شریف الطبع، سراپا اخلاق اور اہل علم کے قدر داں تھے۔ اسلامی شعائر کے پابند تھے۔ آپ قادرالکلام شاعر تھے۔ آپ نے ہر موضوع پر کتابیں تصنیف کی تھیں۔ آپ کی کتابیں صرف ضخیم ہی نہیں بلکہ علمی اعتبار سے بہت بلند ہیں۔ آپ نے اردو کے علاوہ عربی اور فارسی میں بھی کتابیں لکھیں۔ آپ کی بعض کتابوں کی غیر ملکوں میں اشاعت ہوئی تھی۔ آپ کی تمام تصانیف کی تعداد 222 کہی جاتی ہے۔ آپ نواب تخلص فرماتے تھے۔ آپ کا دیوان ''گل رعنا'' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ آپ کی شاعری کا نمونہ ملاحظہ فرمائیے۔

فلک کی خیر ہو یا رب کہ اس ستم گر نے
نگاہ کرم سے پھر سوئے آسماں دیکھا

کعبہ سے تا بہ دیر کلیسا سے تا کنشت
پایا تجھی کو یار جہاں تک نظر گئی

نہ بقا اس کو ہے توفیق نہ اس کو ہے قرار
یاں کہ آرام پہ لعنت ہے اور آزار پر تف

نواب شاہ جہاں بیگم:

آپ ایک ریاست کی فرمانروا ہوتے ہوئے ریاست کی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کے ساتھ ساتھ شعر گوئی کا بھی شغف رکھتی تھیں۔ آپ ایک قادرالکلام شاعرہ

تھیں۔ آپ نے شاعری کی تمام اصناف پر طبع آزمائی فرمائی تھی۔ آپ نے غزلیں، نعتیں، قصیدے اور مثنویاں بھی کہیں۔ آپ باقاعدہ صاحب دیوان شاعرہ تھیں۔ آپ کا دیوان ''تاج الکلام'' آج بھی پڑھنے والے کو حقیقی شاعری کی لذت سے سرشار کرتا ہے۔ آپ کو اپنے باکمال ادیب و شاعر شوہر نواب صدیق حسن خاں کی صحبت حاصل تھی۔ شاہجہاں بیگم کی مثنوی ''صدق البیان'' آج بھی عوامی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے۔ اس میں عام مثنویوں کی طرح کسی شہزادے جن یا پری کی داستان نہیں بیان کی گئی ہے۔ اس میں عام مثنویوں سے ہٹ کر ہندوستان کے تمام موسموں، تہواروں، رسومات، فصلوں کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ دراصل مثنوی کی روایتی زمین سے ہٹ کر ایک نیا تجربہ کیا گیا تھا۔ یہ مثنوی حمد اور نعت کے بعد چاروں خلفاء کے ذکر سے شروع ہوتی ہے اور پھر اصل موضوع کو اپنایا گیا ہے۔ ابتداء افلاک کے حال سے ہوتی ہے۔ آپ تاجور تخلص کیا کرتی تھیں۔ آپ کا پہلا دیوان ''شیریں'' اور دوسرا ''تاج الکلام'' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ آپ کی مثنوی کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

دیا مہر اور مہ کو تو نے وہ نور
کہ ہے روز و شب میں ان ہی سے ظہور
نمایاں ہے صنعت تیری ہر کہیں
بنائے ہیں تو نے زمان و زمیں
تجھے فوق سب پر ہے رب انام
تری ذات کو ہے ہمیشہ قیام
بنا ہے یہ اس وقت مجھ کو خیال
کہ افلاک کا اب لکھوں کچھ میں حال
لکھی اہل تحقیق نے ہی یہ بات

خبر عرش و کرسی ہیں افلاک سات
تہ و بالا ہفت آسماں جب بنے
تو ان میں ستارے چمکنے لگے
بروج ان میں قائم کئے جابجا
ملائک سے آباد ان کو کیا
جمادات کی بھی یہ ماخذ زمیں
خزینہ دفینہ کی ہے یہ امیں
اسی سے ہوا ہے بشر کا خمیر
ہے یہ مادا و ماخذ اول اخیر
ہو جنس ربیع اس میں پیدا تمام
کٹی مونگ جوار اور ارد لا کلام
سنگھاڑے شریفے کنار اور بھی
بکثرت کریں اس میں جلوہ گری
لو آمد ہے اب چیت بیساکھ کی
کہ جس کی صنعت ہم نے یہ ہے سنی
چنے اور گیہوں ہوں اس میں نصیب
شکم سیر ہوں تا امیر و غریب
لو آئی یہ بارش کی اچھی گھڑی
لگی بھادوں ساون کی اس میں جھڑی

نواب شاہجہاں بیگم نے صرف مثنوی پر ہی طبع آزمائی نہیں فرمائی بلکہ وہ تمام اصناف شاعری میں طبع آزمائی کرتی رہی ہیں۔ آپ کی شاعری میں سادہ زبان بے

تکلف بیان اور فن کی پختگی کا بڑا دخل تھا۔ آپ کی غزلوں کے چند اشعار ذیل میں پیش کئے جا رہے ہیں۔ ۔

عشق کی بازی ہے یہ کچھ کھیل نہیں ہے اے دل
کھا کے غم خونِ جگر بھی تجھے پینا ہوگا

☆☆

کیا بتاؤں کس تردد میں ہوں کیا جاتا رہا
تو جو آیا دل سے حرف مدعا جاتا رہا

☆☆

ساقیٔ میخانہ ہوگی گر نگاہِ مست یار
مئے کا پینا اہل تقویٰ کو روا ہو جائے گا

کیف بھوپالی :

آپ 20 فروری 1917ء کو بھوپال میں پیدا ہوئے۔ آپ قادرالکلام شاعر تھے۔ آپ دراصل غزل گو شاعر کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ انہیں اس میدان میں ملکہ حاصل تھا۔ آپ کی طبیعت میں سادگی اور باتوں میں خلوص تھا اور ان کی شاعری میں ان ہی عناصر کی خوب خوب جھلک نظر آتی ہے۔ آپ نے حمد و نعت قصیدے سے لے کر رخصتی، سہرے اور فلمی گیت بھی لکھے۔ آپ نے بھارتی فلم پاکیزہ، رضیہ سلطانہ، دائرہ اور شنکر حسین کے گیت لکھے تھے جو بہت مقبول ہوئے۔ آپ کا 24 جولائی 1991ء کو بھوپال میں انتقال ہوگیا۔ آپ نے پانچ مجموعہ کلام اپنی یادگار کے طور پر چھوڑے ہیں جن کے نام ''شعلہ حرف''، ''کوئے بتاں''، ''حنا حنا''، ''اس کو غزل کہتے ہیں'' اور ''آؤ تمہیں گیت سنائیں'' ہیں۔ آپ کی غزلوں کا عکس درج ذیل ہے۔

داغ دنیا نے دیئے زخم زمانے سے ملے
ہم کو تحفے یہ تمہیں دوست بنانے سے ملے

☆☆

یار تو یار ہیں دشمن سے گلے ملتے تھے
ہائے! کیا لوگ تھے وہ اگلے زمانے والے

☆☆

زندگی باپ کی مانند سزا دیتی تھی
رحم دل ماں کی طرح موت بچانے آئی

☆☆

کوئی آئے گا یہاں کوئی نہ آیا ہوگا
میرا دروازہ ہواؤں نے ہلایا ہوگا

☆☆

تم سے نہ مل کے خوش ہیں وہ دعویٰ کدھر گیا
دو روز میں گلاب سا چہرہ اتر گیا
میں بھی سمجھ رہا ہوں کہ تم تم نہیں رہے
تم بھی یہ سوچ لو کہ میرا کیف مر گیا

عبدالحفیظ خاں اشکی بھوپالی :

آپ 1931ء میں بھوپال میں پیدا ہوئے۔ آپ اسکول کے زمانے سے ہی شاعری سے دلچسپی لینے لگے تھے۔ جاں نثار اختر جیسے عظیم شاعر سے آپ نے شاعری کا ہنر سیکھا۔ بھوپال جیسی شاعری سے رچی بسی بستی میں رہتے ہوئے شاعری کے میدان میں کیسے داخل نہ ہوتے؟ آپ نے بے شمار غزلیں اور نظمیں لکھیں مگر نثر نگاری کے

دامن کو بھی نہ چھوڑا۔ آپ کے مضامین، افسانے اور مقالات مختلف اخبارات اور رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ ان کی غزلوں کا پہلا مجموعہ "تاثراتِ بھوپال" 2004ء میں شائع ہوا۔ اس کی تقریب رونمائی مدھیہ پردیش کے گورنر ڈاکٹر بکرام جا کھر کے ہاتھ 29 اپریل 2006ء کو ہوئی۔ آپ کا دوسرا منظوم مجموعہ جو حالاتِ حاضرہ اور شخصیات پر ہے "پھول نامہ" کے نام سے شائع ہوا۔ محسن پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خاں کا آپ کے خاندان سے تعلق بنتا ہے۔آپ کے مجموعہ "بھوپال نامہ" سے چند اشعار ملاحظہ فرمائے۔

سب سے چھوٹے سب سے بڑھ کر ڈاکٹر عبدالقدیر
ہند و پاکستان میں ان کی نہیں کوئی نظیر
ایٹمی دنیا کی ہیں وہ اِک نمایاں شخصیت
دوستی علم و ادب سے پیکر انسانیت

کچھ گئے باہر مگر باقی رہے بھوپال میں
جو بھی ہے وہ ٹھیک ہے سب خوش ہیں اپنے حال میں
بیٹیوں کی نسل سے کچھ تو بہت مشہور ہیں
اک نواسے ایٹمی دنیا کے کوہ نور ہیں

آج بھی ہندوستان کے وسط میں ہے اِک مقام
کہتے ہیں بھوپال جس کو جانتے ہیں خاص و عام
یہ شہر کا ہی نہیں یہ ہے ریاست کا بھی نام
جس میں شامل دشت و دریا جس میں تاریخی مقام

اختر سعید خان اختر:

آپ 12 اکتوبر 1923ء کو بھوپال میں پیدا ہوئے۔ آپ بچپن سے ہی ہونہار تھے۔ ابتدائی تعلیم بھوپال کے قریب واقع رائسن میں حاصل کی۔ پنجاب یونیورسٹی سے میٹرک اور پھر بی اے کیا۔ علی گڑھ سے وکالت کی ڈگری حاصل کی۔ بھوپال میں وکالت شروع کی اور جلد ہی اس پیشے میں شہرت حاصل کی۔ شاعری انہیں اپنے خاندان سے وراثت میں ملی۔ آپ نہ صرف ملکی بلکہ غیر ملکی مشاعروں میں بھی مدعو کئے جاتے تھے۔ آپ اقبال ایوارڈ، میرا ایوارڈ اور نشان سجاد سے سرفراز ہوئے۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں تعلیم کے حصول کے وقت ہی ان کے جان نثار اختر، مجروح سلطان پوری، ڈاکٹر خورشید الاسلام اور ڈاکٹر مسعود حسن خان سے مراسم پیدا ہوئے۔ ان سے اکثر وہاں شعر و ادب پر گفتگو ہوتی رہتی تھی۔ آپ کے اشعار میں زندگی کی حلاوت ہے آپ کا نومبر 1999ء میں بھوپال میں ہی وصال ہوا۔ آپ کی شعری کتب میں کئی مجموعے شامل ہیں جن کے نام اس طرح ہیں ''نگاہ، طراز دوام، سرخیٔ شام، سفر، بیاں اور نگینہ۔ آپ کے کلام کا نمونہ درج ذیل ہے۔

خواب آنکھوں میں لئے محو تماشا ہوں میں
ٹھہر اے صبح ابھی نیند سے جاگا ہوں میں
فکر کیوں ہو مجھے اٹھ جائے گی اک دن یہ بساط
دل کی بازی کبھی جیتی نہیں ہارا ہوں میں
جب سے چومے ہیں قدم تیرے ذہنِ دل سے
دل کا ہر ذرہ یہ کہتا ہے کہ دنیا ہوں میں
زندگی آ تجھے سینے سے لگا لوں دم بھر
آ کہ اک عمر تجھے دیکھنے جاگا ہوں میں

کس سے پوچھوں میرے چہرے سے عیاں ہے کہ نہیں
جو اُجالا ترے دیدار سے لایا ہوں میں
پوچھنا چاہتے ہو کیا حالِ زبوں اخترؔ
سر جھکا کر یہی کہتا ہے کہ اچھا ہوں میں

دوسری غزل :

اے سفر ناآشنا گردِ سفر کا کیا ملال
چھوڑ ماضی کے فسانے دیکھ آئینے میں حال
اس سے بچ کر کیوں گزر جاتے ہیں سائے شام کے
دھوپ میں بیٹھا ہے جو آوارۂ دشت خیال
زندگی کیوں یاد کرتی ہے اے شام و سحر
تھا جو تیرے در پہ آشفتہ سر، آشفتہ حال
اے شب غم کیسے اس کو حسن بے پردہ کہوں
ڈھونڈتا ہے تیرے دل کو ہر طرف اس کا جمال
کیوں نہیں منظور ہم کو کیوں جئے جاتے ہیں ہم
مجھ سے پہلے بھی زبانوں پر رہا ہے یہ سوال
دیکھئے کب ختم ہو یہ رہ گزار آرزو
کیا خبر یوں ہی گزر جائیں جو اپنے ماہ و سال
کس سے پوچھوں کون سمجھائے مجھے اختر بتا
زندگی ہے اک تماشا موت بھی ہے اک خیال

مُلّا رموزی :

آپ 21 مئی 1896ء کو بھوپال میں پیدا ہوئے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم

مدرسہ سلیمانیہ بھوپال میں حاصل کی۔ آپ ابتداء میں مضمون نگاری کرتے تھے۔ یہ مزاحیہ انداز میں عام فہم زبان میں ہوتی تھی جسے زبردست عوامی پذیرائی حاصل تھی۔ آپ کے مضامین برصغیر کے تمام ہی بڑے رسائل اخبارات میں شائع ہوتے تھے۔ 1932ء سے آپ نے شاعری شروع کی جو اکبر الہ آبادی کی طرز کی تھی۔ وہ مسلمان قوم کو غلامی بے راہ روی اخلاقی اقدار کی پامالی اور اندھی تقلید سے بچانا چاہتے تھے۔ آپ کا کوئی مجموعہ کلام موجود نہیں ہے البتہ ایک 32 صفحات کا دیوان شائع ہوا تھا آپ کا 10 جنوری 1952ء کو بھوپال میں انتقال ہوگیا۔ آپ کا نمونہ کلام ذیل میں ہے۔

ہمارے عہد میں قدر کمال اتنی ہے
کہ تھانیدار تو سرمایہ دار ہو کے رہا
اور ایک علم و ادب کا امام ہو کر بھی
تمام عمر پریشان و زار ہو کے رہا

قناعت چھوڑ دے اب تو حریص سیم و زر ہو جا
ملے جب سیم و زر تجھ کو تو پھر عالی نظر ہو جا

ہم ہند کے باشندوں کو فرصت ہی کہاں ہے
واللہ چناں چہ سے اگر اور مگر سے

جاں نثار اختر :

آپ برصغیر پاک و ہند کے معروف شاعر ہیں۔ آپ کو ایک انقلابی شاعر بھی کہا جاتا ہے۔ آپ کی شاعری میں گھلی ہوئی عشق کی سرشاری قاری کو مسحور کر دیتی ہے۔

آپ نے غزلوں کے علاوہ نظم اور گیت بھی لکھے۔ آپ فلمی دنیا کے نامور شاعر تھے۔ آپ 14 فروری 1914ء کو گوالیار میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد مظفر خیر آبادی بھی ایک مشہور شاعر تھے اور دادا فضل حق خیر آبادی 1857ء کی جنگ آزادی کے ایک عظیم مجاہد تھے۔ آپ ایک معروف عالم دین اور شاعر بھی تھے۔ آپ نے مرزا غالب کے پہلے دیوان کو ان کی خواہش پر ترتیب دیا تھا۔ جاں نثار اختر 1943ء میں بھوپال میں آ کر آباد ہو گئے تھے۔ آپ کی شادی مشہور شاعر مجاز لکھنوی کی بہن صفیہ سے ہوئی تھی۔ آپ کی شاعری کا مجموعہ ''کلیات جاں نثار اختر'' بہت مشہور ہوا۔ آپ کی شاعری کا نمونہ ذیل میں ملاحظہ کیجئے۔

ہر ایک شخص پریشان و در بدر سا لگے
یہ شہر مجھ کو تو یارو کوئی بھنور سا لگے
کسے پتہ ہے کہ دنیا کا حشر کیا ہوگا
کبھی کبھی تو مجھے آدمی سے ڈر سا لگے
اب اس کی طرز تجاہل کو کیا کہے کوئی
وہ بے خبر تو نہیں پھر بھی بے خبر سا لگے

اشعار مرے یوں تو زمانے کے لئے ہیں
کچھ شعر فقط ان کو سنانے کے لئے ہیں
اب یہ بھی نہیں ٹھیک کہ ہر درد مٹائیں
کچھ درد کلیجے سے لگانے کے لئے ہیں
یہ علم کا سودا یہ رسالے یہ کتابیں
اک شخص کی یادوں کو بھلانے کے لئے ہے

آہٹ سی کوئی آئے تو لگتا ہے کہ تم ہو
سایہ کوئی لہرائے تو لگتا ہے کہ تم ہو
جب شاخ کوئی ہاتھ لگاتے ہی چمن میں
شرمائے لچک جائے تو لگتا ہے کہ تم ہو

محسن بھوپالی :

آپ وہ بھوپالی ہیں جس نے کراچی میں رہتے ہوئے بھوپال کو زندہ و تابندہ کر دیا۔ آپ کی شاعری کوئی معمولی چیز نہ تھی ان کے سامنے بڑے بڑے شاعروں کے چراغ ٹھنڈے ہو جاتے تھے۔ وہ اپنی پوری زندگی قوم کو اتحاد، محبت اور پاکستان کی خدمت کرنے کی تبلیغ اپنے اشعار کے ذریعے کرتے رہے۔ وہ 1932ء میں بھوپال کے ایک قصبے سارنگ پور میں 9 ستمبر 1932ء کو پیدا ہوئے۔ بھوپال کے مختلف مدارس میں تعلیم حاصل کی پھر پاکستان ہجرت کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم یہاں مکمل کی۔ آپ نے این ای ڈی کالج جو بعد میں یونیورسٹی بن گیا سے انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی۔ سندھ حکومت میں 19 ویں گریڈ کے افسر تھے۔ آپ کے بلند پایہ اشعار کے سبھی عاشق ہیں آپ کی جاندار شاعری نے کراچی کے مشاعروں میں جان ڈال دی تھی آپ کو ایک بین الاقوامی شاعر بھی کہا جا سکتا ہے کیوں کہ آپ نے دنیا کے بیشتر ممالک میں منعقدہ مشاعروں میں شرکت کی۔ آپ 17 جنوری 2007ء کو انتقال کر گئے مگر کئی کتابیں بطور یادگار اپنے پیچھے چھوڑ گئے۔ جن کے نام شکست شب، جستہ جستہ، نظمانے، گرد مسافت، رہ گزر کے پھول، روشنی تو دیئے کے اندر ہے، جاپان کے چار عظیم شعراء وغیرہ ہیں۔ آپ کے اشعار آج بھی ضرب المثل کے طور پر مشہور ہیں۔

جاہل کو اگر جہل کا انعام دیا جائے

اس حادثۂ وقت کو کیا نام دیا جائے
مے خانے کی توہین ہے رندوں کی ہتک ہے
کم ظرف کے ہاتھوں میں اگر جام دیا جائے

نیرنگیٔ سیاستِ دوراں تو دیکھئے
منزل اُنہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے

ان کا جو کام ہے اربابِ سیاست جانیں
اپنا پیغامِ محبت ہے جہاں تک پہنچے

ارشد صدیقی:

آپ پیدا تو ضلع ساگر مدھیہ پردیش میں ہوئے مگر جوانی میں ہی بھوپال تشریف لے آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ آپ کا اصل نام رشید محمد تھا۔ شاعری کا آغاز 1941ء سے کیا۔ جب ان کی عمر 23 سال تھی۔ آپ دبستان سیماب سے وابستہ تھے۔ آپ نے بے شمار مشاعروں میں شرکت کی۔ آپ دور درشن بھوپال سے منسلک رہے۔ آپ کا کلام پاک و ہند کے مختلف رسائل میں چھپتا رہا ہے۔ آپ کو مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی بھوپال سے سراج میر خاں سحر صوبائی ایوارڈ 95-1994ء برائے تخلیقی ادب دیا گیا تھا۔ آپ کی تصانیف جو شعریت سے بھرپور ہیں ان کے نام اس طرح ہیں۔ (1) خواب زار (غزلیں، نظمیں اور قطعات) (2) نوائے حرف (غزلیات و رباعیات) (3) نغمہ زار (غزلیات و رباعیات) (4) عنوانات

درخشاں (موضوعاتی نظمیں) (5) پس عکس خیال (انگریزی نظموں کے منظوم ترجمے) (6) عکس خیال (انگریزی نظموں کے منظوم تراجم) (7) طلوع سحر (آغاز شاعری کا انتخابِ کلام) (8) خواب زار (9) سحر ہونے تک۔

آپ کے کلام کا نمونہ ملاحظہ فرمائیے:

حبس آرزو ہے یا موت کی گھٹن یارو
بوئے پیرہن یارو! نکہت بدن یارو
تم بھی دل شکستہ ہو ہم بھی زخم خوردہ ہیں
پھر اٹھو بدل ڈالیں ظلم کا چلن یارو
آبروئے ارشد پر یوں نہ طنز فرماؤ
کچھ اسی سے قائم ہے عشق کا چلن یارو

منظر بھوپالی :

آپ نئی نسل کے مقبول شاعر ہیں۔ آپ بھوپال میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد سید عباس علی جاگیردار تھے اور دادا حکیم۔ بچپن سے ہی آپ کا ذہن شاعری کی جانب راغب تھا۔ پھر آپ کو کیف بھوپالی، شعری بھوپالی اور تاج بھوپالی جیسی عظیم شاعرانہ ہستیوں سے اکتسابِ فیض کا موقع میسر آیا۔ آپ کا مطالعہ بھی بہت وسیع ہے۔ جس نے آپ کی شاعری کے رنگ کو خوب خوب نکھارا ہے۔ آپ کی شاعری چونکہ عام فہم ہے اس لئے اسے عوامی شاعری کا درجہ حاصل ہے۔ آپ کے شگفتہ اشعار فوری طور پر ہر ایک کو متاثر کرتے ہیں۔ آپ نے اپنی بے مثال شاعری کی بدولت کم وقت میں عالمی شہرت حاصل کر لی ہے۔ آپ کی شاعری کے عوام ہی نہیں بلکہ اساتذۂ ادب بھی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکے۔ جگن ناتھ آزاد، کیفی اعظمی اور ڈاکٹر مظفر حنفی نے آپ کی

شاعری کو زبردست خراج تحسین پیش کیا ہے۔ آپ کو بھارت میں کئی ایوارڈز سے نوازا گیا ہے۔ آپ دنیا کے متعدد شہروں میں مشاعروں میں مدعو کیے گئے ہیں۔ آپ دس بار پاکستان آچکے ہیں۔ آپ خوش اخلاق اور حساس انسان ہیں۔ بھارت میں مسلمانوں کی زبوں حالی اور خاص طور پر تعلیم سے دوری سے بہت غمگین ہیں آپ بھوپال میں مسلمان طلبہ میں فروغِ تعلیم کے لئے کئی اسکول چلا رہے ہیں۔ آپ کے اشعار کا نمونہ ذیل میں ہے۔

امیر وہ ہے جو دل کا امیر ہو منظر
غریب وہ ہے جو دل کا غریب ہوتا ہے

سارا سکون گاؤں کی بانہوں میں آگیا
شہروں کی قسمتوں میں فسادات رہ گئے

زمین تنگ ہوتی جا رہی ہے نسل انساں پر
مکاں ملتے ہیں شہروں میں مگر آنگن نہیں ملتا

میر و غالب سے ہم بھی شعر کہتے ہیں
وہ صدی تمہاری تھی یہ صدی ہماری ہے

مسلم سلیم:

بھوپال کے ایک نامور شاعر ہیں پیشے کے اعتبار سے صحافی ہیں۔ روزنامہ ''ندیم بھوپال'' ہندی اخبار روزنامہ بھاسکر اور انگریزی اخبار ہندوستان ٹائمز میں لکھتے رہے ہیں۔ 1982ء میں بھوپال کے مشاعرے میں آپ نے قتیل شفائی کی موجودگی میں اچھی غزل پڑھی تھی اس مشاعرے میں اٹل بہاری واجپائی نے بھی شرکت کی تھی۔

غزل

یہ جسم کرتا ہے اکثر بہت سوال ترا
رگوں میں دوڑنے لگتا ہے جب خیال ترا
قدم بچا کے رکھوں میں اگر تو کیسے رکھوں
ہر ایک سمت تو پھیلا ہوا ہے جال ترا
قریب سے جو بچا کر نظر نکلتے ہیں
ذرا سنبھل یہی پوچھیں گے حال چال ترا
چلو سفر پہ جو تو ان کی راہ سے ہٹ کر
تو آج دیکھ لے کیا ہوگیا ہے حال ترا
عروج ہونے کو بیشک ہے بے مثال ترا
وہ دن بھی سوچ کہ جب آئے گا زوال ترا
دہک اٹھے گا کسی روز خود تیرا ہی بدن
تباہ کر دے گا تجھ کو یہ اشتعال ترا
ابھی تو سیر ستاروں کی کر رہا ہے تو
زمانہ دیکھے گا اک دن مگر زوال ترا
اُلٹ دے مسلم خستہ کے دشمنوں کے نگر
جمال والے دکھا دے ذرا جلال ترا

مقصود عمرانی :

آپ بھوپال میں پیدا ہوئے۔ آپ کا خاندان بیگمات کے دور میں بھوپال میں آباد ہوا تھا۔ آپ کے بزرگوں نے 1857ء کی جنگ آزادی میں بھی حصہ لیا تھا۔

جس کی پاداش میں مغلیہ دور سے چلی آرہی جاگیر کو بحق سرکار ضبط کرلیا گیا تھا۔ آپ کو زمانہ طالب علمی سے ہی شعر گوئی کا شوق تھا۔ ابتداء میں آپ فلک ہاشمی کے نام سے غزلیں اور نظمیں کہتے تھے۔ آپ نثر بھی بہت عمدہ لکھتے تھے۔ آپ کو فطری شاعر کہا جاتا ہے۔ آپ نے باغیانہ نظمیں بھی لکھی ہیں جن میں براہِ راست نوابی خاندان کو مخاطب کیا جاتا تھا۔ آپ کے باغیانہ مزاج کی وجہ سے آپ کی زندگی مصائب اور پریشانی سے عبارت تھی۔ آپ کی شاعری کا نمونہ درج ذیل ہے۔

سوچ سوچ پلکوں پر خواب خواب آنکھوں میں
تیرا جسم بنتا ہے تیرے گیت ڈھلتے ہیں
تو کہ سو گئی ہوگی آپ اپنی بانہوں میں
گیت تیری یادوں کے رہ گزر پہ چلتے ہیں

یاد اس خموشی میں نغمگی ہے خوش بو ہے
دور جاگ اٹھتا ہے نیند آنکھیں ملتی ہے
یاد اس خموشی میں چشم و لب ہے گیسو ہے
تیری یاد کی دھن پر روشنی سی چلتی ہے

بے کراں محبت کا دل چھلکتا ساغر ہے
تیری یاد کی لے پر موج موج چلتا ہوں
ان گنت خیالوں کا لہر لہر ساغر ہے
میں اسی سمندر میں ڈوبتا اچھلتا ہوں

دل کہ اک شرابی ہے لڑکھڑایا پھرتا ہے
اک ذرا میں ہنگامہ اک ذرا میں خاموشی
دل کہ ایک جگنو ہے جھلملایا پھرتا ہے
اک ذرا میں تابندہ اک ذرا میں تاریکی

بن بلائے آتا ہے تیری یاد کا موسم
اے خیال و معنی کی مہ جبین شہزادی
لمحہ لمحہ گرتی ہے تیرے حسن کی شبنم
دھیمے دھیمے کھلتی ہے تیرے جسم کی وادی

سید محمد مرتضیٰ شمیم :

آپ میرزا داغ دہلوی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ آپ نواب صدیق حسن خاں صاحب بہادر کے نواسے تھے۔ آپ کے والد میر عبدالحیٔ خاں کو ممتاز الدولہ صولت جنگ کا خطاب عطا ہوا تھا۔ اپنے والد کی طرح آپ بھی اخلاقی بلندی پر فائز تھے۔ آپ نے پوری زندگی کسمپرسی میں گزاری۔ ریاست سے 50 روپیہ ماہوار وظیفہ ملتا تھا اسی میں گزارہ کرتے تھے۔ آپ صاحب دیوان شاعر ہیں۔ آپ کا دیوان ''خم خانہ دل'' آپ کی غربت کی وجہ سے غیر مطبوعہ رہ گیا۔ آپ کے خوبصورت اشعار ہر ایک کو بھاتے ہیں۔ سر راس مسعود بھی آپ کی غزلوں کے عاشق تھے۔ آپ کے کلام کا نمونہ درج ذیل ہے۔

سازِ ہستی فریب ہستی ہے
جو بلندی ہے عین پستی ہے
دل مقام عروج ہستی ہے
ایک پردہ نشیں کی بستی ہے

دل کو حسرت ہے اس سے ملنے کی
آنکھ دیدار کو ترستی ہے
سینکڑوں میکدے بناتی ہے
جھوم کر جب گھٹا برستی ہے

اک درد ہے دل میں پوشیدہ اک زخم بھی پایا جاتا ہے
اشکوں کی جھڑی سے فرقت میں طوفان اٹھایا جاتا ہے
ہر ذرّے میں جلوہ پنہاں ہے ہر جلوہ میں لطف عرفاں ہے
یہ کیفِ جمالِ جاناں ہے آنکھوں میں سمایا جاتا ہے
مشتاق نظر میں تاب کہاں جو نورِ حقیقت دیکھ سکے
وہ جلوہ جو عکس جلوہ ہے تھوڑا سا دکھایا جاتا ہے

سراج میر خاں سحر :

آپ بھوپال میں 1857ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے اجداد بانیٔ ریاست بھوپال کے ہمراہ اورک زئی (صوبہ خیبر پختونخواہ) سے ہجرت کر کے بھوپال میں آبسے تھے۔ آپ کے والد ہزار میر خان نواب سکندر بیگم کے عہد میں اک دلیر فوجی کے طور پر مشہور تھے۔ آپ کی شادی ریاست کے سپہ سالار باقی محمد خاں کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ سراج میر خان سحر بچپن سے ہی دلیر اور ذہین تھے۔ آپ نے عربی اور فارسی کی کتاب مولوی وسیم بریلوی سے پڑھیں۔ خطاطی کی تعلیم منشی عبدالغنی شاہی سے حاصل کی۔ بھوپال کے ادبی ماحول کے دلدادہ تھے مشاعروں میں شوق سے شرکت کرتے تھے۔ شاعری کا شوق ہوا تو بھوپال کے اس وقت کے مشہور شاعر نیاز احمد خاں تحصیل دار کے شاگرد ہوئے۔ ان ہی نے انہیں سحر کے تخلص سے سرفراز فرمایا۔ بھوپال کا بچہ بچہ

آپ کی شاعری کا دلدادہ تھا۔ اکثر نوجوان آپ کے عشقیہ شعروں کو گنگناتے پھرتے تھے۔ آپ نہایت نیک دل سادہ طبیعت بزرگ تھے۔ سادگی اور خاکساری آپ کے خاص وصف تھے۔ آپ کا دیوان ''بیاضِ سحر'' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ آپ کے کلام میں اثر و جذب بہت نمایاں ہے۔ مترنم بحروں میں آپ کا کلام ایک خاص کیفیت پیدا کرتا ہے۔ آپ کے کلام کا نمونہ ملاحظہ فرمائے۔

بے جرم کی گردن تہہ خنجر ہے نظر میں
اب تک وہی ہنگامۂ محشر ہے نظر میں
دل چیر کے پہلو سے نکل جاتی ہے کیونکر
ناوک ہے نہ نیزہ ہے نہ نشتر ہے نظر میں
الطاف جو ہیں غیر پہ سب دیکھ رہا ہوں
ساقی یہ تیرا شیشہ و ساغر ہے نظر میں
اس خاک نشیں کا ہے دماغ آج فلک پر
کسریٰ کا محل پھوس کا چھپر ہے نظر میں

سینہ میں دل ہے دل میں داغ داغ ہیں سوز و ساز عشق
پردہ بہ پردہ ہے نہاں پردہ نشیں کا رازِ عشق
باندھ کے صف ہوں سب کھڑے تیغ کے ساتھ سر جھکے
آج تو قتل گاہ میں دھوم سے ہو نمازِ عشق
فرشِ زمیں پہ مصطفیٰ عرشِ بریں پہ کبریا
پہنچا ہے دیکھنا کہاں سلسلۂ درازِ عشق

بدر واسطی:

آپ بھوپال میں پیدا ہوئے۔ آپ کے اجداد مغلیہ دور میں ہندوستان تشریف لائے۔ آپ کے اجداد کا اصل وطن (واسط عراق) تھا۔ آپ نامور شاعر ہونے کے ساتھ معلم اور صحافی بھی تھے۔ آپ کو بچپن سے ہی شاعری اور ڈرامہ نگاری کا شوق تھا۔ ذرائع معاش محدود تھے چنانچہ ٹی وی ڈرامے لکھ کر اور ٹی وی پر کمپیئرنگ کر کے وسائل پیدا کرتے رہے ساتھ ہی نام بھی پیدا کیا۔ آپ کی غزلوں میں زندگی کے مختلف رنگ نظر آتے ہیں۔ آپ صرف شعر ہی نہیں کہتے رہے بلکہ افسانے اور ڈرامے بھی تخلیق کئے۔ آپ نے ٹیلی سیریل اور ٹیلی فلمیں بھی لکھیں۔ آپ کی غزلوں کا نمونہ درج ذیل ہے۔

شام دل کش رات مہ وش صبح گل وش بدر جی
یاد جنت میں بھی آئیں گے مزے بھوپال کے

بھروسہ کر لیا تھا اس لئے اب دکھ اٹھانا ہے
تو اپنا کیوں سمجھ بیٹھا تھا ان مہمان لمحوں کو
سفر صدیوں کا جب لمحے بھلا دیتے ہیں
تو پھر صدیوں میں ملتی ہے نئی پہچان لمحوں کو

مرا رنگ ہے جو کھلا کھلا مرا روپ ہے جو ہرا بھرا
یہ خوشی ہے تیرے خیال کی مین کہاں کا ایسا امیر ہوں
تیری خوبیوں کا کمال ہے مجھے ہجر میں بھی وصال ہے
تجھے کچھ خبر بھی ہے بے خبر کہ میں یوں بھی تیرا اسیر ہوں

تیرا سیّدوں سے ہے سلسلہ اسی واسطے سے بہت ملا
مجھے بدر سوچنا چاہیئے کیا میں اس کا عشرِ عشیر ہوں

عبید اللہ علیم :

آپ 12 جون 1931ء کو بھوپال میں پیدا ہوئے۔ آپ نے بھی اپنی معنی خیز شاعری کے ذریعے بھوپال کا نام بلند کیا۔ آپ ایک جذباتی اور انقلابی شاعر کے طور پر مشہور تھے۔ آپ کے اشعار میں بڑی قوت اور ساتھ ہی ندرت ہے۔ آپ کے اشعار غور و فکر کی دعوت عام دیتے ہیں۔ آپ کے چار شعری مجموعے مقبول عام ہوئے جو ''چاند چہرہ ستارہ آنکھیں''، ''ویران سرائے کا دیا''، ''نگارِ صبح کی امیدیں'' اور ''یہ زندگی ہماری ہے'' ہیں۔ آپ 18 مئی 1998ء کو کراچی میں انتقال کر گئے۔ آپ کی شاعری کا نمونہ درج ذیل ہے۔

آپ کے گھر میں ہر طرف منظر ماہ و آفتاب
ایک چراغ شام اگر میں نے جلا لیا تو کیا
باغ کا باغ آپ کی دسترس ہوس میں ہے
اک غریب نے گر پھول اٹھا لیا تو کیا
پڑھتا نہیں ہے اب کوئی سنتا نہیں ہے اب کوئی
حرف جگا لیا تو کیا شعر سنا لیا تو کیا

بھوپال کی قدیم مثنویاں :

ہم نے بھوپال سے تعلق رکھنے والے چند اہم شاعروں کا تعارف کرا دیا ہے مگر حقیقتاً ایک قدیم شاعر جو نواب سکندر بیگم کے زمانے کے ہیں ان کا ذکر پہلے ہونا چاہیئے تھا مگر بوجوہ ان کی شاعری سے اب متعارف کرانے کی سعادت حاصل کرتے

ہیں۔ ان کا نام شیخ کریم اللہ تھا مگر عرفیت شیخ محمد غوث تھی۔ یہ دراصل بنارس کے رہنے والے تھے مگر نوکری کی تلاش میں ریاست بھوپال تشریف لے آئے تھے۔ انہوں نے ایک طویل مثنوی لکھی تھی جو دوست محمد خاں سے لے کر نواب سکندر جہاں بیگم کی حکومت تک کے حالات پر مبنی تھی۔ یہ تاریخی مثنوی بہت ممکن ہے کہ سکندر جہان کی فرمائش پر لکھی گئی ہو۔ اس مثنوی میں تین ہزار نوے (3090) اشعار ہیں۔ عنوانات فارسی میں ہیں۔ ہر باب کی ابتداء میں کسی اخلاقی مسئلے پر چند نصیحت آمیز شعر لکھے گئے ہیں۔ یہ حمد سے شروع ہوتی ہے۔ اس میں حمد کے 29 اشعار، نعت کے 135 اشعار، منقبت اصحاب کبار رضوان اللہ اجمعین کے 19 اشعار، اہل بیت کی صفات اور مناجات کے 34 اشعار، شاہی شجرے کے 42 اشعار، نواب سکندر جہاں بیگم کے لئے 35 اشعار مثنوی کی شان میں 19 اشعار کے بعد نواب دوست محمد خاں سے لے کر نواب سکندر جہاں تک کی تاریخ پر پوری مثنوی کے اشعار کہے گئے ہیں۔ مثنوی کی حمد کا ایک شعر ملاحظہ کیجئے:

لکھے کس طرح کوئی تعریف حق
کہ پیدا کئے جس نے چودہ طبق

شاعر اپنے بارے میں کہتا ہے:

بنارس قدیمی مرا ہے وطن
زمین اس کی ساری ہے رشک چمن

مثنوی کے لکھنے کی وجہ بتانے کے لئے شاعر کہتا ہے کہ یہ ایک فارسی کی کتاب سے ماخوذ ہے جسے چند احباب نے شاعری میں ڈھالنے کا مشورہ دیا:

زباں فارسی میں ہے جو یہ لکھی
وہ ہے ایک تاریخ، بھوپال کی

کہ ہے زندگی کی نشانی بڑی
انہوں سے یہ بات میں نے سنی
تو میرے بھی دل کو آئی پسند
کہ تھی بات یہ خوب اور ارجمند

اسلام نگر کے قلعے کی بنیاد رکھنے پر چند اشعار ملاحظہ کیجئے

تھے گیارہ سو اور چہل ہجری کے سال
مہینہ تھا ذالحجہ کا اے خوش خصال
نہم اسکی تاریخ فرخندہ تھی
مبارک تھا جمعہ کا دن اے اخی
ہوئی اس میں قائم بنائے حصار
کہ ہے اب تلک وہ بہت استوار

جب دوست محمد خاں کے انتقال کی خبر دکن پہنچی تو والیٔ دکن نے یرغمال کے طور پر رکھے دوست محمد خاں کے پسر یار محمد خاں کو فوراً بھوپال بھیج دیا تھا۔ مثنوی کے اس پر چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

اک دم عطا اس کو خلعت کیا
سوا اس کے ماہی مراتب دیا
نشان اور نقارہ خرگاہ بھی
عنایت ہوا سب بصد خرمی
خطاب اس کو دے کر نواب کا
سواراں جرار جنگ آزما

دیئے اک ہزار اور روانہ کیا
طرف شہر بھوپال کے یہ چلا

وزیر محمد خاں اور ان کے گھوڑے کی تعریف میں کہے گئے اشعار اس طرح ہیں:

وزیر محمد خاں عالی نثار
رہا تھا پنڈاروں میں لیل و نہار
وہ غارت گری کے سوا اور کام
نہ جانے تھا اے مرد فرخندہ نام
کسی جنگ میں دم کٹی اسپ کی
جدا اس کو کرتا نہ تھا ایک گھڑی
اس دن سے نام اس کا اے نیک نام
پڑا بانڈے گھوڑے والا لا کلام
پنڈاری سے کہتا تھا کوئی یہ جا
کہ وہ بانڈ گھوڑے والا آ گیا
فراری یہ سن کر ہوتے تھے سب
نہ دیکھے تھے منہ پھیر کر بے ادب

جب ناگ پور کی فوج نے بھوپال کو گھیر لیا۔ شہر کی حالت ابتر ہوگئی تھی۔ اس پر چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

کہیں دان سنگھ ایک دن ناگہاں
ہوا باب منگل پہ حملہ کناں
گنوری سے صدیق علی آ گیا
عجب اس گھڑی یہ تماشا ہوا

زنان خواتیں کہ بر بام تھیں
انہوں نے ذرا تہور وہیں

دیئے اس قدر سنگ و خشت مار
سپہ ناگپور کی ہوئی بے قرار
وہ زخمی ہوئے ان پر پتھر پڑے
ہوئے مضطرب غیبی گولے لگے

یہ مثنوی اردو کی چند مستند مثنویوں میں سے ایک ہے مگر اس پر نہ تو ڈاکٹر گیان چند کی نظر پڑی اور نہ ہی ڈاکٹر سلیم حامد رضوی کی۔ جناب ابراہیم یوسف کا یہ گلہ بالکل بجا ہے۔ شکر ہے ابراہیم یوسف کی وجہ سے اسے راقم نے اپنی کتاب ''بھوپال کی کہانی'' میں شامل کر لیا۔

ڈاکٹر سلیم حامد رضوی کی تحقیق نے ایک اور قدیم بھوپال کے شاعر کا کھوج لگا لیا ہے۔ ان کے مطابق قاضیٔ بیر سیہ محمد صالح بھوپال کے پہلے شاعر معلوم ہوتے ہیں۔ انہوں نے اسلامی اخلاقی تعلیم کے لئے ایک ''مثنوی اخلاق ہند'' 1707ء میں تصنیف کی تھی۔ انہوں نے ہی 1717ء میں ایک اور مثنوی ''جنگ نامہ امیر'' کے نام سے تصنیف کی جس میں نواب دوست محمد خاں کی جنگی معرکہ آرائیوں کو نظم کیا گیا ہے۔ پھر 1718ء میں قاضی رائے سن محمد معظم کی نظم ''تقصیر ہندی'' نظر آتی ہے۔ پھر 1738ء میں بھوپال کے مفتی خیر اللہ صدیقی جنہیں ''شاعر خوش گفتار'' کا لقب تاریخ میں دیا گیا ہے کی 350 اشعار کی مثنوی بنام ''فقہ ہندی'' نظر آتی ہے۔ اس کے دو اشعار ملاحظہ کیجئے:

ذات اللہ کو برحق جان
سب کا خالق مطلق مان

سب پیدائش رب کا ہے
وہ خالق ان سب کا ہے

1745ء میں ایک اور قدیم شاعر شاہ اصغر کا کلام نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

چند روزہ زندگانی ہے
ساری یہ کائنات فانی ہے
حسن دو روزہ یہ تو نہ بھول
سن لے ایک روز موت آنی ہے

☆☆☆

KUTUB KHANA JALALI BOOKS JALALI

بھوپال کے ادیب

بھوپال کے چند نامور شاعروں کے حالات اور ان کی شاعری کے نمونے ہم آپ کے سامنے پیش کر چکے ہیں۔ اب بھوپال کے ادیبوں اور صحافیوں کا تذکرہ کرنے کی سعادت حاصل کریں گے۔ بھوپال نے ادب کی ترویج میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہاں کئی نامور افسانہ نگار ڈرامہ اور مضمون نگار پیدا ہوئے۔ انہوں نے صحافت کے شعبے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ ان لوگوں میں مردوں کے ساتھ خواتین بھی شامل تھیں۔ انہوں نے اپنی تحاریر کے ذریعے لوگوں کے دلوں پر حکمرانی کی اور اپنی ریاست بھوپال کا نام پورے برصغیر میں روشن کیا۔ ابتدا ہم ڈاکٹر رضیہ حامد سے کر رہے ہیں۔

پروفیسر آفاق احمد :

آپ 1932ء میں بھوپال میں پیدا ہوئے۔ آپ ایک نامور ادیب نقاد افسانہ نگار اور صحافی بھی ہیں۔ مطالعہ تحقیق اور تدریس آپ کے محبوب مشاغل ہیں۔ آپ کی نثر نگاری میں مترنم الفاظ کی چاشنی، فکر وفن کی گہرائی اور مقصدیت کا واضح اظہار نظر آتا ہے۔ آپ کے افسانوں کے دو مجموعے کئی کتابوں کے ترجمے اور بڑی تعداد میں مقالے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ علامہ اقبال پر تنقیدی مضامین کے دو مجموعے بھی ترتیب دیئے ہیں۔ بزرگوں، نوجوانوں اور بچوں کے لئے بھی کتابیں تحریر کیں۔ آپ کی تحاریر میں ہر عمر کے لوگوں کے لئے دلچسپی موجود ہے۔ بحیثیت ادیب پاک و ہند کے تمام چوٹی کے ادیبوں اور شاعروں میں اپنی پہچان رکھتے ہیں۔ آپ بحیثیت ادیب اور مقرر مختلف ممالک کا دورہ کر چکے ہیں۔ صحافت کے شعبے میں بھی بہت نام پیدا کیا ہے۔ آپ

بھارت کے کئی مشہور اخباروں کے نامہ نگار رہے ہیں۔ ان اخباروں میں مشہور زمانہ ''ملاپ''، ''قومی آواز''، ''خلافت'' اور ''تیج'' شامل ہیں۔ پاکستان کے کئی اخباروں میں آپ کے تحقیقی مضامین شائع ہو چکے ہیں۔

پروفیسر آفاق حسین صدیقی :

آپ بھوپال کی ایک معروف ادبی شخصیت ہیں۔ آپ نے بے شمار تحقیقی تنقیدی اور علمی مضامین تحریر کئے۔ آپ نے علامہ اقبال اور مولانا الطاف حسین حالی پر کئی مقالات لکھے ہیں جن کے نام ''اقبال کے شخصی مراثی'' اور ''حالی کا مرثیہ غالب'' ہیں۔ یہ مقالات بھارت کے کئی رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ آپ کا تعلق کئی ادبی انجمنوں سے ہے۔ آپ کو کئی سرکاری اداروں کی جانب سے آپ کی ادبی خدمات پر انعامات سے نوازا گیا ہے۔ آپ کی تصانیف کے نام ''جاں نثار اختر: شخص اور شاعر''، ''اندر بھیا مداری لال'' ہیں۔ آپ کو بھارت کی مختلف یونیورسٹیوں کی کمیٹیوں کے ممبر رہنے کا بھی اعزاز حاصل ہے۔ آپ ایک کامیاب اور خوش اخلاق مدرس بھی رہے ہیں۔

تخلص بھوپالی :

آپ نے اپنے مزاحیہ مضامین کے ذریعے نہ صرف بھوپالیوں کے لئے تفریح طبع کا سامان پیدا کیا بلکہ بھوپال کے ادبی ماحول میں ایک نئی قسم کی مضمون نگاری کی ابتداء کی۔ آپ کی مزاح سے بھرپور تحاریر ''بھوپال پنچ'' نامی رسالے میں چھپنا شروع ہوئیں۔ آپ کی مزاحیہ تحاریر میں حقائق کا اظہار اور آپ کے گہرے مطالعے کے عکاس ہیں۔

انہوں نے طنز و مزاح سے بھرپور ''بھوپال پنچ'' میں 1940ء سے لکھنا شروع کیا اور مسلسل تین سال تک اپنی مزاحیہ نگاری سے خاص و عام کو لطف اندوز کرتے

رہے۔ بھوپال پنچ میں آپ کے ''شیطان جاگ اٹھا''، ''پوسٹ مارٹم''، ''پنچ ڈکشنری'' اور ''نربدا بہتی ہے'' جیسے معرکتہ الآراء مضامین نے دھوم مچا دی تھی۔ آپ کی دو تصانیف بہت مشہور ہیں جن کے نام ''پاندان والی خالہ'' اور ''غفور میاں'' ہیں۔

اسد محمد خاں:

آپ قابل قدر ادیب ہیں۔ آپ 26 ستمبر 1932ء کو بھوپال میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم بھوپال میں حاصل کی اور اعلیٰ تعلیم کراچی میں مکمل کی۔ آپ کے خاندان کا تعلق بانئ ریاست بھوپال دوست محمد خاں سے ہے۔ آپ نے افسانوں کے علاوہ کہانیاں، ٹی وی ڈرامے اور ایک فلم کی کہانی بھی لکھی۔ آپ نے شاعری میں بھی نام پیدا کیا۔ آپ کی لکھی ڈرامہ سیریل شاہین بہت مقبول ہوئی تھی۔ آپ نے ریڈیو پاکستان کے لئے 150 گیت لکھے۔ آپ کے قومی نغمے کافی مقبول ہوئے۔ آپ کی کئی کہانیوں کے انگریزی ترجمے ہو چکے ہیں۔ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے آپ کی 12 کہانیوں کے تراجم کتابی شکل میں شائع کئے تھے۔ آپ کی ایک نظم ''کھڑکی بھر آسمان'' کا جرمن زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

صہبا لکھنوی:

آپ 25 دسمبر 1919ء کو بھوپال میں پیدا ہوئے۔ آپ نے تعلیم کے دوران ہی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ آپ نے 1945ء میں بھوپال سے ایک نامور رسالہ ''افکار'' کا اجراء کیا۔ پاکستان آنے کے بعد 1951ء سے کراچی سے ''افکار'' کو جاری کیا۔ آپ ایک ادیب، شاعر اور صحافی کی حیثیت سے ملک وقوم کی خدمت کرتے رہے۔ آپ کی تحقیقی کتاب ''اقبال اور بھوپال'' کے اب تک کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ آپ کی دیگر کتابوں میں ''مجاز ایک آہنگ''، ''ارمغان مجنوں''، ''رئیس امروہوی فن

اور شخصیت'' اور ''سعادت حسن منٹو'' شامل ہیں۔ آپ نے اپنے رسالے ''افکار'' کے ذریعے اردو ادب کی اور ادیبوں کی بے مثال خدمت انجام دی۔ آپ نے افکار کے نامور شاعروں اور ادیبوں پر کئی نمبر نکالے تھے جو تمام مقبول عام ہوئے تھے۔

قدوس صہبائی :

آپ 1910ء میں بھوپال میں پیدا ہوئے۔ آپ کے بزرگوں نے 1857ء کی جنگ آزادی میں حصہ لیا تھا۔ آپ حافظ قرآن تھے۔ ابتدائی تعلیم بھوپال میں حاصل کی اور بمبئی یونیورسٹی سے بی اے آنرز و ایم اے کیا۔ آپ ایک نامور افسانہ نگار اور ناول نگار بھی تھے۔ آپ کے افسانوں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں ان کے نام ''زلزلے ولولے''، ''نئے خاکے'' اور ''کروٹیں'' ہیں۔ آپ کو افسانے کی تکنیک اور فنی پیچیدگی پر عبور حاصل تھا۔ افسانہ نگاری کے شہنشاہ کرشن چندر نے بھی آپ کے افسانوں پر پسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ ان کے مطابق قدوس صہبائی کے افسانوں میں افسانویت موجود ہے۔ وہ افسانوں میں قاری کو معموں میں نہیں الجھاتے بلکہ بات صاف کرتے چلے جاتے ہیں۔ وہ کہانی کہتے چلے جاتے ہیں اور کردار حرکت کرتے جاتے ہیں۔ مختصر الفاظ میں اپنا مدعا کہنے والے قدوس صہبائی لائق تحسین افسانہ نگار ہیں۔ آپ نے صحافت میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ پاک و ہند کے تمام ہی اخباروں میں لکھا۔ آپ پاکستان کے کئی انگریزی اخباروں میں بھی اپنی قلم کاری کے جوہر دکھاتے رہے۔

ڈاکٹر رضیہ حامد :

آپ بھوپال کی نامور ادیبہ ہیں۔ آپ کی ادبی خدمات کو پاک و ہند کے سبھی اردو داں قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ آپ ایک کامیاب نثر نگار ہیں۔ آپ کی تحاریر میں ماضی اور حال دونوں اقدار کا پاس رکھا گیا ہے۔ آپ کا انداز تحریر انتہائی جامع ہے۔

تحریر میں سادگی اور روانی کے علاوہ مقصدیت پائی جاتی ہے۔ آپ کا سب سے بڑا کارنامہ رسالہ فکر و آ گہی کا اجراء ہے۔ یہ اِس عہد کا ایک معتبر ترین میگزین ہے جس میں ہر مضمون تحقیق کی کسوٹی پر پرکھ کر شامل کیا جاتا ہے۔ فکر و آ گہی کے اب تک آپ نے کئی نمبر نکالے ہیں جو موجودہ دور کی کئی معتبر شخصیات کے علاوہ کئی شہروں اور اداروں پر نکالے گئے ہیں۔ فکر و آ گہی کا بھوپال نمبر ایک یادگار حیثیت کا حامل ہے۔ آپ کی تحریر کردہ کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ جن میں ''لمحوں کا سفر''، ''رفعت سروش'' بحیثیت نثر نگار ''نقوش بھوپال''، ''نواب صدیق حسن خاں'' اور ایک افسانوں کا مجموعہ شامل ہے۔ آپ کو آپ کے تحقیقی مضامین پر بھارت کے کئی اہم اداروں کی جانب سے اعزازات مل چکے ہیں۔

رشید انجم :

آپ 10 فروری 1940ء کو بھوپال میں پیدا ہوئے۔ آپ کے پردادا کا تعلق پشاور سے تھا۔ وہ وہاں سے ہجرت کر کے بھوپال میں آباد ہو گئے تھے۔ آپ کے دادا برطانوی فوج میں میجر کے عہدے پر فائز تھے۔ آپ نے پہلی اور دوسری عالمی جنگوں میں حصہ لیا تھا۔ آپ کے والد میاں عبدالرحیم ایک سلجھے ہوئے انسان تھے۔ رشید انجم ایک فطری قلم کار تھے۔ آپ نے باکمال افسانے لکھے لیکن آپ کے لکھے ڈرامے بھی بہت مقبول ہوئے۔ آپ کے افسانوں کا ایک مجموعہ ''دل سمندر آشنا'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ آپ کا پہلا ڈرامہ ''لہو پکارے گا'' تھا جو اسٹیج پر پیش کیا گیا جسے عوام میں بہت پذیرائی ملی تھی۔ آپ کے گیارہ اردو ڈرامے مقبول ہوئے ہیں۔ یہ تمام ڈرامے اسٹیج ہو چکے ہیں۔ آپ کا ایک ڈرامہ تیسری جنس سے متعلق ہے۔ یہ انتہائی دلچسپ تھا جسے ممبئی میں اسٹیج کیا گیا تھا۔ آپ کے ڈرامے کتابی صورت میں طبع ہو چکے ہیں۔ جن کے نام ''صلیب زندہ ہے''، ''فرعون''، ''فاصلوں میں بٹی زندگی''، ''شجاع

الدولہ''، ''سنگریز ہوائیں''۔ آپ نے کئی ہندی اور انگریزی کتابوں کے اردو میں ترجمے بھی کئے ہیں۔ آپ ایک کامیاب صحافی بھی ہیں۔ ایک فلمی رسالے ''فلم دلیش'' بھوپال سے وابستہ رہے۔ پندرہ روزہ ''صدائے اردو بھوپال'' میں اسسٹنٹ ایڈیٹر رہے۔ کئی فلموں کے اسکرپٹ بھی تحریر کئے۔

محمد خالد عابدی :

آپ 17 اگست 1947ء کو بھوپال میں پیدا ہوئے۔ آپ ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے بہت مشہور ہیں۔ اگرچہ آپ نے ادبی زندگی میں ایک شاعر کی حیثیت سے قدم رکھا مگر بہت جلد افسانہ اور ڈرامہ نگاری کی طرف آ گئے۔ آپ کی ہر تحریر آپ کی تخلیقی صلاحیت کا مظہر ہے۔ آپ کی ادبی اور تنقیدی صلاحیت کا سب نے ہی اعتراف کیا ہے۔ اکثر سماجی اور رومانوی موضوعات پر قلم اٹھایا ہے اور یہ مواد آس پاس کے ماحول سے ہی حاصل کیا ہے۔ آپ کی زبان سادہ اور تحریر با مقصد ہے۔ آپ کے افسانوں میں نہ کنفیوژن کو جگہ دی گئی ہے اور نہ ہی تخلیقی سطح پر بے دلی دکھائی گئی ہے۔ آپ کے افسانے قاری کو ایک ایسی دنیا میں لے جاتے ہیں جو ہمارے آس پاس ہی موجود ہوتی ہے۔ آپ کے افسانوں کے کردار اور ماحول حقیقی پس منظر پر مبنی ہوتے ہیں۔ آپ کے ہاں مبالغہ آرائی کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ آپ کے افسانوں کا ایک مجموعہ ''زخموں کے دریچے'' شائع ہو چکا ہے۔ آپ ایک بے مثال ڈرامہ نگار بھی ہیں۔ آپ کے ڈراموں کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

☆☆☆

بھوپال میں اُردو صحافت

بھوپال ریاست کے نوابین جس طرح خود دنیا اور برصغیر کے حالات و واقعات سے باخبر رہنا چاہتے تھے اسی طرح وہ اپنے عوام کو بھی عالمی، علاقائی اور ریاست کے حالات و واقعات سے باخبر رکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ریاست میں صحافت کے ارتقا میں گہری دلچسپی لی اور ریاست میں اخبارات اور جرائد کو نکالنے میں اہل علم حضرات اور مالکان کی بھرپور ہمت افزائی کی۔ ریاست سے سب سے پہلا اخبار جو ہفت روزہ تھا 22 مارچ 1871ء سے نکلنا شروع ہوا۔ اس اخبار کا نام ''عمدۃ الاخبار'' تھا اس کے مدیر حکیم اصغر حسین تھے۔ اس کے بعد ریاست کے دارالخلافہ بھوپال سے اخباروں اور جرائد کی اشاعت کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا۔ یہاں سے کل 247 اخبارات اور جرائد شائع ہوئے۔ جن میں 16 روزنامے تین سہ روزہ، ایک چار روزہ، 140 ہفت روزہ، ایک دس روزہ، آٹھ پندرہ روزہ، 56 ماہنامے، 6 سہ ماہی، ایک چار ماہی اور 5 سال نامے شامل تھے۔

پہلا ہفت روزہ ''عمدۃ الاخبار'' ریاست کی سرپرستی میں نکلا تھا چنانچہ یہ اخبار سرکاری ترجمان تھا۔ اس کے ذریعے حکومتی خبروں اور عوام کو مختلف سرکاری امور سے آگاہی کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ ایک اور اخبار ''اختر شہنشاہی'' جس کا اجراء 1888ء میں ہوا تھا کے مطابق بھوپال کا پہلا اخبار عمدۃ الاخبار نہیں بلکہ ہفت روزہ ''آفتابِ قدرت'' تھا جو عبدالکریم انصاری کی ادارت میں شائع ہوا تھا۔ 1883ء میں دوسرا ہفت روزہ ''صداقت'' نکلنا شروع ہوا۔ اس کے مدیر منشی عبدالکریم اوج تھے۔ یہ

اخبار نواب شاہجہاں کے شوہر نواب صدیق حسن خاں کی پالیسیوں کا سخت مخالف تھا۔ جس کو تین ماہ تک تو برداشت کیا گیا اس کے بعد اخبار کے ایڈیٹر عبدالکریم اوج کو ریاست بدر کر دیا گیا۔ انہوں نے ہوشنگ آباد میں رہائش اختیار کر لی اور وہاں سے ایک نیا اخبار ''موج نربدا'' کے نام سے جاری کیا۔ بزرگ صحافی علامہ محمد یوسف قیصر کے مطابق اس اخبار میں ''موج ظرافت'' کے نام سے طنز و مزاح کے لئے ایک حصہ مخصوص کیا گیا تھا۔ 1909ء میں علامہ یوسف قیصر نے بھوپال سے خواتین کا ادبی پرچہ ''الحجاب'' نکالا تھا۔ اس اخبار کی سرپرستی نواب سلطان جہاں بیگم نے کی تھی۔ اس اخبار کے معیار کی بہت تعریف تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی اس کے معیار کو سراہا تھا۔ علامہ یوسف قیصر کی ادارت میں 1912ء میں ''مالوہ ریویو'' اور پھر 1913ء میں ''ظل السلطان'' نامی اخبار شائع ہوا تھا۔ انجمن رعایائے بھوپال کے تحت 1933ء میں ہفت روزہ ''آواز'' جاری ہوا۔ یہ اخبار بیک وقت اردو اور ہندی میں شائع ہوتا تھا۔ اس کے بعد 1934ء میں انجمن خدام وطن کے زیر اہتمام اخبارِ ''صبح وطن'' کا اجراء ہوا۔ اس اخبار میں ایک کارٹون کے شائع ہونے پر اسے بند کر دیا گیا تھا اور اس کے ایڈیٹر و عملے کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ جس کے خلاف بھوپال کے عوام ریاست کی انتظامیہ کے خلاف سراپا احتجاج ہو گئے تھے۔ بھوپال سے پہلا روزنامہ اخبار 1938ء میں جاری ہوا۔ یہ ''رہبر وطن'' تھا اسے ڈاکٹر دوست محمد خاں نے نکالا تھا۔ اخبار کی ایک اشاعت میں انہوں نے شہزادی عابدہ سلطان کے بارے میں خنجر مالوی کی ایک نظم شائع کی تھی جس میں عابدہ سلطان کے پولو کھیلنے پر طنز کیا گیا تھا۔ ریاستی حکومت نے اس کا سخت نوٹس لے کر ڈاکٹر دوست محمد خاں کو ریاست بدر کر دیا تھا۔ اسی دور میں بھوپال سے ہفت روزہ اخبار ''صبح وطن ثانی'' ایڈیٹر شاکر علی خاں کی ادارت میں جاری ہوا۔ قدوس صہبائی کی ادارت میں ہفت روزہ ''آزاد'' اور ایڈیٹر لطف اللہ نظمی اور جوہر قریشی نے ہفت

روزہ ''منصف''۔ شیام بہاری اگروال نے ہفت روزہ ''بھوپال ٹائمز'' قاضی شریف الدین نے ہفت روزہ ''احتجاج'' مولانا طرزی مشرقی نے ہفت روزہ ''ترجمان'' ایس ایم کامل، احمد علی خان اور جوہر قریشی نے مل کر ہفت روزہ ''کمال'' اصغر مالوی، احمد علی خان اور ایس ایم کامل نے مل کر ہفت روزہ ''تازیانہ'' انوارالحسن نے ہفت روزہ ''نیا بھوپال'' اور جوہر قریشی، جی ایم نغمی اور پریم شری واستو نے مل کر ہفت روزہ ''الحمراء'' نکالا تھا۔

1947ء تک بھوپال میں اردو صحافت کا بول بالا رہا مگر اس کے بعد ریاست کا انڈین یونین میں انضمام کا حادثہ پیش آیا۔ جس نے اردو صحافت کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ 1947ء کے بعد بھوپال سے جاری ہونے والے ہفت روزہ اخباروں کے نام اس طرح ہیں ''نیا دور، راہی، مزدور، نوجوان، نئی راہ، حقیقت، ترجمان نو، نیا پھول، نیا سماج، الجبل اور شعلہ حیات'' بھوپال سے خواتین کے لئے جاری کئے گئے ہفت روز اخباروں کے نام اس طرح ہیں۔ 1933ء میں ''امہات اور بانو'' 1939ء میں ''آفتاب نسواں''، 1947ء میں ''افشاں'' 1949ء میں ''صراطِ مستقیم'' شائع ہوئے۔ بھوپال سے نکلنے والے ہفت روزہ اخباروں میں ایک صفحہ فلمی خبروں کے لئے بھی مخصوص کیا جاتا تھا۔ ان اخباروں میں ہفت روزہ ''ندیم'' اور ''افکار'' شامل ہیں۔ افسانہ نگار انجم سلیمانی، آفاق احمد اور زہرہ جمال فلمی شخصیات اور فلموں کے بارے میں مضامین لکھا کرتے تھے۔ ابو صفیان آفاقی جو ان دنوں جوان تھے فلمی صفحوں پر اپنے مضامین بڑے شوق سے شائع کراتے تھے۔ بعد میں یہ پاکستان منتقل ہوگئے اور یہاں فلمی صنعت سے وابستہ ہوگئے۔ ان کی ہدایات میں پاکستان میں کئی کامیاب فلمیں بنی تھیں۔ بھوپال سے بچوں کے لئے بھی اخبارات شائع ہوئے تھے۔ جن میں ''معصوم دنیا''، ''طفلستان''، ''چمن''، ''بچوں کی دنیا'' اور ''جگنو'' شامل تھے۔

☆☆☆

بھوپال میں تعلیمی سرگرمیاں

ریاست بھوپال کو علمی سرگرمیوں کے لئے پورے برصغیر میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس ریاست کے نوابین نے اپنی مسلمان اور ہندو رعایا کی تعلیم کے لئے بڑی فراخ دلی اور خصوصی دلچسپی کا مظاہرہ کیا تھا۔ ویسے تو بھوپال میں باقاعدہ تعلیمی نظام نواب سکندر جہاں کے زمانے سے شروع ہوا مگر سردار دوست محمد خاں کے زمانے سے ہی علمی سرگرمیاں شروع ہو چکی تھیں۔ اس زمانے میں بھوپال میں اہل علم مختلف علاقوں سے سمٹ کر آنا شروع ہوگئے تھے۔ رستم علی سرہندی اپنی تصنیف ''تاریخ ہندی'' میں دوست محمد خاں اور ان کے بیٹے یار محمد خاں کی علم دوستی کے بارے میں لکھتے ہیں ''بھوپال صحیح معنی میں دارالامان کہلانے کا مستحق تھا۔ سردار مرحوم کی دین داری اور علم نوازی کی بدولت اطراف ہند سے علماء، فقہا بھوپال آتے رہے تھے اور نواب صاحب کے دستر خوان پر فقہا اور علماء کی بڑی جماعت بیٹھتی تھی جن کی بدولت علم و ادب کا چرچہ عام تھا'' ریاست میں تعلیم کے فروغ کے لئے حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کو خط لکھا گیا تھا جس میں ان سے خود بھوپال آنے یا اپنے شاگردوں کو وہاں بھیجنے کی درخواست کی گئی تھی تاکہ بھوپال میں دینی و دنیوی تعلیم کا بول بالا ہو سکے۔ نواب نذر محمد خاں کے زمانے میں ریاست میں امن و امان بحال ہوا کیوں کہ آپ نے مرہٹوں کی جانب سے بار بار حملوں اور خود ریاست میں خانہ جنگی سے تنگ آ کر ایسٹ انڈیا کمپنی سے الحاق کا معاہدہ کر لیا تھا جس کے معنی تھے کہ اب ریاست انگریز سرکار کے حوالے ہے مگر موجودہ نوابین اور ان کی اولاد حکومت کرتی رہے گی۔ تمام اندرونی انتظام ان کے

ذمے ہوگا مگر بیرونی حملہ آوروں سے نمٹنا انگریز سرکار کا کام ہوگا۔ اس معاہدے کو دوستی کا معاہدہ کہا جاتا تھا۔ اس معاہدے کے بعد ریاست میں امن قائم ہوگیا چنانچہ علمی سرگرمیوں کو بھی جلا ملنے لگی۔ نواب نذر محمد کے بعد نواب قدسیہ بیگم نے تعلیمی شعبے پر خصوصی توجہ دی مگر ان کی بیٹی نواب سکندر بیگم کے دور میں تعلیم کے شعبے کو باقاعدہ سرکاری سرپرستی حاصل ہوگئی تھی۔ جس کے تحت سب سے پہلے ریاست کے ایک شہر سیہور میں ایک پہلے سے قائم مدرسے کو امداد دے کر اس کی عمارت تعمیر کرائی گئی جس سے وہاں بچوں کی تعلیم کا سلسلہ پہلے سے زیادہ وسیع ہوگیا۔ اس وقت ہندوستان میں جدید تعلیم یعنی انگریزی کا رواج نہیں تھا بلکہ اسے فرنگیوں کی زبان ہونے کے ناطے نفرت سے دیکھا جاتا تھا مگر ریاست میں اُردو ہندی کے ساتھ ساتھ انگریزی کو بھی فروغ دیا گیا۔ آپ نے ریاست کے ہر پرگنے میں مدرسے جاری کئے۔ وہاں تجربے کار مدرس مقرر کئے۔ بیگم صاحبہ ان مدرسوں کی کارکردگی کی رپورٹ خود ملاحظہ کرتی تھیں۔ ان مدارس میں سال میں دو مرتبہ امتحان لیا جاتا تھا۔ مدرسے کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد طلبا کا آخری امتحان لیا جاتا تھا جو کتابیں طلبا ختم کر لیتے تھے ان کی فہرست بنائی جاتی تھی اور اس فہرست پر مہتمم مدرسہ کے دستخط کے بعد سرکاری مہر کے ساتھ سٹرفکیٹ جاری کیا جاتا تھا جس کے ساتھ کتابوں کی فہرست منسلک ہوتی تھی۔ طلباء کی حاضری کے لئے باقاعدہ رجسٹر رکھا جاتا تھا جو نواب سکندر بیگم خود ملاحظہ کرتی تھیں۔ جس میں طلباء کی حاضری غیر حاضری درج ہوتی تھی۔ کلاسوں میں مانیٹر مقرر کئے جاتے تھے ہر مانیٹر کو تنخواہ دی جاتی تھی لڑکے کو تین روپے اور لڑکی کو دو روپے دیئے جاتے تھے۔ امتحان کے لئے ممتحن خود سکندر بیگم مقرر کرتی تھیں۔ مدارس میں وہی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں جن کے پڑھنے سے ریاست کے دفاتر میں کام کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی تھی۔ 1907ء میں مدرسہ سلیمانیہ کا پنجاب یونیورسٹی سے باقاعدہ الحاق عمل میں آیا تھا اور

وہاں کا تعلیمی نصاب مدرسے میں لازمی قرار دیا گیا تھا۔ ریاست میں دوسرا مدرسہ وکٹوریہ کے نام سے قائم کیا گیا تھا۔ یہ غریب لاوارث اور یتیم بچوں کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ اس مدرسہ میں ابتداء میں ہی کافی بچوں کی تعداد تھی جو 180 تھی اس کی مہتمم ایک زیب النساء نام کی خاتون تھیں یہاں ایک اینگلو انڈین ٹیچر بھی مقرر کی گئی تھیں۔ بورڈنگ ہاؤس بھی تھا۔ تعلیم کے ساتھ طالبات کو دستکاری میں ننٹنگ، کروشیہ، دوشالہ بافی ، کارپٹ اور جوتا بنانا ساتھ ہی کپڑا بننا سکھایا جاتا تھا۔ اس اسکول کی بنائی دستکاریوں کی نمائش منعقد کرنے کے علاوہ انہیں انگلینڈ بھیجا جاتا تھا جہاں انہیں بہت پسند کیا جاتا تھا چنانچہ ہاتھوں ہاتھ بک جاتی تھیں۔

سکندر بیگم نے ایک اور اسکول بلقیسیہ کے نام سے قائم کیا تھا۔ اس اسکول میں بھی پڑھائی کے علاوہ طالب علموں کو دستکاریوں کے ساتھ انہیں مربہ چٹنی اور اچار بنانا سکھایا جاتا تھا۔ خالص لڑکوں کے لئے ایک عربی مدرسہ، ایک صاحب ثروت شخص جمال الدین خاں نے اپنے خرچ سے تعمیر کرایا تھا ان کے انتقال کے بعد شاہ جہاں بیگم نے اسے اپنی زیر نگرانی لے لیا تھا اور اسے پرنس آف ویلز اسکول کا نام دیا گیا تھا۔ یہاں غریب طلباء کے لئے رہائش، لباس اور خوراک کا بھی انتظام کیا گیا تھا۔

نواب سکندر بیگم کے بعد ان کی بیٹی شاہجہاں بیگم نے بھی اپنے عہد میں تعلیم کو فروغ دینے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا تھا۔ ان کے دور میں نہ صرف علم بلکہ ادب کا بھی چرچا عام تھا اس وقت کے بھوپال کو بغداد الہند کہا گیا ہے۔ پوری ریاست میں تعلیمی ادارے قائم تھے۔ ریاست میں قائم تعلیمی اداروں کے معیار سے متاثر ہو کر ریاست کے باہر کے لوگ بھی اپنے بچوں کو بھوپال کے اسکولوں میں داخل کراتے تھے۔ اسی دور میں مدرسہ جہانگیری اور مدرسہ صدیقی قائم ہوئے دونوں معیاری تعلیمی ادارے تھے یہاں ہر مضمون کے الگ الگ استاد تھے۔ ان اسکولوں میں ملازمت کے لئے تعلیمی

سند کو لازمی قرار دیا گیا تھا۔ شاہ جہاں بیگم نے 1892ء میں دایہ گیری کی تعلیم کے لئے بھی ایک ادارہ قائم کیا تھا یہ لینڈون اسپتال میں قائم تھا۔ یہاں دایہ گیری کی تعلیم دی جاتی تھی ریاست میں بغیر دایہ گیری سٹوفکیٹ کوئی دائی کام نہیں کر سکتی تھی۔ بعد میں بھوپال میں ایک نرسنگ اسکول بھی قائم کیا گیا تھا جس میں طالبات کو نرسنگ کی تعلیم دی جاتی اور انہیں حسب لیاقت وظائف دیئے جاتے تھے۔

شاہجہاں بیگم کے بعد ان کی بیٹی سلطان جہاں بیگم نے بھی ریاست میں تعلیم کے فروغ کے لئے دن رات ایک کر دیئے تھے۔ آپ نے ایک تقریب میں کہا تھا کہ بھوپال کی رعایا تعلیم کے حصول کے بغیر ترقی نہیں کر سکتی۔ غیر تعلیم یافتہ شخص اپنی دینی اور دنیوی دونوں فرائض سے غافل رہتا ہے۔ آپ نے ریاست میں کئی نئے مدرسے کھولے۔ آپ کے دور میں لڑکیوں کے لیے سب سے عظیم قائم ہونے والی درس گاہ مدرسہ سلطانیہ تھی۔ یہ ابتداء میں سات کلاس تک تھی۔ مضامین میں اردو، حساب، جغرافیہ، دینیات اور امور خانہ داری شامل تھے۔ یہاں بہت تجربہ کار ٹیچر مقرر کی گئی تھیں۔ 1911ء میں لیڈی اڈوائر نے اس مدرسے کے معائنہ کے بعد لکھا تھا "اس مدرسے سے نواب سلطان جہاں کی گہری دلچسپی ظاہر ہوتی ہے۔ یہ ریاست کے لئے قابل ترین تعلیم یافتہ اور تمیز دار بیویاں تیار کرنے میں مفید ثابت ہوگا۔ پورے ہندوستان میں لڑکیوں کے اسکول میں اس مدرسے کی مثال نہیں ملتی۔" سلطانیہ اسکول مڈل تک تھا۔ اس کا الہ آباد یونیورسٹی سے الحاق تھا۔ اس اسکول میں بعد میں تعلیمی ٹریننگ کی ایک شاخ کھول دی گئی تھی۔ محمودہ بیگم لڑکیوں میں پہلی طالبہ تھیں جنہوں نے یہاں مڈل تک تعلیم مکمل کی تھی۔

آپ نے اس دور میں امراء اور رؤسا کے بچوں کو تعلیم سے آشنا کرنے کے لئے الیکزینڈرا اسکول قائم کیا۔ اس اسکول میں خود اپنے بیٹے کو داخل کرایا۔ نواب

حمیداللہ خاں سلطان جہاں بیگم کے چھوٹے صاحب زادے تھے انہیں اس اسکول میں داخل کرانے کا مقصد ریاست کے امراء و رؤسا کے بچوں کو تعلیم کے حصول کی ترغیب دینا تھا۔ اس اسکول کی شاندار عمارت تعمیر کرائی گئی تھی اس کے پہلے پرنسپل مسٹر سی ایچ پین تھے جو ایم اے تک تعلیم یافتہ تھے۔ اس اسکول کا بھی الہ آباد یونیورسٹی سے الحاق کرایا گیا تھا۔ اس اسکول میں میٹرک کے درجے تک تعلیم دی جاتی تھی۔ حمیداللہ خاں کے اس اسکول میں داخل ہونے، ایک معمولی طالب علم کی طرح تعلیم پانے اور طلباء کے ساتھ کھیلوں میں شریک ہونے سے خواص و عام میں یکسانیت کا جذبہ پیدا ہوا ساتھ ہی تعلیم سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ آپ نے 1904ء میں ایک فوجی رائڈنگ اسکول بھی قائم کیا جہاں نوجوانوں کو فوجی بنانے کی تربیت دی جاتی تھی۔

1918ء تک آپ نے پورے بھوپال میں اسکول اور مدارس کا جال بچھا دیا تھا۔ آپ نے جبریہ تعلیم کا قانون پاس کرا کے اس دور میں جہالت کے خلاف ایک عظیم جہاد کا آغاز کیا تھا۔ آپ کے صاحبزادے عبیداللہ خاں نے ایک تعلیمی ٹرسٹ قائم کیا جہاں طالب علموں کو اسکالرشپ دی جاتی تھی۔ غریب اور ذہین طلباء کو اسکالرشپ دے کر ولائت اعلیٰ تعلیم کے لئے بھیجا جاتا تھا۔ 1932ء میں حمیداللہ خاں نے ایک ماڈل ہائی اسکول قائم کیا جہاں مذہبی تعلیم کے علاوہ ریاضی، جغرافیہ اور تاریخ کے مضامین پڑھائے جاتے تھے۔ 1942ء میں حمیدیہ آرٹس اینڈ کامرس انٹر کالج قائم ہوا۔ جہاں سائنس کے مضامین کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس کالج میں ریسرچ کا کام بھی زور و شور سے جاری تھا۔ یہ کالج انضمام کے بعد بھی اپنا کام خیر و خوبی سے کر رہا ہے۔ ذیل میں ہم بھوپال کی دو قدیم درس گاہوں کا تفصیل سے ذکر کر رہے ہیں جن کی بدولت پوری ریاست علم کا گہوارہ بن گئی تھی۔

مدرسہ سلیمانیہ:

یہ تاریخ ساز مدرسہ نواب سکندر جہاں بیگم کے عہد میں 1853ء میں قائم ہوا اس مدرسے میں پہلی دفعہ فارسی اور اردو کے ساتھ انگریزی تعلیم کی ابتداء ہوئی اس مدرسے میں ہندی زبان میں بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ بعد میں یہاں سنسکرت کی تعلیم بھی دی جانے لگی۔ 1868ء میں شاہجہاں بیگم کے دور میں اس مدرسے کو مزید عروج حاصل ہوا اور اسے مشرقی دارالعلوم بنا دیا گیا۔ اس وقت اس کا الحاق اُس وقت کی برصغیر کی واحد یونیورسٹی ''کلکتہ یونیورسٹی'' سے کرایا گیا۔ یہاں سے فارسی عربی کی اعلیٰ اسناد منشی فاضل اور مولوی فاضل تک حاصل کر کے طلباء صحیح معنی میں علوم شرقیہ سے فارغ التحصیل ہونے لگے۔ اس طرح ان طلباء کی خدمات سے ریاست کو فائدہ پہنچنے لگا۔ ایک ایسا وقت بھی آیا جب ریاست کا ہر تعلیم یافتہ شخص مدرسہ سلیمانیہ کا فارغ التحصیل ہوتا تھا۔ خواہ وہ سرکاری ملازم ہو یا کسی اور شعبۂ زندگی سے تعلق رکھتا ہو۔ بھوپال کے مشہور انقلابی اور مجاہد آزادی مولوی برکت اللہ بھوپالی بھی مدرسہ سلیمانیہ سے فارغ التحصیل تھے۔ یہ وہ شخصیات تھیں جنھوں نے انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے میں اہم کردار ادا کیا ساتھ ہی ریاست بھوپال کی ترقی میں بھی مدد و معاون رہے۔ ان حضرات کے علاوہ اس عظیم مدرسے سے تعلیم حاصل کرنے والی دیگر نامور شخصیات کے نام اس طرح ہیں۔ مولانا ذوالفقار احمد نقوی، نواب یامین محمد خاں، سید نورالحسن خاں، سید علی خاں فرزند نواب صدیق حسن خاں، سراج میر خاں سحر اور مفتی محمد رسول۔ 1870ء تک بھوپال میں مدرسہ سلیمانیہ کے علاوہ ایک اور مدرسہ وقفیہ بھی کافی مشہور تھا اس مدرسے میں صرف دینی تعلیم دی جاتی تھی۔ یہاں دینی تعلیم دینے کے لئے علمائے دین متعین تھے اس کے برعکس مدرسہ سلیمانیہ عصری علوم کی ترویج میں اہم کردار ادا کر رہا تھا۔ یہاں کے

نصاب میں فارسی، اردو، ہندی اور ریاضی مضامین کے علاوہ ڈرائنگ کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ مدرسہ سلیمانیہ کا بعد میں الحاق پنجاب یونیورسٹی سے کرایا گیا تھا۔ اس الحاق کے بعد بھوپال کے طلبہ امتحان دینے کے لئے لاہور جاتے تھے اور وہیں سے رزلٹ کا بھی اعلان ہوتا تھا۔

اس مدرسے کا تعلیمی معیار بہت بلند تھا۔ یہاں قابل استادوں کو متعین کرایا جاتا تھا۔ اس کے مہتمم اور نائب مہتمم خاص طور پر قاضی اور مفتی کے عہدوں پر فائز تھے۔ 1868ء میں ایک نامور عالم دین مولانا محمد ایوب مہتمم ہوئے۔ وہ بعد میں عہدۂ قضا پر بھی فائز کئے گئے تھے۔ 1909ء میں مولوی عنایت اللہ مدرسہ کے مہتمم مقرر ہوئے۔ 1918ء میں مولوی فتح اللہ نے مہتمم کے عہدے پر ترقی پائی۔ 1922ء میں مفتی عبدالہادی خاں مہتمم بنائے گئے۔ پھر 34-1933ء میں مولوی شفیق احمد بی اے بی ٹی مہتمم مقرر ہوئے۔ مدرسہ سلیمانیہ 1926ء تک شفاخانہ یونانی والی عمارت میں قائم رہا۔ اس کے بعد اسے پرانی سبزی منڈی ابراہیم پورہ میں واقع مسجد ترجمہ سے ملحق محل میں منتقل کر دیا گیا۔ 1929ء میں یہ ٹیڑھے اٹوٹ کی عمارت میں منتقل ہوگیا۔ پھر 1935ء میں جہانگیریہ اسکول والی عمارت میں آ گیا۔ وہاں سے اسی سال یہ ہیرا محل فتح گڑھ میں منتقل ہوگیا جہاں وہ 1948ء میں اپنے خاتمے تک قائم رہا۔ اس مدرسے کو انضمام کے بعد متعصب بھارتی بیوروکریسی نے بند کرا دیا تھا۔

مدرسہ عبیدیہ:

یہ مدرسہ سلطان جہاں بیگم نے اپنے بیٹے عبیداللہ خاں کے نام پر قائم کیا تھا۔ یہ حفظ قرآن اور تجوید کا ایک منفرد مدرسہ تھا۔ یہ ایک خوبصورت عمارت میں قائم کیا گیا تھا اس کے کمرے کشادہ اور ہوا دار تھے۔ ریاستی دور میں اس عمارت کا ہر کمرہ قرآن

پاک حفظ کرنے والے بچوں سے بھرا رہتا تھا۔ سلطان جہاں بیگم اس مدرسے کا نہ صرف بہت احترام کرتی تھیں بلکہ اس کا بہت خیال کرتی تھیں۔ اس مدرسے کو اعلیٰ درجے کا فرنیچر مہیا کیا گیا تھا۔ ایسا فرنیچر تو انگریزی اسکولوں میں بھی موجود نہیں تھا۔ بچوں کے بیٹھنے کے لئے 2 فٹ اونچی، 4 فٹ چوڑی اور 10 فٹ لمبی صوفہ نما شیشم کی بینچیں بنائی گئی تھیں۔ جن میں کھلنے اور بند ہونے والی رحلیں فٹ تھیں جن پر بچے قرآن پاک پڑھتے تھے تو راہ چلتے لوگ بھی بچوں کی خوش الحانی سن کر جھومنے لگتے تھے۔ اس مدرسے میں ناظرہ کے علاوہ حفظ کے 6 درجے تھے چھٹی کلاس تک بچے پورا قرآن پاک حفظ کر لیتے تھے اور تجوید کے ساتھ قرأت کی مشق سے بھی فارغ ہو جاتے تھے۔ یہاں مارچ کے مہینے میں باقاعدہ امتحانات منعقد ہوتے تھے۔ کامیاب طلبہ کو حفظ قرآن اور تجوید کی سند دی جاتی تھی جس پر مدرسہ عبیدیہ کے صدر مدرس اور جامعہ احمدیہ کے مہتمم کے دستخط ہوتے تھے۔ اس مدرسے نے ہزاروں حفاظ اور دینی علوم کے ماہر پیدا کئے مگر افسوس کہ ریاست کے بھارت میں انضمام کے بعد اسے بند کر دیا گیا۔

☆☆☆

بھوپال کی لائبریریاں

ریاست بھوپال علم و ادب کے اعتبار سے منفرد حیثیت کی حامل تھی۔ یہاں ہر طرف علم و ادب کے چرچے تھے۔ ادیبوں شاعروں اور دانشوروں کی کمی نہ تھی۔ شعرا اپنے دیوانوں کو مرتب کرنے میں مشغول رہتے تو ادیب افسانے ڈرامے اور انشائیہ وغیرہ تحریر کرکے انہیں کتابی شکل دینے میں منہمک رہتے۔ کتابوں کی طباعت کے لئے سہولتیں میسر ہونے کی وجہ سے کتابیں بازاروں میں باآسانی دستیاب تھیں کتابوں کو جمع کرنے کا شوق رکھنے والے اپنے گھروں میں کتابوں کا ذخیرہ کرتے تو خود بھی انہیں پڑھتے اور اپنے دوست رشتے داروں کو بھی پڑھواتے۔ اس شوق نے بالآخر گھریلو لائبریریوں کی شکل اختیار کرلی۔ ہر پڑھے لکھے اور ذی شعور بھوپالی کے گھر میں لائبریری ضرور ہوتی اور وہ اس میں نئی نئی کتابوں کا اضافہ کرکے اس کی استعداد بڑھاتا رہتا۔ وہ اچھے ادیبوں اور شاعروں، نقادوں اور محققین کی کتابیں اپنی ذاتی لائبریریوں میں رکھنے پر فخر کرتے تھے تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ بھوپال کی سب سے قدیم ذاتی لائبریری میاں فوج دار محمد خاں کی تھی اس کتب خانے میں مرزا غالب نے خود اپنا مکمل اور اصلاح شدہ دیوان بھجوایا تھا۔ فوجدار محمد خاں کی غالب سے بذریعہ خط یاد اللہ ہوتی رہتی تھی۔ فوج دار محمد خاں کے بیٹے یار محمد خاں کو غالب کا شاگرد ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔ ذاتی کتب خانوں میں محمد عمران زبیری کا کتب خانہ بھی نایاب کتابوں سے مرصع تھا۔

یہ اگرچہ ایک ذاتی کتب خانہ تھا مگر اس سے کئی افراد خوب خوب فیض یاب ہوئے۔ مولوی ذوالفقار احمد، حکیم عمرالحسن، مولوی عبدالخالق نقوی، مفتی محمد رسول صدیقی

اور اختر قدوائی کے کتب خانے بھی تشنگان علم و ادب کے لئے بے مثال تھے ان میں دیگر علوم کی کتابوں کے علاوہ دینی معلومات سے متعلق کتابیں بھی دست یاب تھیں۔ یہاں نایاب کتابوں کی بھی کمی نہ تھی۔ بعض بھوپالی حضرات کے شوق کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے پوری زندگیاں اردو ادب کی کتابوں کا ذخیرہ کرنے میں صرف کر دیں اور اس سلسلے میں مالی مشکلات کو حل کرنے کے لئے اپنی جائیدادیں تک فروخت کر دیں۔ جناب ایم عرفان اس کی واضح مثال ہیں۔ آپ کا کتب خانہ بھوپال شہر کا قابل فخر کتب خانہ تھا۔ ان کے کتب خانے میں اردو زبان و ادب کے ہر موضوع اور ہر مصنف سے متعلق کتابیں موجود تھیں۔ ان کے ہاں ڈرامہ پر نایاب کتابیں بھی دستیاب تھیں۔ پروفیسر آفاق احمد کے کتب خانے میں بھی نادر کتابیں موجود ہیں ان کتابوں میں سے بیشتر کو ان کے مصنفین نے انہیں تحفتاً پیش کی ہیں۔ ان کتابوں پر مصنفین اور شعراء کے اپنے دستخط موجود ہیں۔ سید محمد حامد صاحب کی ذاتی لائبریری میں اردو انگریزی اور عربی زبان کی ماخذ کتابیں موجود ہیں۔ ان کتابوں میں نواب صدیق حسن خاں کی کتابیں بھی موجود ہیں۔ یہ کتابیں اس وقت نایاب ہیں مگر خستہ حالت میں ہیں۔ کتابوں کی تعداد کے حساب سے ان کا کتب خانہ پورے بھوپال میں سب سے بڑا ہے۔ یہاں کتابوں کو ان کے موضوعات کے اعتبار سے یکجا کر کے رکھا گیا ہے۔

مرحوم سہیل صدیقی کو کتابوں کے جمع کرنے کا بہت شوق تھا ان کے پاس دیگر کتابوں کے علاوہ مولانا ابوالکلام آزاد کی تمام کتابیں موجود ہیں ان کے ہاں مولانا کے ''الہلال'' اور ''البلاغ'' کی اہم فائلیں بھی موجود ہیں۔ محمد خالد عابدی صاحب کا کتب خانہ بھی بھوپال میں کافی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کتب خانے میں نادر کتابوں کے علاوہ پرانے اخبارات اور رسائل کے تراشے بھی موجود ہیں۔ البتہ ان کے ہاں کتابوں کو سلیقے سے نہ رکھے جانے کی وجہ سے ان کے ضائع ہونے کا بہت خطرہ ہے لیکن ان کی لائبریری

کی اہمیت مسلم ہے۔ رضا علی عابدی بی بی سی لندن سے اپنے پروگرام ''کتب خانے'' میں ان کے کتب خانے اور اس میں موجود نایاب کتابوں کا ذکر کر چکے ہیں۔

اوپر ہم نے بھوپال کے جن ذاتی کتب خانوں کا ذکر کیا ہے کہ ان سے اب بھی لوگ استفادہ کر رہے ہیں مگر وہ مخصوص ہی لوگ ہیں۔ یہ ذاتی کتب خانے عام لوگوں کی پہنچ سے دور ہیں۔ اس کمی کو دور کرنے کے لئے یکم نومبر 1939ء کو اقبال لائبریری بھوپال میں قائم کی گئی۔ اس کے بانی مرحوم عبداللطیف خاں تھے۔ یہ لائبریری علامہ اقبال کے نام پر اس لئے قائم کی گئی تھی کہ انہیں بھوپال سے بہت دلچسپی تھی۔ وہ چار بار بھوپال تشریف لائے اور یہاں قیام کیا۔ وہ سب سے پہلے 10 مئی 1931ء کو بھوپال آئے پھر 7 مارچ 1935ء کو دوسری بار اور 17 جولائی 1935ء کو تیسری اور چوتھی بار مارچ 1936ء کو تشریف لائے۔ آخری بار یعنی چوتھی دفعہ یہاں تشریف لائے تو ایک ماہ قیام کیا تھا۔ بھوپال میں قیام کے دوران آپ نے کئی نظمیں کہیں انہیں ضرب کلیم میں بھوپال کے حوالے سے شائع کیا گیا ہے۔ ضرب کلیم کا انتساب نواب حمید اللہ خاں کے نام پر ہے۔

بھوپال میں چار بیت

چار بیت برصغیر کے کئی علاقوں میں بہت مقبول صنف سخن ہے مگر یہ ایک رجزیہ صنف ہے جو اصل میں دورِ جاہلیت میں جنگ میں کامیابی کی صورت میں جشن منانے کے لئے دف کی تال پر گائی جاتی تھی مگر بعد میں اس کا رواج عام ہوگیا اور یہ صنف کبھی فرصت کے اوقات کو خوش گوار بنانے کے لئے تو کبھی شادی بیاہ کے موقع پر کبھی دوستوں، رشتہ داروں، محبوب کی یاد میں اور کبھی وطن کی یاد یا جوانی کے دور کو یاد کرنے کے لئے گائی جانے لگی۔ یہ تہواروں اور کسی بڑی کامیابی کے موقع پر بھی گائی جاتی ہے۔ اس صنف کے لکھنے والے کئی نامور شعراء گزرے ہیں۔ بھوپال میں چار بیت یوپی سے آئی، بھوپال میں عبدالکریم نامی ایک شخص رام پور سے آئے اور یہیں مستقل رہائش پذیر ہوگئے۔ وہ چار بیت کے استاد تھے۔ انہوں نے بھوپال میں اپنی ملازمت کے دوران عوام میں اسے مقبول بنایا۔ انہوں نے بھوپال کے گلی محلوں میں چار بیت کے پروگرام منعقد کئے جو بھوپال کے عوام اور خواص دونوں کو پسند آئے جس سے کئی لوگوں کو چار بیت سیکھنے کا شوق ہوا اس میں بھوپال کی فوج کے جوان پیش پیش تھے۔ عبدالکریم نے ان کی اور دوسرے شوقین لوگوں کی تربیت کی۔ انہوں نے بہت سے لوگوں کو اپنا شاگرد بنایا۔ وقت کے ساتھ بھوپال میں کئی چار بیت پارٹیاں وجود میں آگئیں۔ یہ لوگ شہر میں پروگرام منعقد کر کے عوام کو تفریح مہیا کرنے لگے۔ پرانے بھوپال میں چار بیت گانے والے اساتذہ اور خلفاء میں سے چند کے نام جناب مسعود ہاشمی نے اپنے ایک مضمون میں یوں لکھے ہیں:

''ہلال خان استاد، بلال خان استاد، مارتول خان استاد، نصراللہ خان استاد، امان اللہ خان استاد، بانکے استاد، میاں جان استاد وغیرہ۔''

بھوپال کے تمام نوابین نے چار بیت کی بہت ہمت افزائی کی تھی۔ نواب حمیداللہ خاں کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اس فن کی باقاعدہ سرپرستی کرتے تھے۔ آپ کی سال گرہ کے موقع پر برصغیر کے دور دراز علاقوں سے چار بیت پارٹیاں بھوپال آتی تھیں۔ یہ تقریب چار چار دن تک چلتی رہتی تھی۔ چار بیت کو ہندی اُردو فارسی پشتو وغیرہ تمام زبانوں میں گایا جاتا ہے۔ بھوپال میں چار بیت کی پارٹیوں میں مقابلے بھی منعقد ہوتے تو کبھی کبھی دونوں پارٹیوں میں ایسی بازی ٹھن جاتی تھی کہ وہ ایک دوسرے پر شعروں میں گالم گلوچ تک کرنے لگتے تھے۔ بھوپال کے لوگ چار بیت کے بہت شوقین تھے لیکن جب سنیما کا برصغیر میں رواج ہوا تو پھر نہ صرف بھوپال سے بلکہ پورے برصغیر میں یہ فن معدوم ہو کر رہ گیا۔ مسعود ہاشمی نے ہی بھوپال میں چار بیت کے استادوں اور گانے والوں میں سے کچھ کے نام اس طرح لکھے ہیں:

حافظ رام پوری، سید رمضان علی استاد، سید احسان علی استاد، کلو خاں استاد، کرامت خاں، نور خاں پٹھان، چندہ خاں، چنا خاں، احمد کریم جمن استاد، سلیمان خاں استاد، سعید بھوپالی، جعفر خاں، حنیف خاں، منو خاں، راجہ میاں، عزیز خاں، رحمان اللہ خاں اور اصغر علی۔

بھوپال کے چار بیت کے شعراء:

ذکی وارثی، قیصر بھوپالی، سراج میر خاں، سحر بھوپالی، سنہا مجددی طرزی بھوپالی، ذکری بھوپالی، فکری بھوپالی، مولوی شکراللہ، ہاتف بھوپالی، بابو شجاعت بھوپالی، محمد منشی بھوپالی، حامد سعید خاں بھوپالی، سید رمضان علی بھوپالی، سیف بھوپالی اور صفدر حسین

طالب بھوپالی۔

بھوپال میں موجودہ چار بیت گانے والوں کے نام:

عبدالحمید خاں لڈن، حاجی عبدالحمید خاں، خلیفہ عبدالحکیم، محمد انور رئیس خاں جمیل شفائی منے دلشاد، غفران احمد کماں خاں، بھگوان داس، لال میاں، ولی اللہ، عبدالواجد، عبداللطیف خاں، ننھے خاں استاد، نوشہ خاں استاد اور مختار خاں۔

بھوپال کی موجودہ چار بیت پارٹیوں کے نام:

بزم ذکی چار بیت، بزم حمید، فروغ چار بیت، راگ پٹھان، بزم یاراں، یلغار پارٹی اور بزم جحن وغیرہ۔

بھوپال کی نامور شخصیات

بھوپال ایک مردم خیز سرزمین ہے یہاں کئی نامور ہستیوں نے جنم لیا۔ ان ہستیوں میں یہاں کے نوابین مرد اور خواتین بھی شامل ہیں۔ اس ریاست کے بانی دوست محمد خاں سے لے کر نواب سلطان جہاں بیگم اور ان کے بیٹے حمید اللہ خاں کا نام بھی یہاں کی نامور ہستیوں میں شامل کیا جاسکتا ہے مگر ہم شاہی خاندان سے ہٹ کر ان حضرات کے حالات زندگی اور ان کے کارناموں سے عوام الناس کو روشناس کرانا چاہتے ہیں جنہوں نے اپنی محنت، ہمت اور جہد مسلسل سے اپنا نام خود پیدا کیا اور عوامی خدمات کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا کر نیز باکمال کارنامے انجام دے کر خود کو اَن مٹ بنا لیا۔ ان ہستیوں میں ہم سب سے پہلے محسن پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خاں کا ذکر کر رہے ہیں کہ جنہوں نے جذبہ حب الوطنی سے سرشار ہو کر اپنی محنت و کاوش سے پاکستان کی بقاء اور سلامتی کو ہمیشہ کے لئے محفوظ و مامون بنا دیا۔

ڈاکٹر عبدالقدیر خاں:

ایمان داری اور دل کی گہرائیوں سے عملی طور پر اگر کسی نے پاکستان اور پاکستانیوں کی خدمت کی ہے تو وہ صرف تین ہی افراد ہیں اول قائداعظم محمد علی جناح، دوسرا نام شہید لیاقت علی خان اور تیسرا نام ڈاکٹر عبدالقدیر خاں کا ہے۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خاں اگر علامہ اقبال کے حقیقی شاہین ہیں تو قائداعظم کے سچے مرد مجاہد ہیں کہ جنہوں نے پاکستان کی سرحدوں کو قیامت تک کے لئے ناقابل تسخیر بنا دیا ہے۔ آپ یکم اپریل 1936ء کو بھوپال میں پیدا ہوئے، وہیں سے میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ 1952ء

میں پاکستان آگئے۔ 1960ء میں کراچی یونیورسٹی سے بی ایس سی کیا۔ 1972ء میں بیلجیئم کی لیوون یونیورسٹی سے انجینئرنگ میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ آپ نے یورپ میں رہتے ہوئے وہاں مختلف لیبارٹریز میں یورینیم انرچمنٹ پروجیکٹس میں کام کیا۔ یہ تجربہ حاصل کر کے ان کے دل میں پاکستان کو دشمنوں سے محفوظ بنانے کے لئے ایٹم بم بنانے کا خیال ستانے لگا اور پھر ایک دن وہ آیا جب آپ یورپ کی ساری آسائشوں کو چھوڑ کر وطن عزیز واپس آگئے اور یہاں ایٹم بم بنانے کے کام کا آغاز کیا۔ شہید ذوالفقار علی بھٹو پہلے ہی قوم کو بتا چکے تھے کہ وہ ملک کو دشمنوں سے محفوظ بنانے کے لئے ہر قیمت پر ایٹم بم بنا کر رہیں گے خواہ اس کے لئے گھاس ہی کیوں نہ کھانا پڑے۔ انہوں نے بطل جلیل عبدالقدیر خاں کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور پھر ایٹم بم کی تیاری کا کام شروع ہو گیا۔ بس اسی ایٹم بم بنانے کی پاداش میں مغربی ممالک نے ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی کے پھندے تک پہنچا دیا تھا مگر کام کا آغاز تو ہو چکا تھا ڈاکٹر عبدالقدیر خاں نے تیزی دکھائی اور اپنی ٹیم کے ساتھ مل کر چند ہی سال میں ایٹم بم تیار کرنے کا کارنامہ انجام دے دیا۔ مغربی ممالک نے آپ کی اس کاوش پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے آپ کو بھی ذوالفقار علی بھٹو کی طرح گھیرنے کی کوشش کی۔ آپ پر مختلف قسم کے سنگین الزامات لگائے گئے اور آپ کے تیار کردہ ایٹم بم کو ''اسلامی بم'' کا نام دے دیا گیا۔ پوری پاکستانی قوم آپ کی احسان مند تھی وہ آپ کے ساتھ کھڑی تھی چنانچہ مغربی ممالک لاکھ کوشش کے باوجود بھی آپ کا بال بیکا نہ کر سکے۔ آج آپ کو صرف پاکستان میں نہیں بلکہ پورے عالم اسلام میں بے حد عزت و تکریم دی جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ نے پورے عالم اسلام کو دشمنوں کے نرغے سے بچا لیا ہے۔ خاص طور پر پاکستان میں آپ کو بے حد قدر و منزلت حاصل ہے کہ جب بھی آپ کسی عوامی اجتماع میں جاتے ہیں لوگ کھڑے ہو کر اور تالیاں بجا کر آپ کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ وہ آپ کو حقیقی نجات

دہندہ سمجھتے ہیں۔ بھوپال کے اگر ایک سپوت نے پاکستان کی بقاء اور سلامتی کو محفوظ بنا دیا ہے تو اسی بھوپال کے شاہی خاندان کے ایک فرد نواب حمید اللہ خاں نے قیام پاکستان کے سلسلے میں گاندھی سے ایک اہم دستاویز پر دستخط کرا کے پاکستان کے قیام کو ممکن بنا دیا تھا۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ریاست بھوپال محسن پاکستان تھی جسے اس بات کی پاداش میں ختم کر کے بھارتی یونین کا حصہ بنا دیا گیا۔ پاکستان کا میزائل پروگرام بھی ڈاکٹر قدیر کی ہی محنت اور کاوش کا نتیجہ ہے۔ آپ نے ملک کے ایٹمی شعبے میں مسلسل ترقی کو جاری رکھنے کے لئے ایک ایسی ٹیم تشکیل دے دی ہے جو اپنا کام جاری رکھتے ہوئے ملک کو نت نئے ایٹمی ہتھیاروں سے مسلسل لیس کر رہی ہے۔

آپ مختلف اداروں کے سرپرست ہیں۔ آپ نے قوم کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کے لئے اب اپنی تمام توانائیاں اس جانب کر دی ہیں۔ آپ کے زیر سایہ کئی تعلیمی ادارے کام کر رہے ہیں۔ آپ نے دینی و سماجی اور علمی خدمات کے ذریعے بھی عوام کے دلوں میں جگہ بنا لی ہے۔ آپ ایک اعلیٰ ادبی و شعری ذوق بھی رکھتے ہیں۔ آپ روزنامہ جنگ میں مسلسل کالم لکھ رہے ہیں۔ ان کالموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کی ادب پر گہری نظر ہے۔ آپ کی خدمات اور شخصیت پر کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ آپ پر اکثر اخبارات اور رسائل میں مضامین اور منظوم خراج عقیدت شائع ہوتے رہتے ہیں۔ آپ اپنی اہلیہ اور دو بیٹوں کے ساتھ اسلام آباد کی ٹھنڈی فضا میں سکونت پذیر ہیں مگر اکثر کراچی آ کر یہاں کی ادبی تقریبات کی رونق بڑھاتے رہتے ہیں۔

مولانا برکت اللہ بھوپالی :

آپ بھوپال میں 17 جولائی 1859ء کو پیدا ہوئے۔ بھوپال کے مشہور مدرسہ سلیمانیہ سے تعلیم حاصل کی۔ 1878ء میں تعلیم سے فارغ ہو کر مدرس کے طور پر

خدمت انجام دینے لگے۔ آپ 1890ء میں انگلستان گئے وہاں آپ کا ذہن سیاست کی جانب مائل ہوگیا چونکہ انگریزوں سے نفرت ان کی گھٹی میں بیٹھی ہوئی تھی چنانچہ انگریزوں کے دیس میں ہی ان کی منافقانہ سیاست کا بھانڈا پھوڑنا شروع کر دیا۔ جلد ہی آپ کی ایک انقلابی حیثیت سے ہر طرف خبر پھیل گئی۔ آپ چونکہ عربی زبان پر اعلیٰ دسترس رکھتے تھے چنانچہ لیور پول کے اورینٹل کالج میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوگئے۔ اس پیشے سے آپ کافی خوش حال ہوگئے مگر اپنی ساری کمائی اپنے آزادی کے مشن کی ترویج پر خرچ کرتے رہے۔ انگلستان میں قیام کے دوران ہی آپ کی برصغیر کے نامور آزادی پسند گوپال کرشن گوکھلے اور دیگر رہنماؤں سے ملاقاتیں ہوئیں جس سے آپ کے جذبہ آزادی میں مزید اضافہ ہوگیا۔ آپ آزادی کے مشن کو آگے بڑھانے کے لئے انگلستان سے 1899ء میں نیویارک پہنچے۔ پھر جاپان تشریف لے گئے وہاں ٹوکیو یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر مقرر ہوگئے۔ 1918ء میں آپ کی سرکردگی میں ہندوستان کی جلا وطن حکومت قائم ہوئی اس کے صدر لالہ ہردیال تھے اور آپ وزیراعظم مقرر ہوئے۔ آپ کا عظیم انقلابی رہنما سید جمال الدین افغانی سے بھی رابطہ تھا۔ آپ کی فکر ہمیشہ اسلام پسندی اور حریت پرستی تک محدود رہی۔ آپ نے بہت کچھ کمایا مگر نہ تو گھر بنایا اور نہ گھر بسایا، اپنی پوری زندگی برصغیر کی آزادی کے لئے وقف کر دی تھی۔ 1924ء میں آپ کی ایک تصنیف کا لندن سے اجراء ہوا تھا۔ اس میں اس وقت کی اسلامی دنیا کو درپیش مختلف مسائل کا ذکر کیا گیا تھا۔ آپ کا 1927ء میں انگلستان میں انتقال ہوگیا۔ آپ کے جسد خاکی کو وہاں امانتاً دفن کر دیا گیا تھا اس شرط کے ساتھ کہ ہندوستان کے آزاد ہونے کے بعد اسے ہندوستان لے جایا جائے گا مگر ایسا نہ ہوسکا۔ آپ پر باب العلم پبلی کیشنز بھوپال نے ایم عرفان کی لکھی کتاب شائع کی تھی۔ آپ پر ایک اور کتاب پروفیسر شفقت رضوی نے تحریر کی ہے۔ اس کا عنوان ''نقیبِ انقلاب

مولانا برکت اللہ بھوپالی'' ہے۔ یہ 2007ء میں شائع ہوئی تھی۔ بھوپال یونیورسٹی کو آپ کے نام پر مولانا برکت اللہ یونیورسٹی کا نام دیا گیا ہے۔

ڈاکٹر شنکر دیال شرما:

بھوپال کی سرزمین پر پیدا ہونے والی ایک اور نامور ہستی ڈاکٹر شنکر دیال شرما کی ہے۔ آپ 19 اگست 1918ء کو بھوپال میں پیدا ہوئے۔ آپ ایک متوسط گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ آپ نے اپنی محنت لگن اور خداداد صلاحیتوں کی بدولت سیاست کے میدان میں نہ صرف اپنے خاندان بلکہ ارض بھوپال کا نام پوری دنیا میں روشن کیا۔ آپ نے ابتدائی تعلیم بھوپال میں حاصل کی۔ آگرہ کے سینٹ جانز کالج، الہ آباد یونیورسٹی اور لکھنؤ یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ برطانیہ جا کر قانون کی ڈگری حاصل کی۔ آپ نے انگریزی لٹریچر میں ماسٹرز کیا۔ 1940ء میں برطانیہ میں قیام کے دوران ہی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا اور ہندوستان کی آزادی کی تحریک کے ہر اول دستے میں شامل ہو گئے۔ انڈین نیشنل کانگریس کے سرگرم کارکن تھے۔ خدمت خلق، ایمان داری اور جہد مسلسل پر یقین رکھنے کی وجہ سے بھارت کی آزادی کے بعد مختلف اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ آپ مدھیہ پردیش کے پہلے وزیر پھر وزیر اعلیٰ رہے اس کے بعد مرکز میں وزیر پھر نائب صدر اور آخر میں بھارت کے صدر مقرر ہوئے۔ آپ نے سیاست کو ذاتی منعفت کے بجائے عوامی مسائل حل کرنے کے لئے استعمال کیا۔ مدھیہ پردیش کے وزیر اعلیٰ ہوتے ہوئے آپ نے اس صوبے کی تعمیر و ترقی میں گہری دلچسپی لی اور عوام کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں پہنچانے کے لئے کئی منصوبے شروع کرائے۔ آپ ایک نہایت قابل اور غیر متعصب انسان تھے۔ آپ اپنے پورے سیاسی کیریئر میں بدعنوانیوں سے دور رہے۔ ایک عام بھوپالی کی طرح سادگی اور ملنساری آپ میں کوٹ

کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ مذہبی تعصب سے کوسوں دور تھے جبکہ کانگریس کے اکثر لیڈر مسلمانوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ مسلمانوں سے ان کی قربت کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے نوابی دور میں آنکھ کھولی تھی۔ وہ ریاست بھوپال کے مسلمان حکمرانوں کی ہندو نوازی اور غیر متعصّبانہ رویے کو دیکھ چکے تھے۔ چنانچہ انہوں نے بھوپالی مسلمانوں کو کبھی غیر نہیں سمجھا اور مدھیہ پردیش کے چیف منسٹر ہوتے ہوئے مسلمانوں اور ہندوؤں میں کوئی تفریق نہیں کی۔ آپ بھارت کے صدر کا منصب سنبھالنے کے بعد بھی بھوپال کو نہیں بھولے اور اپنے آبائی شہر اور شہریوں کی خدمت کے لئے پیش پیش رہے۔ بھوپال میں ہیوی الیکٹرک کا کارخانہ آپ نے ہی لگوایا تھا۔ آپ نے 81 برس کی عمر پائی۔ اپنی عمر کے آخری پانچ سالوں میں سخت بیمار رہے اور 26 دسمبر 1999ء کو انتقال کر گئے۔ بھوپال کے ہندو مسلمان آج بھی آپ کو نہیں بھولے ہیں۔ وہ انہیں اپنا محبوب رہنما قرار دیتے ہیں۔ یہ بات بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ سونیا گاندھی نے آپ کو بھارت کا وزیر اعظم بنانے کی پیشکش کی تھی مگر آپ نے رد کر دی تھی۔

عابدہ سلطان بیگم:

آپ شاہی خاندان کی فرد تھیں۔ نواب حمید اللہ خان کی صاحبزادی اور شہر یار محمد خان کی والدہ تھیں۔ آپ کو بہنوں میں بڑا ہونے کے ناطے ولی عہد ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔ آپ 28 اگست 1913ء کو بھوپال میں پیدا ہوئیں۔ آپ کی ایک بیٹے کی طرح تربیت کی گئی۔ آپ ایک کھلاڑی، شکاری، جری بہادر، فوجی و سیاسی بصیرت کی حامل خاتون تھیں۔ آپ بھوپال ریاست کی گوہر تاج انفنٹری کی کرنل چیف تھیں۔ 1922ء میں آپ کی شادی کوروائی کے نواب محمد سرور علی خان سے ہوئی۔ 1933ء میں آپ کی رخصتی ہوئی۔ 29 مارچ 1934ء کو آپ کے ہاں لائق فائق بیٹے شہر یار محمد

خاں کی ولادت ہوئی۔ آپ ریاست کے بھارت میں ضم ہونے تک ولی عہد کی حیثیت سے عوام کی خدمت کرتی رہیں۔ اسی زمانے میں آزادی کی تحریک چل رہی تھی۔ برصغیر کے تمام قائدین قائداعظم اور گاندھی سمیت آپ کے والد سے ملنے بھوپال آتے رہتے تھے۔ آپ نے سیاست میں دلچسپی لینا شروع کی اور تحریک پاکستان کی حمایتی بن گئیں۔ 1949ء میں ریاست بھوپال کے بھارت میں ضم ہونے کے بعد کانگریس کی مسلم دشمن پالیسی سے اختلاف کر کے قائداعظم کی دعوت پر بذریعہ لندن پاکستان تشریف لے آئیں۔ آپ کی سیاسی سوجھ بوجھ کی وجہ سے آپ کو 1954ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں پاکستان کی نمائندہ بنا کر وہاں بھیجا گیا۔ ایوب خان کے مارشل لاء کے بعد پاکستان میں سیاست دانوں پر پابندیاں لگادی گئیں اکثر کو نااہل قرار دے دیا گیا۔ آپ اس جمہوریت کش اقدام سے متنفر ہو کر سیاست سے دستبردار ہوگئیں اور ملیرسٹی میں واقع اپنے خوبصورت محل میں گوشہ نشین ہوگئیں۔ پھر آپ نے کبھی سیاست میں حصہ نہیں لیا مگر سماجی خدمات انجام دیتی رہیں۔ ملیرسٹی میں آپ کا محل ایک سنسان علاقے میں واقع ہے وہاں اردگرد بلوچوں کی آبادی ہے وہ آپ کی ہمیشہ عزت وتکریم کرتے رہے اور آپ کے محل کی رضاکارانہ طور پر نگہداشت کرتے رہے۔ گو کہ وہ آپس میں ضرور دست گریباں ہوتے تھے مگر شہزادی صاحبہ کو کبھی کوئی گزند نہیں پہنچنے دی۔ پاکستان کے اعلیٰ عہدیدار اور سیاست دان آپ سے ملنے آپ کے محل پر آتے رہتے تھے مگر آپ کبھی کسی کے دروازے پر نہیں گئیں۔ آپ کو اپنے لائق بیٹے شہریار محمد خاں پر بڑا فخر تھا کیوں کہ انہوں نے اپنی ماں کے صائب اصولوں کو اپنی زندگی کا لازمہ بنا لیا تھا وہ اپنی ماں کے ہمیشہ احسان مند رہے کیوں کہ وہ اپنی ماں کے اصولوں کو اپنا کر ہر شعبے میں کامیاب و کامران رہے۔ وزارت خارجہ سے لے کر کرکٹ کے اعلیٰ عہدہ دار رہے اور اب بھی ہیں مگر ان پر کبھی کسی نے کسی قسم کا الزام عائد نہیں کیا۔

شہزادی عابدہ سلطان بے باک اور نڈر خاتون تھیں انہوں نے ریاست بھوپال میں قیام کے دوران شیروں کا شکار بھی کیا تھا۔ مردانہ کھیلوں میں بھی نام پیدا کیا آپ ایک کامیاب پائلٹ بھی تھیں۔ گو کہ آپ ایک لبرل خاتون تھیں مگر اسلامی اقدار و روایات کی دلدادہ تھیں۔ آپ ہمیشہ مردانہ لباس زیب تن کرتی تھیں مگر سر پر ہمیشہ دوپٹہ رہتا جس سے خالص مشرقی خاتون نظر آتیں۔ آپ نے 90 برس کی عمر پائی مگر کبھی کسی بڑی بیماری میں مبتلا نہیں ہوئیں۔ مئی 2001ء میں چند دن علیل رہنے کے بعد 11 مئی 2001ء کو انتقال کر گئیں۔

محمد احمد سبزواری:

ریاست بھوپال نے جن نامور ہستیوں کو جنم دیا ان میں قابل فخر شخصیت جناب محمد احمد سبزواری کی بھی ہے۔ آپ پر بھوپالی جتنا بھی ناز کریں کم ہے۔ آپ نے علوم وفنون میں وہ قابل رشک مقام حاصل کیا جس پر سب ہی آپ پر نازاں ہیں۔ آپ معیشت سے لے کر ہر علمی میدان میں دست رس رکھتے تھے۔ آپ نامور ادیب شہرہ آفاق صحافی، مؤرخ اور ماہر شماریات تھے۔ آپ کا حافظہ کمال کا تھا اس بڑھاپے میں بھی زندگی کے ہر ہر واقعے کو تسلسل سے بیان کرتے تھے۔ آپ 16 جنوری 1913ء کو بھوپال میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد مولوی سید احمد سبزواری میرٹھ سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ اپنی جوانی میں بھوپال تشریف لے آئے تھے۔ آپ کی دو شادیاں ہوئیں۔ محمد احمد سبزواری پہلی بیوی سے پیدا ہوئے۔ آپ کی والدہ آپ کے بچپن میں ہی انتقال کر گئی تھیں۔ آپ کے تین سوتیلے بھائی اور ایک بہن تھی۔ تینوں بھائی اب انتقال کر چکے ہیں البتہ بہن علی گڑھ میں بقید حیات ہیں۔ آپ کے اجداد کا تعلق ایران کے شہر سبزوار سے تھا وہ ہمایوں کے دور میں ہندوستان آئے اور اسے ہی اپنا وطن بنالیا۔

آپ نے ابتدائی تعلیم ایک دینی مدرسے سے حاصل کی، میٹرک کا امتحان الیگزینڈر ہائی اسکول بھوپال اور انٹر اورنگ آباد حیدرآباد دکن سے کیا۔ 1937ء میں جامعہ عثمانیہ سے بی اے اور 1939ء میں ایم اے پاس کیا۔ اس کے بعد ''ریاست حیدرآباد کا نظام زر اور بینکاری'' کے موضوع پر پی ایچ ڈی کرنے کے لئے داخلہ لیا مگر وہ اسے مکمل نہ کر پائے۔ 1940ء میں ملازمت کا آغاز کیا۔ بھوپال میں تین سال تک شماریات کے محکمے میں کام کیا اس زمانے میں آپ نے بھوپال کے گونڈوں پر تحقیق کی اور ان پر ایک ضخیم مقالہ تیار کیا جو 1941ء کی سینسیس رپورٹ میں شائع ہوا۔ پاکستان تشریف لانے کے بعد یہاں محکمہ اعداد وشمار حکومت پاکستان میں چیف اسٹیٹیکل آفیسر کی حیثیت سے دس سال تک خدمات انجام دیں۔ آپ نے معیشت اور بینکاری جیسے مضامین پر بے شمار مضامین اور کئی کتابیں تصنیف کیں۔ آپ کی معیشت پر پہلی تحقیقی تصنیف 1938ء میں ہی منظر عام پر آ گئی تھی۔ 1942ء میں بینکاری پر پہلی اردو میں کتاب ''ہمارے بینک'' کے نام سے شائع ہوئی۔ آپ نے زکوٰۃ، عشر کے موضوعات پر ایک انگریزی زبان میں بھی کتاب تصنیف کی۔ آپ نے ادب اور تاریخ پر بھی کئی کتابیں تصنیف کیں۔ کہتے ہیں آپ نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں ہی لکھنے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ اسکول کے زمانے میں آپ نے ''جنوں کی کہانیاں'' کے عنوان سے مضامین تحریر کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ آپ اپنے اسکول کے میگزین کے ایڈیٹر مقرر ہوئے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ تصنیف وتالیف سے آپ کو اسکول کے زمانے سے ہی گہرا شغف پیدا ہو گیا تھا۔ آپ پختہ تجزیاتی شعور کے مالک تھے۔ آپ کا مطالعہ اتنا وسیع تھا کہ عام لوگوں کے لئے ہی نہیں بلکہ دانشوروں کے لئے بھی قابل رشک تھا۔ آپ نے کئی بین الاقوامی کانفرنسوں میں پاکستان کی نمائندگی کی تھی۔ آپ کو دنیا کے کئی ممالک میں جانے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ آپ نے یورپ، مشرق بعید، امریکہ اور

کیریبین سی میں واقع ہیٹی اور ڈومنیکن ری پبلک جیسے دور دراز ممالک کا دورہ کیا۔ آپ نے حج کی سعادت بھی حاصل کی۔ آپ پابند صوم وصلوٰۃ تھے۔ دینی احکامات پر سختی سے کاربند تھے۔ آپ کا لباس بھوپال کی تہذیب کا آئینہ دار تھا۔ آپ اعلیٰ انسانی خوبیوں کے پیکر، معاملہ فہم اور خوش گفتار تھے۔ مزاج میں بلا کا تحمل اور ہر وقت لوگوں کی خدمت اور ہمدردی کے لئے تیار رہتے تھے۔ ہر علمی مسئلے پر غور وفکر کرنے کے عادی تھے۔ منکسرالمزاجی اور بردباری آپ میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ گوکہ بھوپالی غصے کے لئے مشہور ہیں مگر آپ کو غصہ ہی نہیں آتا تھا۔ یہ بات اگرچہ حیرت انگیز ہے مگر دراصل اس میں آپ کے گھر کی تربیت کا بڑا عمل دخل تھا۔ آپ کو بھوپال والوں کی کراچی میں منعقدہ ہر محفل اور مجلس میں بطور خاص مدعو کیا جاتا تھا۔ آپ کے زرّیں خطابات کو سننے کے لئے محفلوں اور جلسوں میں بھوپالی ہی نہیں غیر بھوپالی بھی جوق در جوق آتے تھے۔ آپ سو سال سے اوپر ہو چکے تھے مگر پھر بھی دل و دماغ جوان تھے۔ حافظہ مضبوط تھا اور سوجھ بوجھ پہلے سے بھی زیادہ ہوگئی تھی۔ آپ کا سایہ بھوپالیوں کے لئے ہی نہیں غیر بھوپالیوں کے لئے بھی باعث رحمت تھا۔ آپ چند دن بیمار رہ کر 14 جولائی 2016ء کو انتقال فرما گئے۔

اسلم شیر خاں :

آپ نے ہاکی کے عالمی کھلاڑی کی حیثیت سے بھوپال کا نام پوری دنیا میں روشن کیا۔ آپ بھارت کی ہاکی ٹیم کے مایہ ناز فل بیک تھے۔ اپنے بہترین کھیل کی وجہ سے ایک کھلاڑی سے ترقی کر کے بھارتی قومی ہاکی ٹیم کے کیپٹن مقرر کئے گئے۔ آپ کے والد احمد شیر خاں بھی ہاکی کے ایک بین الاقوامی کھلاڑی تھے۔ آپ نے 1936ء میں برلن اولمپک میں ہندوستان کی ٹیم کی نمائندگی کی تھی۔ آپ کے دادا بھی ہاکی کے

نامور کھلاڑی رہے ہیں۔ اسلم شیر خاں کو ہاکی کی تربیت خود ان کے والد نے دی اور انہیں ہاکی سے متعلق تمام راز و رموز سے آگاہ کیا۔ آپ کی تربیت مین رہ کر ہندوستان کے ایک اور مایہ ناز ہاکی پلییئر روپ سنگھ نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ اسلم شیر خاں 13 برس کی عمر سے ہاکی کھیل رہے تھے۔ آپ نے 1975ء میں کوالالمپور میں عالمی ہاکی چیمپیئن شپ میں بھارتی ٹیم کو کامیابی دلائی تھی۔ ہاکی سے ریٹائر ہونے کے بعد بھارتی جنتا پارٹی میں شامل ہوگئے تھے۔ پارٹی کے اعلیٰ عہدوں پر بھی فائز رہے اور پھر وزیر مقرر ہوئے۔ آپ نے سیاست میں اگرچہ بڑا نام پیدا کیا مگر ہاکی کے کھیل کو بھارت میں پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کرتے رہے۔ آپ کو بھارت کی اولمپک ایسوسی ایشن کا صدر رہنے کا بھی اعزاز حاصل ہے۔

شہریار محمد خاں:

آپ شہزادی عابدہ سلطان کے اکلوتے بااخلاق باوقار اور بااصول فرزند ہیں۔ آپ 29 مارچ 1934ء کو بھوپال میں پیدا ہوئے۔ آپ کی تربیت والدہ نے کی اور اپنی طرح انہیں نڈر اور بے باک مخلص اور انسانوں سے محبت کرنے والا بنا دیا۔ آپ کو ایک شہزادے کے طور پر ریاست کو چلانے کے رموز سکھانے کے علاوہ دہرہ دون کے مشہور زمانہ پرنس آف ویلز انڈین ملٹری کالج میں فوجی ٹریننگ دلائی گئی۔ آپ سقوط بھوپال کے بعد والدہ کے ساتھ پاکستان آ گئے اور سول بیوروکریسی سے منسلک ہو گئے۔ آپ نے پاکستان کے دفتر خارجہ میں کئی اہم عہدوں پر کام کیا۔ آپ سیکریٹری خارجہ سے لے کر مختلف ممالک میں سفیر اور ہائی کمشنر مقرر ہوئے۔ آپ کئی اہم ممالک میں پاکستان کے سفیر تعینات کئے گئے ان ممالک میں بھارت، امریکہ، برطانیہ، چین اور فرانس شامل ہیں۔ یواین او کے سیکریٹری جنرل بطرس غالی کے روانڈا کے لئے نمائندے کی حیثیت

سے بھی خدمات انجام دے چکے ہیں۔ آپ نے عالمی سطح پر مہاجرین کی آبادکاری کے لئے بھی احسن طریقے سے خدمات انجام دیں۔ آپ 2003ء سے 2006ء تک پاکستان کرکٹ بورڈ کے چیئرمین رہے اس وقت کرکٹ بورڈ کی حالت ابتر تھی پاکستانی ٹیم زوال کا شکار تھی آپ نے بڑی محنت سے تمام معاملات کو بہتر کر دیا تھا۔ اب اس وقت بھی آپ پاکستان کرکٹ بورڈ کے چیئرمین کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ آپ نے اپنی انتھک محنت اور خلوص سے دن رات ایک کر کے پاکستانی کرکٹ ٹیم کو ایک کامیاب ٹیم بنا دیا ہے۔ ساتھ ہی بورڈ میں جو پہلے لوٹ کھسوٹ مچی ہوئی تھی اسے روک دیا ہے۔ آپ ایک روشن خیال انسان ہیں مگر خاندانی روایات کے امین ہیں۔ آپ میں سادگی، انکساری اور ملنساری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ آپ اگرچہ شاہی خاندان کے فرد ہیں مگر ایک عام انسان کی طرح نظر ہی نہیں آتے بلکہ اپنے نرم رویے اور محبت آمیز انداز سے ایک مکمل انسان کی تصویر پیش کرتے ہیں۔

عبدالحسیب خاں:

کچھ لوگ کچھ کرنے کے لئے ہی اللہ تعالیٰ کی جانب سے دنیا میں بھیجے جاتے ہیں۔ عبدالحسیب خاں بھی ایسے ہی لوگوں میں سے ایک ہیں۔ آپ بھوپال کے نامور فرزند ہیں آپ بھوپال کے ساتھ پاکستان کا نام بھی روشن کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ آپ نے سماجی خدمات کے ذریعے کراچی کے لوگوں کے دل جیت لئے ہیں۔ شہر کے پسماندہ علاقوں میں تعلیمی ادارے قائم کر کے غریبوں کے بچوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کر رہے ہیں۔ خدا کی بستی میں آپ کا قائم کردہ ''بروکس'' اسکول بے مثال تعلیمی خدمات انجام دے رہا ہے۔ اس اسکول میں چھ سو طلبہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور ان سے کوئی فیس نہیں لی جاتی۔ انہیں کتابیں اور یونی فارم بھی مفت فراہم کیا جاتا ہے۔ طلباء

کو دوپہر کا کھانا بھی کھلایا جاتا ہے۔ آپ نے بچوں کی بہتر صحت کے لئے ایک ریکی سینٹر قائم کیا ہے عباسی اسپتال میں ٹراما سینٹر کو فعال بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس ٹراما سینٹر سے اہلیان کراچی خوب مستفید ہو رہے ہیں۔ آپ نے پاکستان کے صنعتی شعبے کی ترقی میں بھی بھرپور کردار ادا کیا ہے۔ 1981ء میں بروکس فارماسیوٹیکل کا ادارہ قائم کیا۔ یہ آپ کی محنت لگن اور خلوص سے اب پاکستان میں دوائیوں کا ایک بڑا ادارہ بن چکا ہے۔ آپ کئی سال پاکستان فارماسیوٹیکل مینوفیکچرنگ ایسوسی ایشن کے صدر رہے۔ کورنگی ایسوسی ایشن آف ٹریڈ اینڈ انڈسٹری (KATI) کے چیئرمین رہے۔ اس وقت حکومت پاکستان کی جانب سے کاٹی (KATI) کے چیف ایگزیکٹو ہیں۔ پاکستان فارماسیوٹیکل ایجوکیشن فاؤنڈیشن کا قیام بھی آپ کا ہی مرہونِ منت ہے۔ آپ اس کے بانی چیئرمین ہیں۔ آپ کے مالی تعاون سے کئی این جی اوز چل رہی ہیں۔ آپ بقائی یونیورسٹی کے فائنانشل ایڈوائزر اور حکیم محمد سعید شہید کی شوریٰ کمیٹی کے ممبر ہیں آپ کو پاک چائنا اور پاک ملیشیا فاؤنڈیشن کے سرپرست اعلیٰ ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ آپ سیاسی میدان میں بھی کامیاب رہے آج کل آپ متحدہ قومی موومنٹ کی جانب سے سینیٹر کی حیثیت سے سینیٹ میں قوم و ملک کی بے مثال خدمت انجام دے رہے ہیں۔ آپ ابتداء سے ہی ساکنانِ شہر قائد عالمی مشاعرہ کمیٹی کے ممبر کے علاوہ ساکنان شہر قائد ٹرسٹ کے رکن ہیں۔ یہ کمیٹی 1989ء سے مسلسل ہر سال شہر میں عالمی مشاعرہ کرا رہی ہے۔ آپ محسن کراچی کے طور پر پورے شہر میں جانے پہچانے جاتے ہیں۔ بھوپال کے لوگ آپ کی بے انتہا عزت و تکریم کرتے ہیں اور آپ کو فخر بھوپال کے نام سے بھی پکارتے ہیں۔

قمر النساء قمر :

آپ 25 دسمبر 1942ء کو بھوپال میں پیدا ہوئیں۔ آپ نے اپنا بچپن بھوپال میں گزارا۔ 1950ء میں والدین کے ہمراہ ہجرت کرکے پاکستان آ گئیں۔ آپ بھوپال کے وکٹوریہ اسکول اور گورنمنٹ اسکول سرونج میں مڈل کلاس تک تعلیم حاصل کر چکی تھیں۔ چنانچہ کراچی میں ہائی اسکول کی تعلیم کا سلسلہ شروع کیا اور گورنمنٹ گرلز اسکول جیکب لائن سے میٹرک کیا۔ اس کے بعد ایڈوانس اردو کی سند حاصل کی اور اورینٹل کالج سے تعلیم مکمل کی۔ بچپن سے ہی سماجی خدمت اور دینی ترویج کو آپ نے اپنی زندگی کا مشن بنا لیا تھا۔ آپ محکمہ سماجی بہبود لانڈھی پروجیکٹ کی جنرل سیکریٹری رہیں۔ اس کے بعد کورنگی سینٹر کی چیئر پرسن رہیں۔ ضیاء الحق کی حکومت میں آپ کو آپ کی سماجی اور دینی خدمات کے اعتراف کے طور پر مجلس شوریٰ کا رکن مقرر کیا گیا۔ اس عہدے پر رہتے ہوئے آپ نے لانڈھی اور کورنگی جیسی بستیوں میں فروغ تعلیم کے لئے جدوجہد کی جس کے نتیجے میں وہاں ایک کامرس کالج اور ایک فنی تعلیم کا ادارہ قائم ہوا۔ آپ نے گلشن اقبال کراچی میں بھی ایک اسکول کی عمارت بنوائی۔ آپ نے غریب اور متوسط خواتین کو روزگار کی فراہمی کے سلسلے میں اپنی تنظیم فلاح خواتین کے تحت دست کاری، کمپیوٹر، میک اپ اور کوکنگ وغیرہ کے کورس شروع کرائے جو آج بھی جاری ہیں۔ آپ کی تنظیم غریب اور نادار لوگوں کی مالی اعانت کرنے میں پیش پیش ہے۔ قدرتی آفات کے وقت آپ کی تنظیم متاثرین کی مدد کرنے کے لئے ہمیشہ سینہ سپر ہو جاتی ہے اور ان کی امداد کے لئے دن رات ایک کر دیتی ہے۔ آپ محفل میلاد وغیرہ میں اپنے پُراثر واعظ سے خواتین میں ایک نیا دینی جوش اور ولولہ پیدا کر دیتی ہیں۔ آپ کی اعلیٰ صفات کی بدولت کراچی کے سب ہی لوگ آپ کی عزت و تکریم کرتے ہیں۔

خوش بخت شجاعت :

بھوپال کے خطے میں عجب تاثیر ہے کہ وہاں کی خواتین ذہانت، متانت شجاعت، دیانت اور قیادت کی خوبیوں سے مالا مال ہیں۔ بھوپال پر سو سال سے زاید چار خواتین نے لگاتار حکومت کر کے حق حکمرانی ادا کر دیا۔ انہیں آج بھی عزت و احترام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان خواتین کے بعد بھی بھوپال میں نامور خواتین جنم لیتی رہی ہیں۔ ان ہی میں ایک خوش بخت شجاعت بھی ہیں۔ یہ بھوپال میں پیدا ہوئیں۔ 1950ء میں والدین کے ہمراہ کراچی آ گئیں اور یہیں تعلیم مکمل کی مگر تعلیم کے دوران ہی ان کے جوہر نکھرنے لگے۔ اسکول سے کالج تک تقریری مقابلوں میں حصہ لیا اور انعامات سے نوازی گئیں۔ پھر ریڈیو پر بھی پروگرام کئے جو سب نے پسند کئے۔ ٹی وی والوں نے ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کے لئے اپنے پروگراموں کے لئے مدعو کر لیا۔ آپ کی میزبانی میں شروع ہونے والا پروگرام ''فروزاں'' آج بھی لوگ نہیں بھولے۔ اس پروگرام کی کامیابی نے آپ کے لئے آگے بڑھنے کے کئی راستے کھول دیئے۔ آپ نے اخباروں میں لکھنا شروع کیا۔ پھر ایک اخبار کی ادارت سنبھال لی۔ ایک ماہ نامے کی بھی ادارت آپ کے ذمے کر دی گئی۔ ادھر ٹی وی پر بھی ''آپ جناب''، ''مینا بازار'' ''چہرے''، ''یونیورسٹی چیلنج'' اور ''خواتین ٹائمز'' جیسے پروگرام پیش کرتی رہیں۔ ایک وقت آیا جب آپ ٹی وی کی ہر فن مولا کمپیئر بن چکی تھیں۔ آپ کی شادی بینکنگ سے وابستہ شجاعت علی بیگ سے ہوگئی۔ یہ شادی بیحد کامیاب رہی آپ کے شوہر آپ کے پہلے سے فین تھے۔ گھر میں بٹھانے کی بجائے خوش بخت کو اپنے کیریئر کو مزید درخشاں بنانے کے لئے ان کی مکمل سپورٹ کرنے لگے۔ سسرال والے بھی آپ پر مہربان تھے چنانچہ آپ نے اپنی کارکردگی سے کئی ایوارڈ حاصل کئے۔ حکومتی ایوارڈ تمغۂ امتیاز سے

بھی آپ کو نوازا گیا۔ آپ کی کراچی کے عوام میں یہ ہر دلعزیزی کا نتیجہ تھا کہ آپ آرٹس کونسل آف پاکستان کراچی کے سالانہ الیکشن میں نائب صدر منتخب ہو گئیں۔ آپ کی ہر دلعزیزی سے متاثر ہو کر ایم کیو ایم کے قائد الطاف حسین نے آپ کو عام انتخابات میں کراچی کے ایک حلقے سے قومی اسمبلی کی سیٹ کے لئے الیکشن لڑایا۔ آپ اس الیکشن میں کامیاب و کامران رہیں۔ آپ پاکستان کی قومی اسمبلی میں پہنچنے والی پہلی بھوپالی خاتون تھیں۔ آج کل آپ ''کڈز یونیورسٹی'' کے نام سے ایک معتبر تعلیمی ادارے کو چلا کر قوم کے بچوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کر رہی ہیں۔

ظہور الحسن بھوپالی:

ظہور الحسن بھوپالی جیسا نڈر بے باک اور ظلم کے خلاف آواز اٹھانے والا کوئی دوسرا بھوپالی ابھی تک سامنے نہیں آیا۔ انہیں پاکستان اور اسلام سے محبت کرنے کی پاداش میں شہید کر دیا گیا مگر ان کا نظریہ زندہ رہا جسے کوئی بھی نہیں مار سکے گا اور نہ ہی شکست دے سکے گا۔ وہ پاکستان کی بقاء اور پاکستانیوں کو ایک عظیم قوم بنانے کے لئے لڑتے رہے اور اس جنگ میں ان گنت ساتھیوں کو اپنے ساتھ ملا کر اپنے پیغام کو گھر گھر پہنچانے میں کامیاب رہے۔ ابھی بھی لوگ ان کے پیغامِ محبت، امن اور خلوص کو نہیں بھولے ہیں اور ان کے رفقاء ان کے ہی نقش قدم پر چلتے ہوئے ان کے مشن کی کامیابی کے لئے طاغوتی طاقتوں سے نبرد آزما ہیں۔ آپ کو یہ فخر حاصل تھا کہ ان کی پیدائش سرزمین بھوپال پر ہوئی ایک سال کے تھے کہ والدہ کی گود میں پاکستان آ گئے۔ یہیں تعلیم و تربیت ہوئی۔

آپ نے اسکول کے زمانے سے ہی تقریری مقابلوں میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ آپ کی ذہانت اور لیاقت آپ کو بہت جلد کامیابیوں کی بلندی پر لے گئی آپ کی شہرت کراچی سے نکل کر پورے پاکستان میں پھیل گئی۔ ایسا کون سا تقریری مباحثہ تھا

جسے آپ نے سر نہ کیا ہو۔ کالج اور کراچی یونیورسٹی کے تقریری مباحثوں میں اپنا لوہا منوا کر بین الکلیاتی مباحثوں میں کامیابی کے جھنڈے گاڑنے لگے۔ ابھی آپ طالب علمی کے دور سے ہی گزر رہے تھے کہ ایک اخبار سے منسلک ہو گئے پھر اپنی ذہانت اور لیاقت کے جوہر اپنی کالم نگاری کے ذریعے دکھانے لگے۔ آپ کے مضامین قومی معاملات پر مبنی ہوتے آپ اپنے کالموں کے ذریعے اسلام اور پاکستان کی خدمت کرنے کے ساتھ ساتھ عوامی مسائل پر بھی قلم اٹھانے لگے۔ عوامی مسائل پر لکھنے کی وجہ سے آپ عوامی توجہ کا مرکز بن گئے۔ عوامی آواز پر لبیک کہتے ہوئے سیاست میں قدم رکھا، بہت کامیاب رہے پھر صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا اور سب سے کم عمر ممبر صوبائی اسمبلی بن گئے۔ آپ نے صوبائی اسمبلی میں بھی اپنی مدلل تقاریر کے ذریعے حزب اقتدار کو عوامی مسائل حل کرنے کی جانب مائل رکھا۔ آپ نے بعض مفاد پرستوں کی جانب سے سندھ میں سندھی اور غیر سندھی کی نفرت انگیز سازش کو لگام دی اور تمام طبقوں اور فرقوں میں اتحاد و یک جہتی کو مضبوط کرنے کی کامیاب مہم چلائی۔ آپ کو اپنے سنہری اصولوں کی پاداش میں پابند سلاسل بھی کیا گیا مگر آپ اپنے زریں اصولوں سے کبھی دست بردار نہیں ہوئے۔ آپ کا سب سے بڑا وصف یہ تھا کہ آپ نے کبھی نفرت کا جواب نفرت سے نہیں دیا بلکہ نفرت کا مقابلہ محبت سے کیا۔ آپ کی طرح آپ کے احباب بھی اسلام اور پاکستان کے سچے شیدائی اور اصولوں پر جان دینے والے ہیں۔ ان احباب میں حاجی حنیف طیب، دوست محمد فیضی، رضوان صدیقی، الحاج شمیم الدین، نوخیز صدیقی اور ضیاء الاسلام زبیری جیسی شخصیات شامل تھیں۔ آپ کے والد مولانا وہاج الدین چشتی ایک اعلیٰ پائے کے عالم دین مصنف اور تحریک پاکستان کے بے باک مجاہد تھے۔ قمر النساء قمر آپ کی پھوپی بھی ایک باحوصلہ سیاست دان اور ادبی و سماجی شخصیت کی حامل ہیں۔ 13 ستمبر 1982ء کی دوپہر آپ کے دفتر میں گھس کر چند عاقبت نااندیش بھٹکے ہوئے

نامعلوم نوجوانوں نے آپ کو قتل کر دیا تھا۔ آپ شہادت کے رتبے پر فائز ہو کر آج ہر دل میں زندہ ہیں اور قیامت تک زندہ رہیں گے اس لئے کہ شہید کبھی مرا نہیں کرتے۔

شگفتہ فرحت:

بھوپال کا ایسا کون سا شخص ہے جو کراچی میں رہتا ہو اور شگفتہ فرحت کو نہ جانتا ہو۔ بھوپالیوں میں ان کی ہر دل عزیزی ایک مثال بن گئی ہے۔ پھر ان کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ ان کا ایک کان اور آنکھ کراچی کے بھوپالیوں پر رہتی ہے تو دوسرا کان اور آنکھ یہاں سے کوسوں میل دور پیارے اور نیارے شہر بھوپال پر رہتی ہے۔ کوئی بھی خبر چاہے اچھی ہو یا بری یعنی کسی بھوپالی کو کوئی ایوارڈ عطا کیا گیا ہو یا اس کی کتاب کی رونمائی ہوئی ہو یا پھر کسی ادیب اور شاعر کے انتقال کی خبر ہو۔ اس سے سب سے پہلے رسائی انہیں ہی حاصل ہوتی ہے اور پھر یہ خبر کراچی میں دور دور تک پھیلے ہوئے بھوپالیوں تک پہنچا دیتی ہیں اور یہی نہیں بلکہ بھوپال میں انتقال کرنے والوں کا تعزیتی جلسہ بھی یہی خاتون اپنی تشکیل دی گئی محبان بھوپال فورم اور بھوپال انٹرنیشنل فورم کے ذریعے آناً فاناً منعقد کر دیتی ہیں۔ جناب مصطفیٰ تاج نے شگفتہ فرحت کے بارے میں کیا خوب لکھا ہے کہ وہ نہ تو شاعرہ ہیں نہ ادیبہ ہیں نہ ہی نقاد نہ صحافی بس کچھ نہیں لیکن پھر بھی سب کچھ ہیں۔ بھوپالی حضرات بڑے بڑے پاکستانی فنکاروں اور کھلاڑیوں سے زیادہ شگفتہ فرحت کو جانتے ہیں کیونکہ وہ کراچی میں بیٹھ کر بھوپال کی نمائندگی جو کرتی ہیں۔ بقول مصطفیٰ تاج کے اگر شگفتہ فرحت کو بھوپال کا اخبار کہا جائے تو غلط نہ ہوگا اور اگر میں انہیں بھوپالیوں کی آواز اور ٹوٹ کر محبت کرنے والی محسنہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا اس خاتون نے نہ صرف بھوپالیوں کو کراچی میں پہچان دلوائی بلکہ انہیں اتحاد و یکجہتی کی کبھی نہ ٹوٹنے والی زنجیر میں جکڑ دیا ہے۔ وہ ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں کی دل دادہ ہیں مگر بھوپال سے تعلق رکھنے والوں پر تو زیادہ ہی مہربان ہیں۔ حقیقتاً انہوں نے اپنی

بے لوث خدمت اور فعال شخصیت کے ذریعے کراچی میں اُردو ادب کی ترویج کے لئے جو دل و جان سے کوششیں کی ہیں، انہیں نہ صرف ہر طبقے میں سراہا جاتا ہے بلکہ ان کی درازیٔ عمر کے لئے دعائیں کی جاتی ہیں۔ آپ نے ریاست بھوپال کی معروف شخصیات پر ''تذکرۂ شخصیات بھوپال'' جیسی ضخیم اور قابل قدر کتاب تصنیف کر کے خود کو ادیبوں کے دائرے میں لا کھڑا کیا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے بموجب یہ کتاب صرف یہی نہیں کہ بھوپال کی سیاسی ادبی تاریخ میں ایک غیر معمولی اضافہ ہے بلکہ یہ ہمارے پاک و ہند کی پوری تاریخ اسلامی کی مستند دستاویز ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر پیرزادہ قاسم آپ کی تصنیف ''تذکرہ شخصیاتِ بھوپال'' کو بھوپالیوں کے لئے ایک نادر تحفہ قرار دیتے ہیں۔ جمیل الدین عالی لکھتے ہیں بھوپال نے ادب و دانش میں بڑے بڑے آدمی پیدا کئے لیکن تاحال ان سب کے نام اور کارنامے کسی ایک بڑی کتاب میں جمع نہیں ہو سکے اب ''تذکرہ شخصیات بھوپال'' نے بڑی حد تک اس کی کمی پوری کر دی ہے۔ شگفتہ فرحت یقیناً ایک بڑی شخصیت کی مالک ہیں مگر ان کے شوہر نامدار جناب اویس ادیب انصاری کی مخلص، ملنسار اور انسان دوست شخصیت سے کراچی کا کون سا شخص واقف نہیں ہے۔ اس جوڑے کی کراچی اور بھوپال والوں پر بڑے احسانات ہیں خدا اس جوڑے کو سدا سلامت رکھے۔

☆☆☆

باب 5

بھوپال میں سیر وتفریح کے مقامات

بھوپال شہر اپنے خوبصورت اور دل فریب پہاڑوں، وادیوں تالابوں اور بہتی گنگناتی ندیوں کی وجہ سے ایک خاص کشش رکھتا ہے۔ اس کا پرفضا ماحول اور قدرتی مناظر ہر ایک کو دعوت نظارہ دیتے نظر آتے ہیں۔ اس ریاست اور شہر کے رہنے والے ماضی میں اور اب بھی ان خوبصورت مناظر جو دل کو توانائی اور دماغ کو تازگی بخشتے ہیں سے لطف اندوز ہونے کے لئے جوق در جوق ان مقامات پر جاتے ہیں۔ یہاں کا ہر موسم شکار اور سیر وتفریح کے لئے سازگار ثابت ہوتا ہے۔ یہاں کے نوابین تو سیر وتفریح اور شکار کے شوقین تھے ہی مگر عوام بھی ان سے کسی طرح پیچھے نہیں تھے۔ ذیل میں ہم بھوپال کے مشہور باغ، سیر وتفریح کے مقامات اور شکار گاہوں کا تفصیل سے ذکر کریں گے۔

باغات:

نوابین بھوپال کو باغات لگانے کا بہت شوق تھا۔ یہاں مغلیہ طرز کے کئی باغات لگائے گئے جن کے لگانے کے لئے دہلی سے مالی بلائے گئے تھے جو چوہدری کہلاتے تھے۔ یہ ایسے فنکار تھے کہ ایک پودے میں دوسرے کا پیوند لگا دیتے تھے۔ وہ باکمال لوگ ایک گلاب کے پودے سے تین رنگ کے پھول پیدا کرتے تھے۔ گل داوٗدی کے ایک پھول میں دو رنگ کے اور ایسا ہی کمال دکھاتے ہوئے آم کے درخت میں دو قسم کے آم پیدا کرتے تھے۔ نوابین کے زمانے میں جو باغ لگائے گئے تھے وہ ان کی فرمانروائی تک تو ضرور قائم ودائم رہے مگر ریاست کے ہندوستان میں انضمام کے بعد کئی باغ اجڑ گئے۔

اس وقت بھوپال میں جو باغ موجود ہیں اور ساتھ ہی کچھ پرانے باغوں کا

بھی یہاں ہم ذکر کریں گے۔

نبی باغ :

یہ دراصل آموں کا باغ تھا اسے ماجی ممولا نے لگایا تھا۔ اس کے لئے پودے یو۔ پی سے لائے گئے تھے۔ یہ باغ ایک زمانے تک قائم رہا مگر اب یہ باقی نہیں ہے۔ اس جگہ اب ایک ریسرچ ادارہ قائم ہے۔

بڑا باغ :

کہتے ہیں یہ باغ نواب وزیر محمد خاں نے 1810ء میں لگوایا تھا۔ یہ باغ تو اب بھی موجود ہے مگر اس جگہ اب شاہی قبرستان واقع ہے۔ اس باغ میں نواب قدسیہ بیگم، نواب نذر محمد خاں، نواب وزیر محمد خاں اور معروف جید عالم دین و مصنف نواب صدیق حسن خاں کے مزارات واقع ہیں۔

نذر باغ :

یہ باغ قدسیہ بیگم نے اپنے شوہر نذر محمد خاں کی یادگار کے طور پر لگوایا تھا۔ یہ پھول دار اور پھل دار درختوں سے آراستہ تھا۔ اس باغ کا رقبہ وسیع تھا۔

عیش باغ :

یہ باغ اپنے حسن اور دل فریبی کے لئے منفرد مقام رکھتا تھا۔ یہاں خوبصورت پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ یہاں کا گلاب پورے برصغیر میں سب سے خوش رنگ اور خوش بو دار تھا۔ اس باغ کے گلابوں کی انگریزوں نے بھی تعریف کی تھی۔ اس وسیع باغ کے چاروں طرف نہر بنائی گئی تھی۔ درمیان میں ایک مستطیل عمارت تھی جس کے نیچے باوڑی اور اوپر بارہ دری تھی۔ اب یہاں خوبصورت عیش باغ اسٹیڈیم ہے۔

فرحت افزا :

اس باغ میں پھل اور پھول والے درختوں کی بہتات تھی۔ یہاں گرمی سے بچنے کے لئے سرد خانے تھے۔ یہاں اب بھی ایک بڑی مسجد اور مدرسہ قائم ہے۔ اس باغ میں نواب سکندر جہاں کا خوب صورت سنگ مرمر کا مقبرہ واقع ہے۔ انضمام کے بعد اس باغ کی حالت خراب ہوگئی اور لاپرواہی کا یہ عالم ہے کہ نواب سکندر جہاں کا مقبرہ بھی توڑ پھوڑ دیا گیا ہے۔

نشاط افزا :

اسے نواب شاہجہاں بیگم نے لگایا تھا۔ یہاں پھل اور پھول دار درختوں کے علاوہ ایک خوب صورت بارہ دری واقع ہے جو اسے دوسرے باغوں سے منفرد کرتی ہے۔ یہاں بھوپال ریاست کے آخری وزیر اعظم پنڈت چتر نرائن مالویہ کی رہائش تھی۔ یہیں پر نواب شاہ جہاں بیگم کا سنگ تراشی کا نادر الوجود مقبرہ بھی ہے۔

ثمرستان عبید :

اسے جنرل عبیداللہ خاں نے لگایا تھا۔ یہاں سنگترے کے پودے لگائے گئے تھے جنہیں پانی دینے کے لئے ایک تالاب بنایا گیا تھا۔ یہاں کے سنگترے اپنی مٹھاس اور خوشبو میں یکتا تھے۔ یہ باغ باقی نہیں رہا اب یہاں کئی ادارے قائم ہیں جن میں ایک اسکول، ایک عالیشان ہوٹل اور پولیس ٹریننگ سینٹر ہے۔

یادگار شاہجہانی :

نواب سلطان جہاں بیگم نے یہ باغ اپنی ماں شاہجہاں بیگم کی یادگار کے طور پر لگایا تھا۔ یہ پارک نما باغ ہے جو اپنی وسعت، خوشنما حوض اور خوبصورت فوارہ جس پر رنگین فلیش لائٹس نصب تھیں، کی وجہ سے بہت پرکشش منظر پیش کرتا تھا۔ اس باغ کی

مشرقی سمت میں پاترہ ندی رواں دواں ہے۔ اس ندی میں کنول کھلتے ہیں۔ یہاں بچے شام کے وقت کھیلتے ہیں اس کی سبز گھاس پر لوگ صبح سویرے چہل قدمی کرتے ہیں۔ اب اس میں نوابی دور جیسی کشش نہیں رہی اُس دور میں تو ہر جمعہ کی شام یہاں سلطانیہ انفنٹری کا بینڈ دل لبھانے والی دھنیں بکھیرتا تھا۔

گنوری باغ :

یہ نوابی دور کا ایک خوب صورت باغ تھا جہاں لوگ پکنک منانے آتے تھے۔ یہ باغ ایک پرفضا مقام پر واقع ہونے کی وجہ سے لوگوں کو پرسکون ماحول مہیا کرتا تھا۔ چنانچہ صرف عام لوگ ہی نہیں بلکہ ادیب، شاعر، صحافی، دانشور اور سیاست دان بھی جوق در جوق یہاں آ کر اپنا دل بہلایا کرتے تھے۔ کبھی کبھی یہاں مشاعرے بھی منعقد ہوتے تھے۔ اب یہاں پہلے جیسا لطف نہیں ہے۔

اب ہم ذیل میں بھوپال میں واقع ان تفریحی مقامات کا ذکر کریں گے۔ جہاں لوگ تفریح کے علاوہ شکار کے لئے بھی جایا کرتے تھے۔

بھد بھدا :

یہ ایک تفریحی مقام ہے۔ بارش کے دنوں میں یہ مقام بہت پرلطف ہو جاتا ہے۔ بڑے تالاب کا پانی جب بارش کے موسم میں اپنی سطح سے بلند ہو جاتا ہے تو سڑک سے نشیب میں آب شار کی طرح گرتا ہے۔ گو کہ اب یہاں بند بن گیا ہے اور آہنی گیٹ لگا دیئے گئے ہیں مگر برسات کے موسم میں آبشار کا حسین منظر دیکھنے کے لئے لوگ دور دور سے کھنچے چلے آتے ہیں۔ یہ مقام شہر سے تین کلومیٹر دور واقع ہے۔

کیرواں ڈیم :

یہ ڈیم کیرواں ندی پر بنایا گیا ہے۔ یہ جگہ برسات کے موسم میں بہت سہانہ

JALALI BOOKS

منظر پیش کرتی ہے۔ مچھلی کے شکار کے لئے یہ بہت لا جواب ہے۔ یہاں اکثر لوگ پکنک منانے آتے ہیں۔

ون وہار :

یہ جگہ بڑے تالاب کے کنارے واقع ہے یہاں واقع شملہ پہاڑی میں ایک بڑا پارک ہے جس میں ہر طرح کے جنگلی جانور پالے گئے ہیں۔ یہاں اکثر بچے والدین کے ہمراہ تفریح کے لئے آتے ہیں۔

یادگارِ شاہ جہانی :

یہ ایک پارک ہے جو شہر کے وسط میں واقع ہونے کی وجہ سے عوامی توجہ کا خاص مرکز ہے۔ یہ خوب صورت پارک ہے جس کی ہریالی اور رنگ برنگ پھولوں سے لطف اندوز ہونے کے لئے لوگ جوق در جوق آتے ہیں۔ چونکہ یہ شہر کے بیچوں بیچ واقع ہے اس لیے عوام آسانی سے یہاں آجاتے ہیں۔ یہاں ہر موسم میں چہل پہل رہتی ہے۔

جلال الدین شاہ کی ٹیکری :

یہ تفریحی مقام بیرا گڑھ کے قریب واقع ہے۔ یہ انتہائی خوب صورت جگہ ہے۔ یہ ایک چھوٹی سی پہاڑی پر موجود ہے۔ یہاں جنگل جیسا منظر ہے جو لوگوں کو بہت پسند آتا ہے۔

اسلام نگر :

یہ بھوپال شہر سے تقریباً 18 کلو میٹر دور واقع ہے۔ یہاں نواب دوست محمد خاں کا قلعہ واقع ہے جو حلالی ندی کے ساحل پر بنا ہوا ہے۔ یہ شہر سے باہر ایک تفریحی مقام ہے جہاں اکثر لوگ پک نک منانے آتے ہیں۔

اجنال ڈیم :

یہ شہر سے چار کلومیٹر دور واقع ہے۔ یہ خوب صورت جگہ پہاڑ اور جنگل سے گھری ہوئی ہے۔ یہ شکار گاہ بھی ہے۔ یہاں لوگ پک نک مناتے ہیں۔

سمردھا :

یہ بھی ایک خوب صورت تفریح گاہ ہے۔ یہ مقام جنگل میں واقع ہے۔ یہاں ایک ڈاک بنگلہ بھی بنا ہوا ہے۔ یہاں لوگ عام طور پر سردیوں میں آ کر پک نک مناتے ہیں۔

بھوج پور :

یہ مقام شہر سے تیس کلومیٹر دور واقع ہے۔ یہ بیتوا ندی کے کنارے واقع ہے۔ یہ نہایت قدیم جگہ ہے یہاں ایک ہزار سال پرانا شو کا مندر واقع ہے۔ یہ جگہ تاریخ کے ساتھ ساتھ آثار قدیمہ سے بھی تعلق رکھتی ہے۔ تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ یہاں راجہ بھوج کی راج دھانی تھی۔ یہاں کسی وقت کئی خوب صورت مندر موجود تھے۔ شو کے مندر میں آج بھی ہندو پوجا کرنے کے لئے آتے ہیں۔

کولار ڈیم :

یہ مقام چاروں طرف سے پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔ یہ شکار گاہ کے ساتھ ساتھ بہترین پک نک اسپاٹ ہے۔ یہ شہر سے کافی دور واقع ہے مگر پک نک اور شکار کے شوقین یہاں جوق در جوق آتے ہیں۔

کچناریا :

یہ مقام بھوپال سے تقریباً 50 کلومیٹر دور واقع ہے۔ یہ جگہ جنگلوں سے گھری ہوئی ہے۔ یہاں نواب حمید اللہ خاں کا تعمیر کردہ ایک خوب صورت بنگلہ بنا ہوا ہے جہاں وہ ٹھہر کر شکار کیا کرتے تھے۔ اب اس بنگلے کو پک نک کیلئے آنے والے لوگ استعمال کرتے ہیں۔

بھوپال میں ہاکی

میگزین فکر و آگہی میں اپنے ایک مضمون میں سابق سیکریٹری بھوپال ہاکی ایسوسی ایشن ایم ٹی انصاری لکھتے ہیں کہ بھوپال میں ہاکی کی ابتداء انٹر اسٹیٹ فورسز ہاکی ٹورنامنٹ سے 1909ء میں ہوئی تھی یہ ٹورنامنٹ کالی پریڈ گراؤنڈ میں منعقد کیا گیا تھا۔ اس میں آٹھ مختلف شہروں کی ہاکی ٹیموں نے حصہ لیا تھا۔ اس ٹورنامنٹ کو دیکھنے کے لئے بھوپال کے عوام وخواص بڑی تعداد میں پہنچے تھے اس ٹورنامنٹ نے بھوپالی نوجوانوں کے دلوں میں ہاکی کی محبت کا دیپ جلا دیا تھا۔ وہ اس کھیل کے ایسے دیوانے ہوئے کہ اکثر نوجوان اس کھیل کو کھیلنے لگے مگر اس وقت بھوپال کی دکانوں میں اسٹک اور گیند فروخت نہیں ہوتی تھیں کیوں کہ یہ کھیل ابھی تک بھوپال والوں کے لئے اجنبی تھا لیکن جلد ہی بھوپال میں اسٹک اور گیند متعارف ہوگئیں دکانوں میں یہ دونوں چیزیں فروخت ہونے لگیں مگر اسٹک کی قیمت ایک سے دو روپے تھی جسے خریدنا بڑا مشکل تھا چنانچہ نوجوانوں نے عام لکڑی سے بنے کھپوٹے سے کھیلنا شروع کر دیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ بھوپال میں میدانوں سے زیادہ گلی کوچوں میں ہاکی کا کھیل کھپوٹوں سے شرع ہو گیا پھر 1915ء تک بھوپال میں چند ہاکی کلب قائم ہو چکے تھے جن کے نام سکندریہ کلب جو جہانگیر آباد میں قائم ہوا تھا۔ بھوپال ہیروز، نوریہ کلب، بھوپال پولیس، اقتداریہ کلب یہ شاہجہاں آباد میں قائم ہوئے تھے۔ پھر فوج میں ہاکی کا کھیل شروع ہو گیا۔ اس وقت نامور کھلاڑیوں میں مولانا محمد احمد صدر الدین، یوسف علی خاں، نور خاں پٹھان، نظر علی خاں، مجید خاں، ابراہیم پاشا، بابو میاں، دادا میاں ایس اے جلیل، ارجن، عادل ممتا،

حافظ احسن، الیاس شدی شامل تھے۔ اس وقت ہاکی کھیلنے کے لئے لباس کی کوئی پابندی نہیں تھی۔ بھوپال میں ہاکی گلیوں میں کھیلے جانے کی وجہ سے وہاں کے کھلاڑیوں کا اسٹک ورک بہت اچھا تھا۔ بھوپال کی گلیاں دراصل اس طرح کی تھیں کہ ان کے دونوں طرف گندی نالیاں بنی ہوئی تھیں۔ چنانچہ ہر کھلاڑی کو گیند نالیوں میں جانے سے روکنے کے لئے اسٹک ورک استعمال کرنا پڑتا تھا۔ بہترین اسٹک ورک کی وجہ سے بھوپال کے کھلاڑیوں کا برصغیر میں کوئی مدمقابل نہ تھا۔ بھوپال میں 1916ء میں آل انڈیا اقتدار سلور کپ کی ابتداء ہوئی۔ اس ٹورنامنٹ میں بھوپال کے قریبی شہروں کی ٹیموں نے شرکت کی تھی۔ یہ ٹیمیں جبل پور، ساگر، دموہ، بینا، راجندر گاؤں اور کھنڈوا سے آئی تھیں۔ اس ٹورنامنٹ کے بعد بھوپال کی ہاکی کو کافی تقویت ملی۔ اقتدار کلب بھی بہت مشہور ہوگیا اور نامور کھلاڑی انوار احمد خاں اسی کلب کی دریافت تھے۔

اس وقت تک اگرچہ پورے ہندوستان میں ہاکی کھیلی جارہی تھی مگر اس کی کوئی تنظیمی باڈی نہیں تھی۔ نومبر 1925ء میں گوالیار شہر میں وائسرائے ہند کی کونسل کے ایک ممبر جگدیش پرشاد کی زیر صدارت ایک میٹنگ ہوئی۔ جس میں انڈین ہاکی فیڈریشن کی بنیاد رکھی گئی۔ اس کے اے اے انصاری سیکریٹری مقرر ہوئے تھے۔ اس میٹنگ میں بھوپال کی نمائندگی اے جی خان اور پروفیسر نوشہ علی نے کی تھی۔

سعید الظفر خاں اور رشید الظفر خاں کی کوششوں سے 1931ء میں بھوپال ہاکی ایسوسی ایشن قائم ہوئی اس کے سرپرست اعلیٰ نواب بھوپال حمید اللہ خاں تھے۔ سرپرست سعید الظفر اور رشید الظفر مقرر ہوئے جبکہ جسٹس سلام الدین خاں تاحیات صدر مقرر ہوئے اور جناب اے جی خاں سیکریٹری اور پروفیسر نوشہ علی جوائنٹ سیکریٹری مقرر ہوئے۔

انعام اللہ خاں لودھی نے میگزین فکر و آگہی میں چھپے اپنے ایک مضمون میں

بھوپال میں ہاکی کی ابتداء کا سال 1914ء بتایا ہے وہ لکھتے ہیں کہ بھوپال میں 1914ء میں ملٹری کی ٹیموں کے درمیان منعقد ہونے والے ایک ٹورنامنٹ سے یہاں ہاکی کے کھیل کی ابتداء ہوئی۔ اس ٹورنامنٹ میں جو بھوپال کی تاریخ کا پہلا ہاکی ٹورنامنٹ تھا بھوپال کے عوام نے جوق در جوق شرکت کی تھی وہ اس کھیل سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے اسے اپنا لیا اور اپنے گلی کوچوں میں عام لکڑی کو ہاکی کی شکل دے کر اور پتھر کی گیندیں بنا کر اپنا شوق پورا کرنے لگے۔ اس عام لکڑی کی ہاکی کو بھوپالی ''کھپوٹا'' کہتے تھے۔ پتھر کی گیند کے بعد مٹی سے گیندیں بنائی گئیں اور پھر لکڑی کی گیندیں استعمال ہونے لگیں بعد میں بھوپالیوں نے ہمت کر کے اصلی اسٹک اور گیندیں بھی خریدنا شروع کر دیں۔ نواب زادہ رشید الظفر خاں خود ہاکی کے ایک اچھے کھلاڑی تھے انہوں نے بھوپال میں ہاکی کے فروغ کے لئے اہم کردار ادا کیا تھا۔

بھوپال وانڈرس کی ابتداء

اس مشہور زمانہ ہاکی ٹیم کی ابتداء 1931ء میں ہوئی۔ اس ہاکی کلب کے روح رواں رشید الظفر تھے۔ اس کلب کے لئے شملہ کی پہاڑی پر ایک ہاکی گراؤنڈ تیار کیا گیا اور اس پر بھوپال وانڈرس کے کھلاڑیوں نے مشق شروع کی کچھ ہی عرصے میں بھوپال وانڈرس ایک بہترین ٹیم کی شکل میں ہندوستان کی ہاکی کے افق پر نمودار ہوئی۔ اس نے صرف چار سال میں دس اہم ٹورنامنٹ جیت کر پورے ہندوستان میں تہلکہ مچا دیا تھا اس وقت ٹیم کے کپتان اشرف محمد خاں تھے لیکن 1931ء سے 1945ء تک اسماعیل عباسی ٹیم کے کپتان رہے۔ 1936ء کے برلن اولمپک کے لئے منتخب ہونے والے ہاکی پلیئرز میں بھوپال کے دو کھلاڑی شامل تھے۔ جن کے نام احسن محمد خاں اور احمد شیر خاں تھے۔ اسی ٹیم میں دھیان چند بھی منتخب ہوئے تھے۔ اس ٹیم کی کپتانی کے

لئے تین نام تجویز کئے گئے تھے یہ دھیان چند، احسن محمد خاں اور جعفر شاہ تھے۔ گو کہ ان تینوں کو برابر ووٹ ملے تھے مگر احسن محمد خاں اور جعفر شاہ رضا کارانہ طور پر دھیان چند کے حق میں دست بردار ہو گئے تھے۔ بھوپال کی ہاکی کے لئے 1938ء کا سال ناقابل فراموش تھا کہ اس سال بھوپال وانڈرس نے ہندوستان میں منعقد ہونے والے ہر ٹورنامنٹ میں کپ جیتا تھا۔ 1940ء کے اولمپک گیم دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے منعقد نہیں ہو سکے تھے اگرچہ منعقد ہو جاتے تو یقینی طور پر اس میں بھوپال کے پانچ چھ کھلاڑی اپنے معیاری کھیل کی وجہ سے ضرور منتخب ہو جاتے۔

1947ء میں قیام پاکستان کے ساتھ ہی بھوپال کے کئی نامور کھلاڑی پاکستان آ گئے۔ 1952ء میں ہیلسنکی میں منعقد ہونے والے اولمپک گیمز میں پاکستان کی ہاکی ٹیم میں بھوپال کے چار کھلاڑی شامل تھے جن کے نام اختر حسین، حبیب الرحمٰن، لطیف الرحمٰن اور انوار احمد خاں تھے۔ دیگر بھوپال کے نامور کھلاڑی جو پاکستان منتقل ہوئے ان میں میجر شکور، نبّو، فاروق علی خان، سدّو داد، شمس اللطیف، یوسف علی، احسن محمد خاں اور محسن محمد خاں شامل تھے۔ 1956ء میں میلبورن میں منعقدہ اولمپک گیمز میں انوار احمد خاں کو بہترین سینئر فارورڈ قرار دیا گیا تھا۔ بھوپال کے سرفراز بیگ نے مطیع اللہ، سمیع اللہ اور کلیم اللہ کی ایسی بہترین تربیت کی کہ وہ عالمی ہاکی کے جھومر بن گئے۔ بھوپال کے اختر حسین نے بحیثیت کوچ پاکستانی ہاکی ٹیم کی زبردست خدمت کی۔ بھوپال کے افتخار سید نے 1971ء میں منعقدہ بارسلونا کپ میں پاکستان کی نمائندگی کی تھی اور بہترین کھیل کا مظاہرہ کیا تھا۔

☆☆☆

بھوپال کی صنعتیں

ریاست بھوپال ایک فلاحی ریاست تھی جہاں عوام کی خدمت مذہب وملت کی تفریق کے بغیر کی جاتی تھی۔ عوام کو ہر قسم کی سہولیات بہم پہچانے کے لئے حکومت ہمہ وقت چاق و چوبند رہتی تھی۔ تعلیم کو تمام نوابین نے انتہائی اہمیت دی تھی تعلیم کے ساتھ مختلف تربیتی مراکز بھی قائم کئے گئے تھے۔ خواتین کو سلائی کڑھائی سکھانے کا خاص اہتمام کیا گیا تھا۔ نواب سلطان جہاں بیگم کا دور خواتین کو علوم وفنون سیکھنے کی ترغیب دینے کے سلسلے میں بہت اہم تھا آپ خواتین کو ہر شعبہ میں ترقی یافتہ دیکھنا چاہتی تھیں۔ اسی زمانے میں روزگار کی تلاش میں ہندوستان کے مختلف علاقوں سے لوگ بھوپال کی جانب کھنچے چلے آرہے تھے۔ ان لوگوں میں ہنرمند مرداور خواتین بھی تھیں۔ یہ لوگ دردوزی کار چوب زری، کشیدہ کاری اور کامدانی وغیرہ کے ہنر میں خاص مہارت رکھتے تھے۔ ان کی مہارت سے مقامی لوگوں نے فائدہ اٹھایا اور وہ بھی ان فنون میں ماہر ہوگئے۔ ان کی بنی ہوئی چیزیں بازاروں میں فروخت ہونے لگیں۔ اس طرح ان کے لئے ذرائع معاش پیدا ہوگیا۔ بھوپال میں خاص طور پر بٹوؤں کی دستکاری نے بہت عروج پایا اس لئے کہ بھوپالی پان کھانے کے شوقین ہیں اور وہ بٹوؤں میں چھالیہ الائچی اور سونف وغیرہ رکھتے ہیں۔ بٹوؤں کے علاوہ کپڑوں پر زری گوٹہ لگانے اور کپڑوں کو رنگنے کی صنعت نے بھی خوب ترقی کی۔ کار چوب کو خواتین کے ساتھ ساتھ مردوں نے بھی اپنی روزی کا ذریعہ بنایا۔ بازاروں میں کار چوب کی دوکانیں کھل گئیں جہاں پر بہترین کام کیا جاتا تھا۔ عید بقرعید کے دنوں میں اس کام کی کافی مانگ ہوتی تھی۔

چنانچہ ان تہواروں کے مواقع پر ان کاریگروں کی آمدنی عام دنوں سے بڑھ جاتی تھی۔

اس کے علاوہ بھوپال میں درزی، لوہار، مکانوں کی تعمیر میں حصہ لینے والے کاری گروں کو بھی روزی کمانے میں کوئی دقت نہیں ہوتی تھی۔ یہاں کے درزی ہر قسم کا لباس تیار کرنے میں مہارت رکھتے تھے۔ لوہار لوہے کی مختلف اشیاء کے ساتھ ساتھ تلواریں بھی تیار کرتے تھے۔ اس زمانے میں بندوق اور پستولوں کے استعمال کا رجحان کم تھا۔ چاقو چھریاں اور قینچیاں بھی لوہار ہی بناتے تھے۔ یہ چونکہ ہر گھر کی ضرورت ہوتی تھیں چنانچہ ان کا کاروبار سال بھر چلتا رہتا تھا۔ ٹوپیوں کے لگانے کا بھی رجحان عام تھا۔ چنانچہ اس صنعت سے متعلق لوگ بھی روزی پیدا کر لیتے تھے۔ جولاہے ہر قسم کے کپڑے تیار کرتے تھے جن کی ہر گھر میں ضرورت ہوتی تھی بھوپال میں اعلیٰ قسم کا کپڑا تیار ہوتا تھا۔ یہاں ہاتھ سے ریشم بھی تیار کیا جاتا تھا۔

بھوپال شہر کے اردگرد گھنے جنگلات واقع ہیں ان جنگلات میں عمارتی لکڑی بھی موجود ہے اس لکڑی کو عمارتوں کی تعمیر میں استعمال کرنے کے علاوہ فرنیچر بنانے کے لئے بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ بھوپال میں نفیس قسم کا فرنیچر تیار ہوتا تھا جس کی باہر کے شہروں میں بھی کافی مانگ تھی۔ ریاست بھوپال میں زرخیز زمین کی کمی نہیں ہے۔ یہاں زراعت کا شعبہ ہمیشہ ہی پھلتا پھولتا رہا ہے۔ یہاں تمام اقسام کے اناج پیدا ہوتے ہیں لیکن بھوپال سویابین کی کاشت کے لئے نہ صرف پورے ہندوستان بلکہ دنیا بھر میں مشہور ہے۔ یہاں سویابین کے تیل کی صنعت نے کافی ترقی کی ہے۔ اس کے علاوہ مونگ پھلی اور تل بھی یہاں بکثرت پیدا ہوتا ہے۔ ان کے تیل بھی یہاں نکالے جاتے ہیں جن سے لذیذ کھانے تیار کئے جاتے ہیں۔

☆☆☆

بھوپال کا بھارت میں انضمام اور اس کے اثرات

ریاست بھوپال تقریباً سوا دوسو سال تک آزاد اور خود مختار ریاست کے طور پر ہندوستان کے نقشے پر موجود رہی۔ اسے قائم کرنے والے دوست محمد خاں تھے اور اس کی آزادی اور خود مختاری کے چھن جانے کے بعد اسے بھارت کے حوالے کرنے والے نواب حمید اللہ خاں تھے۔ ریاست بھوپال ہندوستان کی ایک متمول، خوش حال اور سر سبز و شاداب ریاست تھی۔ یہاں کے مسلمان حکمراں انتہائی روادار غیر متعصب اور فراخ دل تھے وہ اپنی رعایا کے ہر دکھ درد کا خیال ہی نہیں کرتے تھے بلکہ اس کا تدارک بھی کرتے تھے۔ انہوں نے عوام کی فلاح و بہبود کے کام کرنے کے علاوہ ریاست کی ترقی پر بھی خصوصی توجہ دی تھی۔ یہ ہندوستان کی ایک ترقی یافتہ اور تعلیم یافتہ لوگوں سے مزین ریاست تھی۔ ریاست کے قائم ہونے کے ساتھ ہی پڑوسی ریاستوں کے غاصب حکمران اسے کوئی نقصان نہ پہنچا سکے۔ یہاں کے نوابین نے ہر بیرونی حملہ آور کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور انہیں ایسا سبق سکھایا کہ وہ پھر دوبارہ ریاست پر حملہ آور ہونے سے باز رہے مگر جب خواتین نوابین کا دور شروع ہوا تو ریاست کا وہ دبدبہ قائم نہ رہ سکا جو مردوں کے دور میں تھا۔ چنانچہ پہلی خاتون نواب قدسیہ بیگم کو، ریاست کو دشمنوں سے محفوظ بنانے کے لئے انگریزوں کی مدد حاصل کرنا پڑی۔ اس ضمن میں ریاست اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے مابین قدسیہ بیگم کے شوہر نظر محمد خاں کے درمیان پہلے ہی با قاعدہ ایک معاہدہ ہو چکا

تھا جس کی رو سے ریاست انگریزوں کی باج گزار بن گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ریاست دشمنوں سے تو محفوظ ہوگئی مگر حکمرانوں نے نہ صرف خود کو بلکہ آنے والی پوری شاہی نسل کو انگریزوں کا غلام بنا دیا تھا۔ چنانچہ جب تک انگریز ہندوستان پر حکومت کرتے رہے بھوپال ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی دیگر ریاستوں کے حکمراں ان کے سائے میں حکمرانی کرتے رہے مگر ہر عروج کی قسمت میں قدرت نے زوال لکھ دیا ہے چنانچہ انگریزوں کی حکومت جس میں کبھی سورج غروب نہیں ہوتا تھا بالآخر اس کا سورج بھی غروب ہونے لگا اور انہیں دنیا کے دیگر علاقوں کی طرح بالآخر ہندوستان سے بھی اپنا بوریہ بستر لپیٹ کر اپنے ملک برطانیہ واپس جانا پڑا۔ انگریزوں نے 15 اگست 1947ء کو ہندوستان کو آزادی دی اور اس کے ساتھ ہی ہندوستان کی کانگریسی حکومت نے ہندوستان میں موجود تمام ریاستوں کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔ ریاست بھوپال کے نواب حمید اللہ خاں انتہائی ذہین اور زیرک سیاست داں تھے۔ انہوں نے دو سال تک ریاست کا بھارت میں انضمام روکے رکھا مگر بالآخر 31 مئی 1949ء کو بھوپال ریاست کا خاتمہ ہو گیا اور اسے یونین آف انڈیا میں چیف کمشنر پراونس کی حیثیت دے دی گئی۔ مسٹر این بی بونر جی آئی سی ایس کو چیف کمشنر مقرر کیا گیا جو یکم جون 1949ء سے ریاست کا انتظام چلانے لگے۔ بونر جی گیارہ ماہ تک ریاست کا انتظام چلاتے رہے اور اس کے بعد 30 اپریل 1950ء کو ان کی جگہ مسٹر وشوا ناتھن آئی سی ایس نے عہدہ سنبھال لیا۔ یہ صاحب ریاست کے لئے عذاب ثابت ہوئے۔ انہوں نے نوابی دور کے طویل مدت سے کام کر رہے تجربہ کار ملازمین کو تعلیمی شرائط کی قید میں جکڑ کر فارغ کر دیا اس طرح ہزاروں لوگ بے روزگار ہو گئے بدقسمتی سے یہ تمام مسلمان تھے اس کے ساتھ ہی واشوا ناتھن نے ریاست میں اردو کی جگہ ہندی کو سرکاری زبان کا درجہ دے دیا جس سے اردو غیر ملکی زبان بن گئی اور ہندی زبان سرکاری زبان قرار دے دی گئی۔ 26

جنوری 1952ء کو بھارتی آئین کے نافذ ہونے کے بعد ریاست میں پہلے عام انتخابات منعقد کئے گئے جس میں کانگریس پارٹی نے ریاستی اسمبلی کی 30 میں سے 25 نشستیں حاصل کرلیں۔ ڈاکٹر شنکر دیال شرما چیف منسٹر اور مولانا عنایت اللہ خاں سینئر وزیر مقرر ہوئے۔ اسپیکر سلطان محمد خاں اور لکشمی نارائن اگروال ڈپٹی اسپیکر مقرر ہوئے۔ یکم نومبر 1956ء کو بھارتی ریاستوں کی تشکیل نو کی گئی جس کے تحت ایک نیا صوبہ مدھیہ پردیش کے نام سے قائم کیا گیا اور بھوپال کو اس کا دارالخلافہ بنا دیا گیا۔

اسٹیٹس ری آرگنائزیشن نے نئے صوبے کے دارالخلافہ کے لئے جبل پور کا نام تجویز کیا تھا لیکن ڈاکٹر شنکر دیال شرما سپوت بھوپال اپنی دلیلوں سے بھوپال کو جبل پور سے زیادہ اہم شہر ثابت کر کے بھوپال کو مدھیہ پردیش کا دارالخلافہ بنوانے میں کامیاب ہوگئے۔ نئے صوبے کا دارالخلافہ قرار پانے سے بھوپال کو بہت سے اقتصادی فوائد حاصل ہوگئے۔ اس شہر میں ایک ہیوی الیکٹریکل کمپلیکس کا قیام عمل میں آیا جس سے یہاں کے بے روزگار افراد کو روزگار حاصل ہوگیا۔ اس کارخانے کو بھوپال میں لگانے کا سہرہ بھی ڈاکٹر شنکر دیال شرما کے سر تھا۔ نئے صوبے کے سب سے پہلے چیف منسٹر روی شنکر شکلا تھے ان کے بعد بھگوت راؤ چیف منسٹر مقرر ہوئے۔ 1992ء تک مدھیہ پردیش پر کانگریس پارٹی کی حکومت رہی اور اس کے ہی ارکان صوبے کے چیف منسٹر مقرر ہوتے رہے۔ اس وقت وہاں بی جے پی برسر اقتدار ہے اور اس کی طرف سے مسٹر چوہان وزیر اعلیٰ ہیں۔

☆☆☆

گیس کا المیہ

بھوپال یقیناً ایک پرامن شہر ہے اس کے شہری بھی امن سے محبت کرنے والے ہیں۔ اس شہر نے ماضی میں بھی اپنے پرامن ماحول کی بدولت ترقی اور خوش حالی کی منزلیں طے کیں اور ریاست کے بھارت میں ضم ہونے کے بعد اپنے شہر کو بھارت کے دیگر شہروں سے ہٹ کر دنگے فساد اور مذہبی منافرت سے پاک رکھا۔ گو کہ اس شہر میں بھی مہا سبھائی آباد ہیں اور وہ مسلمانوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ پاکستان کیوں نہیں چلے گئے بلاشبہ پاکستان کو مسلمانوں نے ہی بنایا ہے مگر وہ مولانا ابوالکلام جیسے بھارت کے خیر خواہوں کو کیوں بھول جاتے ہیں جنہوں نے پاکستان کے بننے میں رکاوٹوں کے پہاڑ کھڑے کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور قیام کے بعد پاکستان کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔ مولانا کی یہ سوچ اکیلی سوچ نہیں تھی، ہندوستان میں کروڑوں مسلمان ایسی سوچ اور نظریے سے متفق تھے ایسے مسلمانوں کو بھی بھارت میں رہنے کا حق نہیں ہے۔ حقیقت میں تو وہ سچے بھارتی ہیں ان کے لئے تو ہندوؤں کو ہمیشہ چشم براہ رہنا چاہئے مگر افسوس کہ ہندو ذہنیت کو سمجھنا مشکل ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ مولانا ابوالکلام بھی نہ سمجھ سکے۔ بہر حال یہ اس شہر کی خوش قسمتی ہے کہ یہاں کبھی ہندو مسلم فساد نہیں ہوا مگر اس کی وجہ صرف نوابوں کے دور میں دونوں قوموں کی جو تربیت کی گئی تھی اور ان کے درمیان جو بھائی چارے کی فضا پیدا کی گئی تھی وہ اب بھی جاری و ساری ہے۔ اس شہر نے کبھی کوئی برا وقت نہیں دیکھا مگر آزادی کے بعد 2 دسمبر 1984ء کی رات اس شہر پر ایسی آفت ناگہانی ٹوٹی کہ چشم زدن میں ہزاروں شہری

ہلاک ہوگئے۔ ہزاروں کی ہی تعداد میں اپاہج ہوگئے۔ یہ المناک واقعہ ایک امریکی کمپنی یونین کاربائیڈ کی مجرمانہ غفلت اور حکومت ہند کی حماقت کی وجہ سے پیش آیا تھا۔ اس کارخانے کو شہر کے وسط میں قائم کرنے کی اجازت کیوں دی گئی تھی؟ پوری دنیا میں زہریلی گیسوں کو پیدا کرنے والی فیکٹریوں کو شہر کے باہر قائم کیا جاتا ہے تاکہ کبھی کوئی لیکیج یا خرابی ہو تو اس سے مقامی آبادی متاثر نہ ہو۔ اس کارخانے کو 1968ء میں ممبئی سے بھوپال شفٹ کیا گیا تھا۔ یہ کارخانہ 1970ء سے MIC گیس تیار کرنے لگا تھا۔ بھارت سرکار نے اس گیس کو برآمد کرکے منافع کمانے کی لالچ میں بڑی مقدار میں گیس پیدا کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ MIC ایک زہریلی گیس ہے جو انسانوں کی زندگیوں کو پل بھر میں ختم کرسکتی ہے۔ اس گیس کو دوسری جنگ عظیم میں جرمنی نے ہتھیار کے طور پر استعمال کیا تھا۔ بھارت سرکار نے صرف منافع کمانے کی غرض سے اس گیس کی تیاری کی اجازت دے کر حقیقتاً غیر انسانی فعل کا ارتکاب کیا تھا۔ یونین کاربائیڈ کو اس گیس کی تیاری کی اجازت تو دے دی گئی مگر بھارت سرکار نے اس کمپنی کی نگرانی پر کوئی توجہ نہ دی۔ یہ اپنی مرضی سے کام کرتی رہی۔ قاعدے کے مطابق جس ٹینک میں MIC گیس رکھی جاتی ہے اسے کبھی بھی آدھے سے زیادہ نہیں بھرا جاتا ہے مگر یہاں تمام اصولوں کو پیروں تلے روند دیا گیا تھا۔ MIC گیس کے ٹینکوں کو مقررہ گنجائش سے زیادہ بھرنا ایک معمول بنا لیا گیا تھا اکثر گیس کے سلنڈر معیار سے روگردانی کرتے ہوئے آدھے کے بجائے تین چوتھائی بھرے جاتے تھے حادثہ سے قبل کمپنی کی ایک انسپیکشن رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ یونین کاربائیڈ کمپنی کی تمام مشینیں اپنا کام درست طریقے سے نہیں کر رہی تھیں۔ ٹینک بھی خستہ تھے جن کے لیک ہونے کا خطرہ تھا۔ اس بات کے بھی شواہد موجود تھے کہ بھوپال کا یہ کارخانہ اپنے دوسرے کارخانوں سے ہر اعتبار سے کمتر تھا یہاں احتیاطی تدابیر کا فقدان تھا۔ ساتھ ہی مینٹی ننس بھی بے حد ابتر تھی

یہاں کی زہریلی گیس کے کبھی اتفاقیہ طور پر خارج ہونے کی صورت میں MIC گیس کے مضر اثرات سے بچنے کی تدابیر سے بھوپال کے عوام کو کبھی آگاہ نہیں کیا گیا تھا۔ کارخانے کی انتظامیہ کی غفلت اور بدانتظامی پر حکومت نے کبھی توجہ نہیں دی۔ حادثے کی رات پانچ میں سے چار خصوصی سیفٹی سسٹم نے کام کرنا بند کر دیا تھا۔ اس کی وجہ سراسر خراب مینٹی ننس تھی۔ حکومت کی غفلت کا یہ حال تھا کہ 1979ء میں اس کارخانے کے پیھتال پلانٹ میں آگ لگ چکی تھی جس کے نتیجے میں کارخانے کو ایک ہفتے کے لئے بند رکھنا پڑا تھا۔ MIC گیس سے متعلق حصے میں بھی 1981ء میں آتش زدگی کا واقعہ پیش آ چکا تھا جس سے ایک اہلکار کی موت بھی واقع ہوگئی تھی۔ یہ شخص فاسجین کے رسنے کی وجہ سے ہلاک ہوگیا تھا۔

فروری 1982ء میں فاسجین گیس کے اخراج کی وجہ سے 24 اہلکار متاثر ہوئے تھے۔ جنہیں نازک حالت میں اسپتال میں داخل کرنا پڑا تھا۔ اسی سال اگست کے مہینے میں ایک کیمیکل انجینئر MIC گیس کے نرغے میں آ کر ہلاک ہوگیا تھا۔ اس سال اکتوبر کے مہینے میں ایک اور حادثے میں یہاں کے تین مزدور متاثر ہوئے تھے۔ اس حادثے کے بعد یہاں کی ورکرز یونین نے کارخانے کے باہر دیوار پر ہندی میں پوسٹر لگا دیئے تھے جن میں اہل بھوپال کو خبردار کیا گیا تھا کہ کارخانے میں کام کرنے والوں اور شہریوں کی زندگیاں کارخانے کی بدانتظامی کی وجہ سے ہر وقت خطرے میں ہیں۔ 1982ء میں ہی امریکہ سے کاربائیڈ کمپنی کی ایک سیفٹی آڈٹ ٹیم بھوپال آئی جس نے اس کارخانے میں دس اہم خامیوں کی نشان دہی کی تھی۔ اس کارخانے میں بدانتظامی اور حفاظتی تدابیر کی کمی کی وجہ سے کثیر تعداد میں مزدور نوکری چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ بھوپال کے ایک جرنلسٹ راج کمار کیسوانی نے کارخانے میں زہریلی گیس اور اس سے بچاؤ کی تدابیر نہ ہونے پر سخت احتجاج کیا تھا۔ کارخانے کے ورکرز یونین کے سربراہ

سنجوائے ہزاریکا نے مندرجہ ذیل خرابیوں کی نشاندہی کی تھی۔

1- کارخانے میں ٹریننگ پروگراموں کو بہت ہلکا کر دیا گیا ہے۔الفابیتھال یونٹ والوں کو MIC گیس یونٹ میں ایک سال کی ہلکی پھلکی ٹریننگ کے بعد منتقل کر دیا گیا ہے۔

2- کارخانے میں کام کرنے والے زیادہ تر آپریٹرز صرف ہائی اسکول پاس ہیں جن کے پاس کیمیکل انجینئر نگ کی کوئی تعلیم نہیں ہے۔ وہ ٹوٹی پھوٹی انگلش سے کام چلاتے ہیں جبکہ کارخانے سے متعلق تمام معلومات کی کتابیں انگریزی زبان میں ہیں۔

3- 21 دسمبر 1982ء کو مدھیہ پردیش کی اسمبلی میں وزیر محنت تاراچند نے فیکٹری کو بھوپال شہر سے دور منتقل کرنے کے اپوزیشن کے مطالبے کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ یہ کوئی پتھر کا ٹکڑا نہیں ہے جسے اِدھر سے اُدھر اُٹھا کر رکھ دیا جائے۔ یہ مہنگا کارخانہ ہے جو 25 کروڑ روپے کی لاگت سے قائم ہوا ہے۔

ماہرین اور خود فیکٹری کے ملازمین کی نشاندہی کے باوجود فیکٹری کی انتظامیہ اپنی غفلت سے باز نہ آئی اور جن خرابیوں کی جانب نشاندہی کی گئی تھی اس پر کوئی توجہ نہ دی گئی۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ 2 دسمبر 1984ء کی رات کو اس فیکٹری کے ایک ٹینک سے MIC گیس رسنا شروع ہوگئی۔ مینٹی ننس اسٹاف نے لاکھ کوشش کی کہ وہ کسی طرح رسنا بند ہو جائے مگر ساری کوششیں رائیگاں ثابت ہوئیں اور گیس اتنی زیادہ مقدار مین خارج ہوگئی کہ قرب و جوار کی پوری فضا پر یہ گیس چھانے لگی۔ گیس کے اخراج کی وجہ ایک والو کی خرابی تھی اس والو کی خرابی سے فیکٹری کے اعلیٰ افسران کو باخبر کیا گیا تھا ٹینک میں چونکہ مقدار سے زیادہ گیس موجود تھی چنانچہ گیس کا پریشر اتنا زیادہ تھا کہ کنٹرول سے باہر تھا۔ گیس کے باہر کی فضا میں شامل ہونے کا اندازہ کر کے انتظامیہ نے ٹیلی فون پر شہر کی انتظامیہ کو مطلع کیا جس نے شہر میں خطرے کا اعلان کر دیا۔ رات گیارہ

بجے کے بعد جب گیس پورے پریشر کے ساتھ نکلنا شروع ہوئی تو فیکٹری سے بھی خطرے کا الارم بجایا گیا۔ شگفتہ فرحت کے مطابق فیکٹری کے قریب جھگیوں میں آباد مزدوروں کے رشتے دار بھاگ کر فیکٹری کے آس پاس جمع ہوگئے وہ جاننا چاہتے تھے کہ اصل مسئلہ کیا ہے۔ وہاں گیس اتنی زیادہ مقدار میں فضا میں رچ بس گئی تھی کہ وہ تمام آٹھ سو کے قریب لوگ چشم زدن میں موت کی آغوش میں پہنچ گئے۔ وہ اپنے گھر دوبارہ واپس نہ جا سکے۔ اس کے علاوہ قریب کی جھگیوں میں جو لوگ لیٹے بیٹھے تھے یعنی وہ جس حالت میں تھے وہ وہیں ہمیشہ کے لئے سو گئے۔ معصوم بچے جن کے چہرے مرنے کے بعد بھی ایسے لگتے تھے گویا اب یہ سو کر اٹھنے والے ہیں پلک جھپکتے میں دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔ اس وقت ہوا کا دباؤ شمال سے جنوب کی جانب تھا چنانچہ بھوپال کا ریلوے اسٹیشن گیس کے نرغے میں آ گیا وہاں موجود مسافروں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ گلے میں جلن پیٹ کی تکلیف شروع ہوگئی، مسافروں کو ایسا لگا جیسے کہ کسی نے قریب ہی ڈھیر ساری مرچیں جلا دی ہوں کچھ ہی لمحے میں یہ خبر آ گئی کہ فیکٹری سے زہریلی گیس خارج ہو رہی ہے اور یہ موت کی نیند سلا سکتی ہے چنانچہ بھاگو بھاگو کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ اور پھر تھوڑی دیر میں پورے شہر کے لوگ ہی بھاگو بھاگو کا نعرہ لگاتے ہوئے بھاگ رہے تھے۔ اس میں بچے بوڑھے جوان عورتیں اور مرد سب ہی بھاگ رہے تھے جو پیچھے رہ گئے وہ موت کے منہ میں جا رہے تھے انسان تو انسان چرند پرند تک موت کا شکار ہو رہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں شہر میں ہر طرف لاشوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔

کسی کی ماں مر گئی اور بچہ بھی گود میں ہی مر گیا۔ بھوپال ریلوے اسٹیشن ماسٹر نے جب دیکھا کہ لوگ مر رہے ہیں تو اس نے اٹارسی اور ودیشہ سے جو ریلیں بھوپال پہنچنے والی تھیں سب کو وہیں روک دیا۔ ایک ریل گاڑی یونین کاربائیڈ فیکٹری کے پیچھے

رک گئی کیوں کہ آؤٹر سگنل کیبن مین مر چکا تھا چنانچہ ریل وہیں کھڑی ہوگئی مگر چونکہ وہاں فضا میں گیس نے اپنا رخ بدلا اور یہ گیس بیریسہ روڈ، حمیدیہ روڈ، شاہجہاں آباد، تلی گھر چوک، بیر گیٹ منگل وارہ تک پہنچ گئی، وہاں بھی ہلاکتیں ہونے لگیں۔ چنانچہ وہاں کے لوگ بھی شہر سے دور بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔ بس سب کو ایک ہی فکر تھی کہ کسی طرح موت سے بچا جا سکے۔ یہ عجیب اتفاق تھا کہ شہر کے تین لاکھ انسانوں نے صرف دو گھنٹے کے اندر شہر کو چھوڑ دیا تھا۔ اسپتالوں میں انسانوں کا اژدہام تھا۔ وہاں ڈاکٹر لوگوں کی جان بچانے کی کوششوں میں مصروف تھے مگر گیس نے انہیں جانبر نہ ہونے دیا۔ اسپتالوں میں دوائیں اور انجکشن ختم ہو گئے۔ چنانچہ ڈسٹل واٹر کے ہی انجکشن لگا دیئے گئے بہرحال گیس کے زہر نے اپنا کام دکھا دیا تھا کہ شہر کے 15 سے 20 ہزار انسان موت کی نیند سو چکے تھے۔ مردوں کو دفن کرنے اور جلانے کے لئے مشکلات کا سامنا تھا۔ مسلمانوں کو اجتماعی قبروں میں دفن کر دیا گیا، ہندوؤں کی لاشوں کا مسئلہ تھا مگر ان کے پنڈتوں نے بھی کئی کئی لاشوں کو ایک ساتھ جلانے کا حکم دے دیا۔ اس رات ہزاروں انسانوں کی ایک ساتھ موت نے پورے بھارت کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ جو اس گیس کے اثرات سے متاثر ہونے کے باوجود بچ گئے وہ اپاہج ہو گئے کچھ اندھے ہو گئے اور کچھ سوجھ بوجھ ہی کھو بیٹھے۔

مرنے والوں کا سب ہی کو افسوس ہوا مگر حکومت ہند کو اپنی کوتاہیوں پر ذرا افسوس نہ ہوا۔ شروع میں اس نے مرنے والوں کے لواحقین کو معاوضہ دلانے کے لئے بہت شور مچایا تھا۔ اب اس واقعے کو گزرے تیس برس سے زیادہ ہو گئے ہیں یونین کاربائیڈ کمپنی سے کوئی معاوضہ وصول نہ کیا جا سکا۔ اس کی وجہ کمپنی اور حکومت ہند کے وزیروں کی ملی بھگت تھی آج بھی بھوپال کے لوگ یونین کاربائیڈ سے زیادہ حکومت ہند کو بددعائیں دیتے نظر آتے ہیں۔ حکومت نے نہ ان کا کیس صحیح طریقے سے پیش کیا اور نہ

ہی امریکی حکومت سے اسے منوانے کی حقیقی کوشش کی۔ دراصل حکومت امریکی سرمایہ کاروں کا دل نہیں توڑنا چاہتی تھی کیوں کہ اس طرح بھارت میں امریکی سرمایہ کاری میں کمی واقع ہو جاتی۔ حکومت ہند نے یونین کا بائیڈ پر تقریباً سوا تین بلین ڈالر کا دعویٰ کیا تھا اگر یہ رقم مل جاتی تو متاثرہ خاندانوں کی ضرور کچھ اشک شوئی ہو جاتی مگر متاثرہ افراد آج بھی معاوضہ ملنے کے منتظر ہیں مگر حکومت اب سرے سے اس اندوہ ناک حادثے کو بھول چکی ہے۔ ہر سال 2 دسمبر کو بھوپال کے علاوہ بھارت کے کئی شہروں میں انسانی حقوق کی تنظیمیں 30 سال قبل رونما ہونے والے اس ہولناک واقعے سے حکومت کو آگاہ کراتی رہتی ہیں اور متاثرین کے لئے مالی امداد دلانے کا مطالبہ کرتی رہتی ہیں مگر حکومت پر اس احتجاج کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور وہ اپنی آنکھیں اور کان بند کئے رہتی ہے کیوں کہ اس گیس المیے سے غریب لوگ ہی مارے گئے تھے ہاں اگر کسی وزیر یا بڑے سیاست داں کے رشتے دار مارے جاتے تو یقیناً ان بڑے لوگوں کے طفیل غریب لوگوں کا بھی بھلا ہو جاتا اور انہیں بھی کچھ معاوضہ حاصل ہو جاتا جس سے ان کی کچھ اشک شوئی ہو جاتی۔

☆☆☆

محسنِ پاکستان کی مدح میں عثمان دموہی کا خراج تحسین

باعثِ صد فخر ملت ڈاکٹر عبدالقدیر
وطن سے تیری محبت بے مثال و بے نظیر
فاتح میدان ایٹم، مرد مومن نیک خو
ارض پاکستان کو تونے کیا ہے سرخرو
تذکرہ ہر سو ہے تیرے فہم کا ادراک کا
نام روشن کر دیا ہے سر زمین پاک کا
جوہری تکنیک کو ترسا ہے برسوں یہ وطن
تیری کاوش سے یہاں معراج پر پہنچا یہ فن
کل تلک تھا قوم کو اپنی جو محرومی کا غم
تیری باعث فخر سے اب سر اُٹھا سکتے ہیں ہم
دوست کیا خود معترف دشمن ہے تیرے کام کا
تو نے پھر سکہ بٹھایا دہر میں اسلام کا
اہل باطل راہ میں حائل ہوئے تیری مگر
تو نے دشمن کے عزائم کو کیا زیر و زبر
تیری محنت سے نظر آنے لگی منزل قریب
لگ رہا ہے اوج پر جیسے ہو ملت کا نصیب
تیری خدمت پر ہے نازاں ساری ملت سر بسر
اس بلندی میں ہے شامل تیرا خوں تیرا جگر
ابن ہیثم، رشد، سینا کی شبیہ ہے ہو بہو
عہد نو میں شاعر مشرق کا ہے شاہین تو

JALALI BOOKS

صفحہ تاریخ پر اب تا ابد زندہ ہے تو
سر زمین پاک کا مہرِ رخشندہ ہے تو
علم کی تحریک تیری ہر طرف پھولے پھلے
ظلمتیں ہوں دُور عثماؔں امن کا سکہ چلے

☆☆☆

مختلف شعراء کا بھوپال کو خراجِ عقیدت

رہبر جونپوری

بھوپال

اے حسین بھوپال اے پروردۂ امن و اماں
کتنی دل آویز ہے تیری سنہری داستاں
تیرے روز و شب ہیں تیری عظمتوں کے رازداں
چشمِ عالم میں ہے تو مثلِ دل ہندوستان

کوہ وندھیا چل کو تیری دلکشی پر ناز ہے
تیری دھرتی معتدل تہذیب کی غماز ہے

افضلیت کا ترے سر پر ہے تابندہ کلاہ
اخترانِ علم سے روشن ہے تیری شاہراہ
تجھ پہ رہتی ہے سدا اہلِ بصیرت کی نگاہ
ہیں در و مینار اب تک تیری عظمت کے گواہ

کتنے ہی ذی قدر اٹھے ہیں تری اس خاک سے
ہے منور شہر تیرا مشعل ادراک سے

سر زمیں پر تیری رائج ہے محبت کا چلن
جسم پر تیرے ہے اخلاص و وفا کا پیرہن
تیرا ہر خطہ ہے تہذیب و تمدن کا چمن
مل کے رہتے ہیں یہاں آپس میں شیخ و برہمن

موجزن ہے بحر علم و فن تری آغوش میں
مختلف قوموں کا ہے مسکن تری آغوش میں

کس قدر وجد آفریں ہیں تیرے دشت و کوہسار
رقص کرتی ہے یہاں دوشیزۂ فصلِ بہار
تیری مٹی کی مہک کرتی ہے دل کو بے قرار
بخشتے ہیں روشنی آنکھوں کو تیرے سبزہ زار

بالیقیں ہم جلوۂ کشمیر ہے وادی تری
ماہ پاروں کی حسیں محفل ہے آبادی تری

سامنا تو نے کیا ہے ناگہاں خطرات کا
ہے تجھے اندازہ سحرِ گردشِ حالات کا
تیرے سر پر ٹوٹ کے برسا ہے ابر آفات کا
تو نے دیکھا ہے زمانہ گیس کے صدمات کا

ہوگئیں گل شمع کی مانند کتنی ہستیاں
زندگی سے پھر بھی وابستہ ہیں تیری بستیاں

تھا بہت اعلیٰ ترے فرمانرواؤں کا مقام
ناقدین وقت تھے جن کی فراست کے غلام
بیگمات سلطنت تھیں قابل صد احترام
جن کی نظروں میں تھے یکساں عہدہ دار و خاص و عام

منکشف صناعیٔ فطرت ہے تیری ذات میں
عکس ماضی ہے درخشاں تیرے تعمیرات میں
صدر منزل کا تحیر خیز ہے جاہ و جلال
ہے تری تاج المساجد فن کی تابندہ مثال
جدت دست ہنر ہے برلا مندر کا جمال
روح پرور ہیں تری لبریز جھیلیں تیرے تال
کاشی و متھرا ہیں شیدا تیری صبح و شام پر
رشک کرتے ہیں دیارِ غیر تیرے نام پر
ہیں حکومت کے مراکز تیرے ایوان و قصور
قائدوں کو تو نے بخشا ہے سیاست کا شعور
اجتماع دیں سے ہے تیری فضیلت کا ظہور
کر رہا ہے بزم ظلمت میں اجالا تیرا نور
تیری بیداری نے ملت کو محرک کر دیا
جذبۂ عزم و عمل تو نے دلوں میں بھر دیا
تو سبھی شہروں میں ہے بھوپال، شہرِ لاجواب
ہے افق پر ایشیا کے تو مثال آفتاب
بھیل[1] ہے دامن میں تیرے اک تر و تازہ گلاب
پل رہا ہے تجھ میں ''فکر و آ گہی'' کا انقلاب
نام تیرا وقت کی تاریخ میں تحریر ہے
صفحۂ آفاق پر روشن تیری تصویر ہے

[1] بی ایچ ای ایل

بھوپال

جگن ناتھ آزاد

ڈھونڈنے سے مل نہیں سکتی ہے تیری بھی نظیر
سرزمین بھوپال کی ہے حیدرآباد صغیر
یہ تری شملہ پہاڑی یہ ترا بھوپال تال
دیکھ کر جن کو تروتازہ ہو شاعر کا خیال
تال کی امواج سے بادِ صبا کی چھیڑ چھاڑ
گیسوئے محبوب کو سراپا وجد میں لاتے ہوئے
دُور تک پھیلے ہوئے آبِ رواں کے سلسلے
دستِ دل کے وسیلے کیف جاں کے سلسلے
یہ ترے باغات میں رقصاں نشاط کیف و رنگ
یہ اُچھلتی مسکراتی زندگانی کی اُمنگ
جھیل کے ساحل پہ تصویرِ غروبِ آفتاب
دیکھ اے دل آج ہر جلوہ ہے شاید بے حجاب
اس طرح محسوس ہوتا ہے یہاں آکر مجھے
جلوۂ رنگیں کوئی لایا ہے بہلا کر مجھے
میں کہ اک لمحے کو اے بھوپال! ہوں مہماں ترا
مدتوں شاید رہوں گا میں فسانہ خواں ترا
مطمئن مجھ سے نہیں گو ذوقِ آوارہ مرا
تیرے جلوؤں میں ہے گم ارمانِ نظارہ مرا

گرچہ ناآسودہ ہے میرا مذاقِ جستجو
تو مگر کچھ کم نہیں ہے اے جہانِ رنگ و بو

شہر وہ اک نام جس کا خطۂ محبوب ہے
دل کا جو مقصود ہے نظروں کا جو مطلوب ہے
حیدرآباد دکن کہتی ہے اک دنیا سے
دل رُبائی کا وطن کہتی ہے اک دنیا جسے
آرزوؤں کے سفینے کے لیے ساحل ہے جو
ہر تمنائے سفر کے واسطے منزل ہے جو
بلدۂ فردوس منظر خطۂ جنت نظیر
شوقِ بے پروا ہے میرا جس کی یادوں کا اسیر
بحر کے طوفاں میں ہے جو اک جزیرے کی طرح
خاتم ہندوستاں میں ہے جو ہیرے کی طرح
اس دیارِ شادماں کی اک جھلک تجھ میں بھی ہے
اس بہارِ بے خزاں کی اک مہک تجھ میں بھی ہے

زندگی کچھ اس طرح تیری فضا میں کھو گئی
حیدرآباد دکن کی یاد تازہ ہو گئی

اے مرے اقبال کے ممدوح کی دنیائے حسن
آج بھی لبریز مستی ہے تری صہبائے حسن
حال پر ماضی ترا اب بھی تجلی بار ہے
آج بھی تیری زمیں پر بارشِ انوار ہے
آج بھی گرما رہا ہے دل کو افسانہ ترا
اہلِ علم و فن سے معمور کاشانہ ترا

اب بھی ذکر و فکر سے تیری فضا معمور ہے
شعر کی ضو سے ترا اب بھی جہاں پُرنور ہے
مسکنِ علامۂ محویؔ صدیقی ہے تو
علم کی منزل بھی ہے تو اے دیارِ رنگ وبو
جادۂ علم و ادب تو منزل تحقیق تو
آج ہے آرام گاہِ حضرتِ صدیقؔ تو
کل سہاؔ کے نام سے روشن تھی بزمِ دل تری
آج شعری کی غزل ہے گرمیٔ محفل تری
اے دیارِ رنگ و بو اے مرکز تابندگی
شعر و نغمہ ہی نہیں تیری متاعِ زندگی
اور بھی پہلو ہیں تیری دل نشیں تصویر کے
ہر طرف جلوے برستے ہیں تری تنویر کے
ہند کی تاریخ سینے میں ترے خوابیدہ ہے
تیرے دامن میں جہاں سانچی کا آرامیدہ ہے
ہاں وہی سانچی کہ ہے تاریخ کا زرّیں ورق
حال کو جو دے رہا ہے آج ماضی کا سبق

اپنے دامن میں لے کے تیرہ سو برس کی داستاں
تین صدیوں کا ہے اس کا ذرّہ ذرّہ ترجماں

ہاں تو اے بھوپال ! اے گہوارۂ علم و ہنر
قدس کی تنویر سے روشن ہیں تیرے بام و در
تیرے دامن میں مجھے آکر قرار ایسا ملا
دل گرفتہ غنچۂ دل تھا یہاں آکر کِھلا

اِک عجب تہذیب سے ہے آشنا عالم ترا
لیکن اک احساس میرا ہے کہ ہے محرم ترا
گرچہ تو اس وقت کے حالات پر راضی بھی ہے
جاگزیں لیکن ترے دل میں غمِ ماضی بھی ہے
میں ترے اس فکر کے انداز پر حیراں نہیں
توڑنا ماضی کی زنجیروں کا کچھ آساں نہیں
وقت لیکن گردشِ دورِ زماں کا نام ہے
وقت کا کب جادۂ عالم پہ رُکنا کام ہے
وقت مانندِ نسیمِ صبح ہے گرمِ سفر
میل سے فرسنگ سے ناآشنا اس کی نظر
وقت ماضی کی گزرگاہوں سے پہنچا حال تک
وقت سانچی سے گزر کر آگیا بھوپال تک
وقت کا پہیہ اسی صورت سے چلتا جائے گا
رنگ اپنا نقشۂ عالم بدلتا جائے گا
اقتضائے وقت کیا ہے وقت پر گہری نظر
وقت خود منزل ہے خود جادہ ہے خود عزمِ سفر
وقت خود کشتی بھی ہے، طوفاں بھی ہے، ساحل بھی ہے
وقت کشتِ آرزو بھی کشت کا حاصل بھی ہے
ہو اگر ممکن تو مجھ سے راز کی اک بات سن
اے کہ تو ہے آج اک تصویرِ احساسات سن

وقت تنویرِ سحر بھی ہے ظلامِ شب بھی ہے
وقت انساں کے لیے راکب بھی ہے مرکب بھی ہے

بھوپال تال

وجدی الحسینی

اے کے تو آئینہ حسن خدائے ذوالجلال
اے کہ تو سرچشمۂ عین کرم، بحر نوال
سرزمین مالوہ کی آب جوئے بے مثال
تیری پیشانی منور، تیرا چہرہ خوش جمال
اے حسیں بھوپال تال

تیرا پانی ہے مصفا جیسے موجِ رودِ نیل
یا زمیں سے پھوٹ کر نکلی ہے یہ سلسبیل
خوش سواد خوش مقام و خوش نما، خوش رنگ جھیل
اے حسیں بھوپال تال

تو ہے پانی کا سمندر یا کہ نیلا آسماں
تیرا منظر دن کی تابانی میں ہے جلوہ فشاں
جگمگاتی رات میں تو ہے مثالِ کہکشاں
رات دن میں ہے درخشاں تیرا حسنِ لازوال
اے حسیں بھوپال تال

☆☆☆

بھوپال تال

احسن علی خاں احسنؔ بھوپال

خوش نوا دلستاں خوش ادا شادماں
خندہ رو خندہ زن ہائے غم خوارِ من
شوخ موجیں تری آج بھی گائیں گی
مجھ کو سمجھائیں گی، دل کو بہلائیں گی
شوخیِ ناز سے دلستاں ساز سے
دورِ صہبا چلا تو بھی دیکھا کیا
جب کنارے ترے غیر وارد ہوئے
جامِ خونِ وطن وہ جو پیتے رہے
شورِ قلقل ہوا تو بھی سنتا رہا
تیرا پانی پیا اور جواں ہو گیا
اے پدر اے پدر میرا خونِ جگر
آج پیتے ہیں وہ خوب پیتے ہیں وہ
ہائے مرتا ہوں میں اور جیتے ہیں وہ
آسرا بھی نہیں
کیا خدا بھی نہیں!

☆☆☆

JALALI BOOKS KUTUB KHANA JALALI

حوالہ جات

1- تاریخ بھوپال — از محمد عبدالرحمٰن
2- History of Bhopal — by Sir John Malcom
3- مختصر تاریخ بھوپال — از اختر اقبال
4- قدیم بھوپال تہذیب کے آئینے میں — از حکیم سیّد قمرالحسن
5- بیگمات بھوپال — از محمد امین مارہروی
6- سہ ماہی رسالہ ''فکر و آگہی''، بھوپال نمبر 1996ء
7- ہندوستان اسلامی عہد میں — از مولانا شمس تبریز خاں
8- حیات سلطانی — از محمد امین زبیری
9- گوہر اقبال — از سلطان جہاں بیگم
10- Begums of Bhopal, by Shaharyar Muhammad Khan
11- خواتین اور دین کی خدمت — از مولانا ابوالحسن ندوی
12- ریاست بھوپال کے گونڈ — از محمد احمد سبزواری (سینسس رپورٹ 1941)
13- اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ — از ڈاکٹر سلیم حامد رضوی
14- تذکرۂ شخصیاتِ بھوپال — از شگفتہ فرحت
15- مقدمہ تاریخ زبان اُردو — از ڈاکٹر مسعود حسن خاں
16- بھوپال کی فضائے شعری — از ارشد تھانوی
17- خطوط شبلی بنام عطیہ فیضی — از محمد امین زبیری
18- رسالہ شعلہ حیات رحمت للعالمین، آزادی نمبر 1963ء
19- ہفت روزہ ''ندیم'' بھوپال، 8 فروری 1937ء
20- اقبال اور بھوپال — از صہبا لکھنوی
21- رسالہ حرف آخر، دہلی، بھوپال نمبر
22- جموں تا بھوپال گردشِ خیال — از ڈاکٹر گیان چند جینی
23- بھوپال تحریک آزادی کے آئینے میں، — از سیّد عابد علی وجد الحسینی
24- سپاہی بہادر — از اسد اللہ خاں

☆☆☆

ہماری مطبوعات ایک نظر میں

1-	کراچی تاریخ کے آئینے میں	عثمان دموہی	1200/-
2-	کراچی کی کہانی تاریخ کی زبان	کھتری عبدالغفور کانڈا کریا	650/-
3-	میرا کراچی	ڈاکٹر اقبال سعید خان	600/-
4-	لیاری کی اَن کہی کہانی	رمضان بلوچ	450/-
5-	Lyari On The Rise	Umair Razzaq	300/-
6-	بے نیام تلواریں (پاکستان، اس کے فوجی ادارے اور اس کی خانہ جنگیاں)	شجاع نواز	595/-
7-	سیاسیاتِ سندھ	کامران اعظم سوہدروی	495/-
8-	شخصیاتِ سندھ	اکامران اعظم سوہدروی	165/-
9-	پیاس اور افلاس کا صحرا (عظیم صحرائے تھر کی زندگی، تہذیب اور تاریخ پر دستاویز)	سعید خاور	500/-
10-	دل میں چبھے کانٹے (آپ بیتی)	شمیم اختر (ایڈیٹر اخبارِ خواتین)	500/-
11-	اُمید آشنا (چیف نیشنل فوڈز کی آپ بیتی)	اکرم کمبوہ	1200/-
12-	ریڈیو پاکستان میں 30 سال	انور سعید صدیقی	795/-
13-	جنتِ ارضی - استنبول	اقبال مانڈویا	300/-
14-	سکوت بول پڑا (شعری مجموعہ)	وحید نور	400/-
15-	چپ کی چاپ (شعری مجموعہ)	عمران ثاقب	220/-

☆ زیرِ طبع: دُنیا میں قومی آزادی کی تحریکیں — عباس احمد آزاد

ناشر: راحیل پبلی کیشنز

314، تیسری منزل، بک مال، اُردو بازار کراچی

RaheelPublications&BookSeller

E-mail: raheelpublications@gmail.com

بعد تعلیم کی جانب پورے انہماک سے متوجہ ہوئے اور میٹرک سے بی کام تک کے امتحانات میں نمایاں نمبروں سے کامیابی حاصل کی۔ سندھ مسلم کالج میں طالب علمی کے زمانے سے اخباروں اور رسائل میں لکھنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ 1971ء میں ملک کے دو لخت ہونے کا غم اتنا شدید تھا کہ اس موضوع پر کئی مضامین لکھے اور ساتھ ہی ایک روزنامے میں قطعات لکھنے کا سلسلہ شروع کیا۔ اسی دوران ایک مالیاتی ادارے ''پکک'' میں ملازمت بھی جاری رکھی۔ کئی فلاحی اور ادبی تنظیموں سے وابستگی رہی۔ پی ٹی وی کیلئے ڈرامے اور فنشی پروگرام کیلئے خاکے بھی لکھے۔ ایک اخبار میں بحیثیت میگزین ایڈیٹر کام کیا۔ اس کے علاوہ اعزازی طور پر کئی اخباروں کیلئے ترجمے اور اداریے بھی تحریر کیے۔ غالب پر کئی تحقیقی مضامین کراچی کے کئی اخبارات میں شائع ہوئے جنہیں بہت پذیرائی ملی۔ اس وقت ایک ایکسپورٹ فرم میں بحیثیت منیجر خدمات انجام دے رہے ہیں اور شوریٰ ہمدرد کے رکن ہیں۔ تاریخی رسالہ ''عصمت'' کے ڈپٹی چیف ایڈیٹر بھی ہیں، ساتھ ہی اخبارات میں کالم نگاری اور ادبی و تحقیقی کام بھی جاری وساری ہے۔

مصنف کی ادبی شخصیات کے ساتھ ایک یادگار تصویر

تاثرات

عثمان دموہی کو میں طویل عرصے سے جانتا ہوں۔ یہ علمی ادبی صحافتی اور سماجی شعبوں میں سرگرم عمل ہیں۔ ان کی پہلی کتاب ''کراچی تاریخ کے آئینے میں'' نے کافی مقبولیت حاصل کی ہے۔ اس کتاب کے تیسرے ایڈیشن کے شائع ہونے کے بعد اب اس کا انگلش ورژن ''Karachi in The Mirror of History'' کے نام سے چھپ کر بازار کی زینت بن چکا ہے۔ اس کتاب کا میں بھی معترف ہوں، اس لئے کہ اس میں موصوف نے کراچی کے ماضی کو اس طرح کھنگالا ہے کہ اس سے پہلے کسی نے اتنی تحقیق اور محنت نہیں کی تھی۔

اب عثمان دموہی کی تازہ کتاب ''بھوپال کی کہانی'' کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ بھوپال ریاست تاریخی حیثیت کی حامل تھی۔ یہ ہندوستان میں حیدر آباد دکن کے بعد دوسری بڑی مسلم ریاست تھی۔ یہ مسلم تہذیب و تمدن کا شاہکار تھی۔ اس ریاست نے مسلمانان برصغیر کی ثقافت، تعلیم، علم وادب اور معاشرے پر گہرے نقوش مرتب کئے تھے۔ اس کتاب میں بھوپال کی قدیم تاریخ سے لے کر ریاست کے بھارت میں انضمام تک کی مکمل تاریخ خوبصورت پیرائے میں سمودی گئی ہے۔ اس میں بھوپال کی تاریخ، جغرافیہ، ادب، شخصیات، تہذیب، موسم، رسومات، کھیل سے لے کر تفریحی مقامات تک کا دلچسپ انداز میں ذکر کیا گیا ہے۔ اس میں خاص طور پر بھوپال کے شاہی خاندان پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

مجھے امید ہے یہ کتاب اپنی گوناگوں خوبیوں کی بدولت نہ صرف بھوپال سے تعلق رکھنے والوں میں بلکہ غیر بھوپالیوں میں بھی ضرور پسند کا درجہ حاصل کرلے گی۔

پروفیسر سحر انصاری

RAHEEL PUBLICATIONS
314, Book Mall, Urdu Bazar, Karachi. Cell: 0321-8762213
Email: raheelpublications@gmail.com

ISBN No.
978-969-9927-07-2

Price
Rs: 600/-